# سفر کی شام



فرحت اشتیاق

# انتساب!

اپنی مرحومہ نانی قمر النساء کے نام!

جو مجھے لکھتا دیکھ کر، میری تحریریں، میری کتابیں
شائع ہوتی دیکھ کر بے انتہا خوش ہُوا کرتی تھیں۔
فخریہ ہر ایک کو بتایا کرتی تھیں کہ اُن کی نواسی ایک
مصنفہ ہے۔

*Nani! I miss you a lot.*

# پیش لفظ

کہانیاں سوچنا اور لکھنا میرے لیے ایسا ہی ہے جیسے سانس لینا، بھوک لگنا، پیاس لگنا...... میں نے پہلی کہانی کب سوچی تھی مجھے یاد نہیں، ہاں اپنا بچپن جہاں سے یاد ہے وہاں پر میں خود کو کہانیاں سوچتا، کہانیاں بُنتا ہی پاتی ہوں۔ اندر سے ایک شدید خواہش اُبھرتی ہے لکھنے کی۔ کردار، مکالمے، منظر، کہانی یہ سب میرے پاس آ آ کر شور مچاتے ہیں، مجھ سے خود کو لکھواتے ہیں۔ تخلیق کے عمل کے دوران میرے کردار مجھ سے اتنے نزدیک ہو جاتے ہیں کہ میں اُن کے غم پر روتی بھی ہوں اور اُن کی خوشیوں پر بے ساختہ ہنستی بھی ہوں۔ اور پھر جب آپ قارئین میرے لکھے ہوئے لفظوں کو سراہتے ہیں تو میں اندر تک سرشار ہو جاتی ہوں، خود کو بہت امیر محسوس کرتی ہوں۔ آپ کی یہ قدر افزائی اور محبت میرے لیے بے حد قیمتی ہے۔ جن محبتوں سے آپ قارئین نے مجھے مالا مال کر رکھا ہے اُن کے لیے میں آپ سب کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتی ہوں۔

کسی بھی کتاب کو کامیاب بنانے کے لئے جتنی کوشش رائٹر کو کرنی پڑتی ہے۔ اتنی ہی کوشش پبلشر کو کرنی پڑتی ہے۔ میری کتابوں کے حقوق اشاعت حاصل کرنے کے بعد علم و عرفان پبلشرز نے اس ذمہ داری کو میری توقعات سے زیادہ بہتر طور پر ادا کیا ہے۔ میں امید کرتی ہوں کہ اس کتاب کو پڑھنے کے بعد قارئین میری اس رائے سے اتفاق کریں گے۔

فرحت اشتیاق

# سفر کی شام

وہ سولہ فروری کی ایک خوبصورت دوپہر تھی اور اس دوپہر وہ آفس سے لنچ ٹائم ہی میں نکل آئی تھی۔ اس کی پہلی منزل بیوٹی پارلر تھی، جہاں اسے اپنے بالوں کی کٹنگ کروانی تھی۔ پارلر میں زیادہ دیر رکنے کا اس کے پاس وقت نہیں تھا، اسی لئے فیشل کے ارادے کو اس نے ملتوی کر کے گھر پر خود ہی کلینزنگ کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ اس کے بال پچھلے دو ماہ سے توجہ چاہ رہے تھے اور وہ وقت نہ ملنے کے سبب اسے ٹالے چلی جا رہی تھی۔ حمیر بھی دو تین بار اسے ٹوک چکا تھا۔ سولہ فروری کا دن اس کی زندگی کا سب سے اہم ترین دن تھا اور اس دن وہ بہت اچھی لگنا چاہتی تھی، اسی لئے بیوٹی پارلر جانے کے ارادے کو وہ اس دن تک ٹالتی رہی تھی۔

پارلر سے فارغ ہونے کے بعد اسے کچھ خریداری کرنا تھی، چند ایک تو گھر کے روزمرہ استعمال کی اشیاء تھیں، خاص طور پر اسے پائن ایپل کاٹن پیک اور فریش کریم خریدنی تھی۔ باقی کیک بنانے کے تمام لوازمات گھر پر موجود تھے۔ سرخ گلابوں کا ایک خوبصورت سا گلدستہ خرید کر اس نے اپنی خریداری مکمل کی اور پھر اپنے اپارٹمنٹ کا رخ کیا۔

ان کا اپارٹمنٹ تیسری منزل پر تھا۔ اس پوش علاقے میں دو کمروں کے اس اپارٹمنٹ کا انہیں اتنا کرایہ دینا پڑ رہا تھا جتنا کسی مڈل کلاس علاقے میں چار پانچ کمروں کے مکان کا بھی نہیں ہوگا۔ لفٹ میں اس کی مسز یونس سے ملاقات ہوئی اور انہوں نے ہائے ہیلو کے فوراً بعد بے ساختہ اس کے ہیئر سٹائل کی تعریف کی۔ اس نے مسکراتے ہوئے ان کی تعریف کا شکریہ ادا کیا اور لفٹ سے نکل آئی۔ اپنی تعریف انسان کو ہمیشہ ہی اچھی لگتی ہے۔ اسے بھی لگی تھی مگر یہ وہ تعریف نہیں تھی جس کا اسے بے چینی و بے صبری سے انتظار تھا، جس کے لئے آج وہ بہت اچھی لگنا چاہتی تھی، اسی کے منہ سے اپنی بے تحاشا تعریفیں بھی سننا چاہتی تھی۔

اپارٹمنٹ کے اندر آتے ہی اس نے مشینی رفتار سے اپنا کام شروع کیا۔ جلدی سے ہاتھ منہ دھو کر کیک بنانے کی تیاری شروع کی۔ کیک کی تیاری کے دوران ہی اس نے اپنے لئے ایک چیز سینڈوچ بنایا اور چلتے پھرتے اسے کھا کر لنچ کرلیا۔ کیک اوون میں رکھنے کے بعد اس نے پہلے ہی سے صاف گھر کو مزید صاف کرنا شروع کیا۔ اس کے گھر کی صفائی، نفاست اور سجاوٹ کو دیکھ کر کوئی یقین نہیں کرسکتا تھا کہ اس گھر کی مالکن ایک ورکنگ وومن ہے جو صبح

آٹھ بجے گھر سے نکل کر شام چھ بجے گھر واپس آتی ہے۔ اس کام کو نمٹا کر وہ ایک مرتبہ پھر پورے انہماک سے کیک کی جانب متوجہ ہوئی۔

حمیر کی واپسی کا کچھ پتا نہیں تھا۔ اگر کسی میٹنگ میں یا کسی اور جگہ مصروف نہ ہو گیا ہوتا تو وہ آٹھ بجے گھر واپس آ جاتا تھا مگر ایسا بہت کم ہوتا تھا۔ اور اگر آج کا دن اسے یاد نہیں تھا تو پھر تو جلدی واپسی کا کوئی امکان ہی نہیں تھا۔ پچھلے سال کے تجربہ کو سامنے رکھتے ہوئے قوی امید یہی تھی کہ اسے یاد نہیں ہوگا، اگرچہ کہ صبح اس نے قصداً حمیر سے "آج کیا تاریخ ہے؟" پوچھا تھا اور اس نے اپنی شرٹ کے بٹن بند کرتے ہوئے فوراً جواب میں اسے تاریخ بتا دی تھی۔ اسے یاد تھا یا نہیں، وہ وقت پر گھر واپس آ رہا تھا یا نہیں، بہرحال اسے تو اپنی تیاری مکمل رکھنا تھی۔

ڈائننگ ٹیبل پر رکھے گلدان میں اس نے اپنے خرید کر لائے ہوئے تازہ سرخ گلاب سجائے۔ پورے اپارٹمنٹ میں ائیر فریشنر سپرے کیا۔

حمیر کے لئے تحفہ اس نے کافی دن پہلے ہی خرید لیا تھا۔ وہ کوئی بھی معمولی چیز استعمال نہیں کرتا تھا۔ اس کے معیار کے حساب سے یہ انتہائی قیمتی رسٹ واچ خریدنے میں اس کی تمام تر بچت اور اس مہینے کی پوری تنخواہ ٹھکانے لگ گئی تھی مگر پھر بھی وہ بہت خوش تھی۔ اگر وہ کوئی عام سی گھڑی اسے تحفے میں دیتی تو بخوشی قبول تو وہ اسے بھی کر لیتا، اس کا دل رکھنے کی خاطر دو تین بار پہن بھی لیتا اور پھر اس کے بعد واپس اپنی پرانی قیمتی گھڑی پر آ جاتا اور وہ ایسا نہیں چاہتی تھی۔ گریٹنگ کارڈ لکھنے کے بعد اس نے گھڑی کا کیس اور کارڈ اپنی ڈریسنگ ٹیبل پر ہی رکھ دیا اور پھر اپنی تیاری شروع کی۔

سیاہ رنگ کی نیٹ کی ساڑھی اس کے نازک سراپے پر بہت سج رہی تھی۔ ساڑھی کے پلو پر سلور رنگوں اور موتیوں کا بڑا نفیس کام بنا ہوا تھا۔ اس کام کی مناسبت سے اس نے جیولری بھی سلور پہنی۔ خوب اہتمام سے بھرپور میک اپ کیا، جبکہ روز تو بس بھاگتے دوڑتے لپ اسٹک لگانے ہی کا وقت مل پاتا تھا۔ آئی لائنر، مسکارا اور آئی شیڈو کے بعد اس کی خوبصورت براؤن آنکھیں مزید خوبصورت اور دلکش لگنے لگی تھیں۔ پرفیوم لگانے کے بعد اس نے خود پر ایک آخری نگاہ ڈالی اور پھر مطمئن ہوتے ہوئے ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے سے ہٹ گئی۔ وہ آج اسے اس روپ میں دیکھ کر کیا کہے گا؟ کتنے دنوں بعد وہ اتنے اہتمام سے تیار ہوئی ہے۔

"حمی! جلدی گھر آ جاؤ"۔ اس کی تعریفیں سننے کی اسے بہت بیتابی تھی وقت گزارنا مشکل ہو رہا تھا۔ اپنے بیڈ روم میں بے چینی سے ادھر سے ادھر ٹہلتے ہوئے وہ اس کا انتظار کر رہی تھی۔ ساڑھے سات بجے ہی اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور اس نے اس کے موبائل پر کال کر ڈالی۔

"حمی! تم کہاں ہو؟" اس کی کال ریسیو کرتے ہی وہ سلام دعا کے بغیر بے صبری سے بولی۔

"مائی سویٹ وائف! میں اس وقت ارسلان صاحب کے ساتھ اسکواش کھیل رہا ہوں اور آج انہیں ہرائے بغیر گھر واپس نہیں آؤں گا۔" وہ ہنستے ہوئے جواباً بولا پھر جیسے ایک دم ہی اس کے بے صبری سے بھرپور جملے پر دھیان گیا تو چونک کر پوچھنے لگا۔

"سب خیریت تو ہے، کوئی پرابلم ہے کیا؟"



"میری سب سے بڑی پرابلم یہ ہے کہ اس وقت میرے شوہر صاحب کو میرے پاس موجود ہونا چاہئے اور وہ نہیں ہیں۔ میں تمہارے اسکواش وسکواش کو بالکل نہیں جانتی، بس تم فوراً گھر واپس آ رہے ہو۔" وہ اکیسویں صدی کی ایک ماڈرن لڑکی ہونے کے باوجود اندر سے ایک مکمل مشرقی بیوی تھی۔ شوہر کی ہاں میں ہاں ملانے والی، اس کے کئے گئے فیصلوں کو بغیر کسی اعتراض کے قبول کرنے اور اس کے پیچھے پیچھے چلنے والی۔ پر آج کی اپنی اس یادگار شام کو وہ ضائع ہوتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی تھی، اسی لئے یوں من مانی کرنے والے انداز میں اس سے مخاطب ہوئی تھی۔

"ماہا! میں اس طرح کھیل ادھورا چھوڑ کر واپس نہیں آ سکتا۔ یہ گیم ختم کر لوں پھر میں فوراً گھر آ جاتا ہوں، او کے۔" اس کے غیر معمولی ضدی لہجے نے اس سے کھیل جلدی ختم کر لینے اور گھر واپس آنے کا وعدہ کروا لیا تھا، ورنہ وہ بہت اچھی طرح جانتی تھی کہ ارسلان ایاز سے دوستی حمیر کے لئے کتنی اہم ہے۔ وہ ایک بے مثال اور شاندار کیریئر رکھنے والے سینئر بینکر تھے۔ اسکواش کے حوالے سے ہی حمیر کی ان سے دوستی ہوئی تھی اور حمیر اس دوستی کو ہر ممکن حد تک آگے لے جانا چاہتا تھا۔ اکثر ہفتے میں تین یا چار مرتبہ وہ ارسلان ایاز کے ساتھ اسکواش کھیلنے چلا جاتا تھا۔ فون پر بات کر لینے کے بعد جہاں یہ تسلی ہو گئی تھی کہ وہ کھیل ختم کر کے جلدی گھر واپس آ رہا ہے، وہیں یہ بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ مسٹر بھلکڑ ایک مرتبہ پھر اپنی ویڈنگ اینورسری بھول گئے ہیں۔ بجائے اس سے خفا ہونے کے اس کے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

وہ دونوں بعض معاملات میں ایک دوسرے سے کتنے مختلف تھے۔ وہ زندگی کی چھوٹی چھوٹی خوشیوں، چھوٹی چھوٹی باتوں کو یاد رکھنے والی اور وہ ان سب کو بھول جانے والا، لیکن جب درمیان میں محبت ہوتی ہے پھر کسی بھی فرق کی کوئی اہمیت نہیں رہ جاتی۔ وہ دنوں کو یاد نہیں رکھتا تو کیا ہوا، وہ اس سے محبت تو بے پناہ کرتا ہے۔ اس کی نگاہ دیوار پر فریم میں جڑی اپنی شادی کے دن کی تصویر پر گئی۔ وہ اور حمیر دونوں ساتھ، مسکراتے ہوئے۔ سولہ فروری کے دن ٹھیک دو سال پہلے حمیر رضا اس کی زندگی میں ایک ہمیشہ رہنے والی خوشی اور کبھی ختم نہ ہونے والی ہنسی بن کر داخل ہوا تھا۔ وہ اس کی زندگی کا سب سے اہم شخص تھا، جس کے بغیر زندہ رہنے کا وہ تصور تک نہیں کر سکتی تھی۔ وہ اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے ہر پل اس کے ساتھ رہتا تھا۔ اس کے حواسوں پر وہ یوں چھایا تھا کہ اسے اس کے سوا دنیا میں کسی اور رشتے کی کوئی کمی محسوس ہی نہیں ہوتی تھی۔ اس کے سر پر باپ کی محبت و شفقت بھری چھاؤں نہیں، بہن، بھائیوں کا پیار بھرا ساتھ نہیں اور ماں..... وہ ہوتے ہوئے بھی اس کے پاس نہیں۔ تو کیا ہوا، وہ ایک شخص حمیر رضا تو تھا نا اس کے پاس، ہر دم اس کے ساتھ۔ زندگی سے کبھی کوئی شکوے اگر رہے بھی تھے تو دو سال پہلے حمیر رضا کے ساتھ اس پیار بھری نئی زندگی کی شروعات کرنے کے بعد ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئے تھے۔

☆☆☆

وہ، حمیر رضا سے پہلی بار ڈاکٹر اعجاز ارشد کے آفس میں ملی تھی۔ پہلی بار یوں کہ اس روز پہلی مرتبہ اس کی اس سے گفتگو ہوئی تھی، ورنہ سرسری سا جانتی تو وہ اسے پہلے بھی تھی۔ جب وہ ایم بی اے کرنے کے لئے آئی بی اے میں داخل ہوئی تب حمیر رضا وہاں سے پاس آؤٹ کرنے والا تھا۔ وہ اپنے بیچ کے ٹاپ تھری اسٹوڈنٹس میں سے ایک تھا اور ان دنوں وہ انسٹیٹیوٹ میں اس حوالے سے کافی مشہور ہو گیا تھا کہ اپنے آخری سمیسٹر کے دوران ہی اسے تین بہت

بہترین جگہوں سے جاب کی آفرز آچکی تھیں۔ ان آفرز میں سے ایک آفر اس غیر ملکی ادارے سے بھی تھی، جہاں سے اس نے انٹرن شپ کی تھی۔ کچھ لوگ اس سے حسد کرتے تھے اور کچھ رشک۔ بہرحال اس کا ذکر اکثر سٹوڈنٹس کرتے تھے مگر ڈاکٹر اعجاز ارشد کا وہ خاص طور پر بہت پسندیدہ تھا۔ فورتھ سمیسٹر میں اب جب ڈاکٹر اعجاز ان لوگوں کو پڑھا رہے تھے، وہ اس کی کسی نہ کسی خوبی کا ذکر ضرور ہی کیا کرتے تھے۔ اسے انسٹیٹیوٹ سے گئے ڈیڑھ سال ہو چکا تھا اور وہ کہتے تھے کہ وہ ان سٹوڈنٹس میں سے تھا، جنہیں پچیس تیس سال بعد بھی بھلایا نہیں جا سکتا۔ یوں ڈاکٹر اعجاز ارشد نے ان لوگوں کو ڈیڑھ، پونے دو سال بعد بھی اس بندے کو بھلانے نہیں دیا تھا۔

اس گرم ترین دوپہر میں جب وہ ڈاکٹر اعجاز ارشد کے پرسکون ماحول والے ائیر کنڈیشنڈ آفس میں داخل ہوئی تو وہ ان کی میز کے سامنے رکھی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھا ان سے باتیں کر رہا تھا۔ اس نے کاٹن کا بلیک ٹراؤزر اور بلیو و بلیک اسٹرائپس کی ہاف سلیوز کی قمیض کے ساتھ بلیو کلر کی ٹائی پہن رکھی تھی اور ماہا احمد علی کو یہ تسلیم کر لینے میں قطعاً کوئی تامل نہیں تھا کہ وہ بندہ واقعی بہت ہینڈسم تھا۔ اس کی ڈریسنگ، اس کے بیٹھنے اور بولنے کا انداز سب شاندار تھے۔ وہ ڈاکٹر اعجاز سے اپنی ریسرچ رپورٹ کے متعلق کچھ باتیں پوچھنے آئی تھی مگر وہ فی الحال مصروف نظر آرہے تھے۔

''سر! میں بعد میں آجاؤں گی۔'' مگر ڈاکٹر اعجاز نے اسے روک لیا تھا۔ لہٰذا وہ حمیر کے برابر والی کرسی چھوڑ کر اس سے اگلی کونے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ ڈاکٹر اعجاز اس کی محنت اور لگن سے بہت خوش تھے، اس لئے وہ جس وقت بھی کچھ پوچھنے ان کے پاس آتی وہ بخوشی اسے وقت دیتے۔ اسے ان سے جو کچھ پوچھنا تھا وہ پوچھ رہی تھی، اس دوران وہ بندہ اس سے اور ڈاکٹر اعجاز سے قطعاً لاتعلق سامنے شیلف میں لگی کتابوں پر نظریں جمائے بیٹھا رہا تھا۔ اس کے کسی بھی انداز سے یہ ظاہر نہیں ہو رہا تھا کہ وہ اس کے سوالات اور ڈاکٹر اعجاز کے جوابات میں ذرا سی بھی دلچسپی لے رہا ہے۔ اس کا لاتعلقی سے بھرپور انداز کسی حد تک مغروریت کا حامل تھا۔ مگر پھر نجانے کیوں اس نے سامنے شیلف اور کتابوں سے نگاہیں ہٹا کر ڈاکٹر اعجاز اور اسے دیکھنا شروع کر دیا اور پھر غیر محسوس انداز میں وہ ان کی ڈسکشن میں شریک ہو گیا۔ وہ بڑی روانی و دلچسپی سے ان موضوعات پر بول رہا تھا، بلکہ ڈاکٹر اعجاز کو بھی وہ زیادہ بولنے نہیں دے رہا تھا۔

ابھی وہ چند مزید سوالات ڈاکٹر اعجاز سے کرنا چاہتی تھی کہ ڈپٹی ڈائریکٹر کے آفس سے ان کا بلاوا آگیا۔

''آئم سوری۔'' وہ ان دونوں سے معذرت کرتے ہوئے اٹھے تو حمیر سنجیدگی سے ان سے بولا۔

''میرا خیال ہے ان کے ان سوالات کے جواب تو میں بھی دے سکتا ہوں۔'' وہ جواباً کھل کر مسکرائے۔

''بالکل دے سکتے ہو۔ ایک بینکر ان سوالات کے تسلی بخش جواب نہ دے سکے تو کون دے گا۔ ماہا! آپ حمیر سے پوچھ لیجئے جو پوچھنا ہے، میں ابھی آتا ہوں۔'' وہ اپنے آفس سے نکل گئے تھے اور وہ جو ڈاکٹر اعجاز کو اٹھتا دیکھ کر خود بھی فوراً اٹھنا چاہتی تھی مجبوراً وہیں بیٹھی رہی۔ جو باتیں اس نے ڈاکٹر اعجاز کے اٹھ کر جانے سے پہلے ان سے پوچھی تھیں ان کے وہ بڑے تفصیلی جوابات دے رہا تھا۔ وہ تفصیلات اس کے لئے فائدہ مند تو تھیں، لیکن وہ دل ہی دل میں مسلسل یہ سوچے چلی جا رہی تھی کہ کیا اس بندے کو اپنا کچھ کام وام نہیں ہے جو اتنی فرصت سے بیٹھا ہوا اسے سمجھا رہا ہے۔

''آپ کہاں رہتی ہیں مس ماہا؟'' اس نے اچانک بڑی سنجیدگی و بردباری سے اس سے یہ سوال پوچھا۔ اس



نے چونک کر اسے دیکھا، وہ اس کی فائل پر کچھ لکھنے میں اس طرح مصروف تھا جیسے یہ سوال یونہی سرسری سے انداز میں گفتگو برائے گفتگو کے طور پر پوچھ لیا ہو۔

''اپنے گھر میں۔'' اس کا دل یہی جواب دینے کو چاہا تھا۔ اس نے سنجیدگی سے اپنی رہائش کے متعلق بتا دیا۔ وہ اب وہاں سے اٹھنا چاہ رہی تھی۔

''آپ کے والد کیا کرتے ہیں؟'' کچھ دیر کام کی بات کرنے کے بعد پھر ایک غیر متعلقہ سوال اس سے پوچھا گیا تھا۔ وہ پاگل نہیں تھی جو ان سوالات کا مقصد نہ سمجھ پاتی۔ اسے اندر ہی اندر اس بندے کا خود اعتمادی سے بھرپور ذاتیات کی طرف آنے والا یہ انداز بہت برا بھی لگا تھا مگر وہ براہ راست اپنی ناگواری کا اظہار نہیں کر سکتی تھی۔

''ان کی ڈیتھ ہو چکی ہے۔''

''اوہ......'' وہ ایک پل کو بالکل خاموش ہوا پھر اس کی طرف دیکھ کر بولا ''آئم ویری سوری۔'' اب اس سے پہلے کہ وہ اس کی ممی اور بہن بھائیوں کی طرف آتا وہ وہاں سے اٹھ جانا چاہتی تھی۔

''آپ کا بہت شکریہ آپ نے بہت ساری انفارمیشن مجھے دیں۔'' اسے مزید کوئی فقرہ بولنے کا موقع دیئے بغیر وہ ''اللہ حافظ'' کہتی ڈاکٹر اعجاز کے آفس سے باہر نکل آئی تھی۔ اس واقعہ کا ذکر کسی اور سے تو کیا، اس نے کلثوم عدنان جیسی اپنی قریبی دوست تک سے نہیں کیا تھا۔

مگر اگلے روز جیسے ہی وہ انسٹیٹیوٹ پہنچی وہ بندہ ایک مرتبہ پھر اس کے سامنے آگیا اور تب کوریڈور میں طوبیٰ وغیرہ کے گروپ کے ساتھ کھڑی کلثوم اور صنم نے بھی اسے اس سے بات کرتے دیکھ لیا تھا۔

''السلام علیکم!'' اس نے اپنے لہجے میں کل کے برخلاف سختی اور روکھا پن شامل کر لیا تھا۔

''کیسی ہیں آپ؟''

''میں ٹھیک ہوں، آپ صرف میری خیریت معلوم کرنے صبح صبح کیمپس آئے ہیں؟'' اس کے قدرے بدلحاظی کے عنصر لئے ہوئے جواب پر وہ محظوظ ہو جانے والے انداز میں بے ساختہ ہنسا۔

''بینکنگ اسٹوڈنٹ فورم نے آج یہاں ایک سیمینار ارینج کیا ہے میں وہ اٹینڈ کرنے آیا ہوں۔'' وہ جلد بازی میں منہ سے نکل جانے والے اس فقرے پر دل ہی دل میں بری طرح شرمندہ ہوئی اور وہ اس کی شرمندگی کو محسوس کرتے ہوئے کچھ ذو معنی لہجے میں مسکرا کر بولا۔

''ویسے سیمینار دس بجے شروع ہوگا، میں واقعی جلدی آگیا ہوں۔

یہ آپ کا آخری سمسٹر ہے؟'' وہ سامنے سے ہٹنے کے موڈ میں نہیں تھا۔

اس نے صرف اثبات میں گردن ہلا دی۔ وہ، اس کی ناگواری، اس کی عجلت اور بیزاری کو جیسے سمجھ ہی نہیں رہا تھا اور اگر سمجھ بھی رہا تھا تو اسے اہمیت نہیں دے رہا تھا۔

''اس کے بعد کیا کرنے کا ارادہ ہے آپ کا؟''

''ظاہر ہے جاب کروں گی۔'' وہ اس بار اپنی ناگواری کو بالکل بھی نہیں چھپا پائی تھی۔ جتنا زیادہ غور سے اس کی سہیلیاں اسے دیکھ رہی تھیں اتنی ہی اس کی ناگواری بھی بڑھتی جا رہی تھی۔

''اور شادی؟''

''جی؟'' اس براہ راست سوال پر اس نے اس بندے کی جرأت کو اچنبھے سے دیکھا۔

''مجھ سے شادی کریں گی؟'' وہ اب ناگواری، اور غصے کو فراموش کر کے تحیر سے اس شخص کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے سرد وسپاٹ اور غیر دوستانہ انداز کے باوجود بھی کیا کوئی شخص اتنی بڑی بات اس سے کرنے کی ہمت کر سکتا تھا؟

''آپ مجھ سے شادی کریں گی مس ماہا احمد علی؟'' اس نے اس کی حیرت بھری نگاہوں کو اپنی نگاہوں کی گرفت میں لیتے ہوئے اپنا سوال دہرایا۔ وہ کہنے کو جواب میں بہت کچھ کہہ سکتی تھی مگر پھر اسے خیال آیا کہ مزید کچھ بھی کہہ کر بات بڑھانے کا کوئی فائدہ نہیں۔

''اگر کسی لڑکی سے واقعی شادی کرنا ہوتی ہے تو پھر اسے کیمپس میں راستہ روک کر نہیں بلکہ اپنے پیرنٹس کو اس کے گھر بھیج کر پرپوز کیا جاتا ہے۔ آپ مجھے ایک معزز انسان نظر آتے ہیں، آپ کو بھی میرا خیال ہے یہی طریقہ اختیار کرنا چاہیے۔ اور اگر یونہی وقت گزاری کا آپ کا ارادہ ہے تو آئم سوری میں اس طرح کی لڑکی نہیں ہوں، آپ کہیں اور ٹرائی کیجیے۔'' وہ سر اٹھا کر باوقار انداز میں چلتے ہوئے اس کے پاس سے گزر کر اپنی دوستوں کے پاس آ گئی جہاں وہ سب اس سے بھی زیادہ بے چینی اور بے صبری سے اس کی منتظر تھیں۔

طوبیٰ سے اس کی اتنی دوستی نہیں تھی کہ وہ بے تکلفانہ انداز میں ''حمیر رضا کیا کہہ رہا تھا اور کیوں کہہ رہا تھا'' جیسا کوئی استفسار کر پاتی، مگر یہ سوال کرنے کی خواہش اس کے چہرے پر بڑی واضح نظر آ رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ تکلفات کو بالائے طاق رکھ کر اس بارے میں کوئی سوال کرتی وہ ان لوگوں سے معذرت کر کے کلثوم اور صنم کو ساتھ لے کر وہاں سے لائبریری کی طرف نکل گئی اور تب راستے ہی میں اس نے کلثوم اور صنم کو حمیر رضا کی کل کی اور آج کی ساری بات بتا دی تھی۔

''ایک اتنے ہینڈسم بندے نے تمہیں پرپوز کیا ہے اور تم نے شکل پر بارہ بجا رکھے ہیں؟'' صنم نے شوخی و شرارت سے اپنی ایکسائٹمنٹ کا اظہار کیا جبکہ کلثوم جو اس کی زیادہ پرانی اور زیادہ گہری سہیلی تھی، اپنی عادت کے مطابق سنجیدگی سے بولی۔

''ٹھیک جواب دیا تم نے۔ اب پتا چل جائے گا موصوف کتنے پانی میں ہے۔'' اور موصوف کتنے پانی میں تھے یہ اسے اسی رات پتہ چل گیا تھا۔ رات کو ممی اس کے کمرے میں آئیں اور اسے بتایا کہ کسی حمیر رضا کے بھائی کا ابھی کچھ دیر پہلے ان کے پاس فون آیا تھا۔

''وہ لوگ شام ہمارے گھر آنا چاہتے ہیں۔ یہی پوچھ رہے تھے کہ شام کو ہم مصروف تو نہیں۔'' وہ بغور اسے دیکھ رہی تھیں۔ وہ شاید یہ سمجھ رہی تھیں کہ حمیر رضا اس کا کلاس فیلو ہے اور کوئی بہت ہی زبردست قسم کا افیئر اس کا اس بندے کے ساتھ چل رہا ہے۔

اس کا اپنی ماں سے کبھی بھی ویسا تعلق نہیں رہا تھا جیسا ایک ماں اور بیٹی کے درمیان ہوتا ہے۔ وہ ہمیشہ اسے خود سے دور اور بہت اجنبی لگی تھیں۔ شروع شروع میں اس نے اپنے اور اپنی ماں کے درمیان حائل فاصلوں کو کم کرنے کی بہت کوششیں کی تھیں، مگر پھر گزرتے وقت نے آہستہ آہستہ اس پر اس تکلیف دہ حقیقت کا انکشاف کر دیا تھا کہ وہ



اب اس کی نہیں صرف عبداللہ اور مونا کی ماں ہیں۔ اس کے پاپا جسمانی طور پر اس سے جدا ہو چکے تھے مگر وہ پھر بھی ان کا احساس اپنے گرد محسوس کیا کرتی تھی مگر ممی جسمانی طور پر پاس ہوتے ہوئے بھی کبھی قریب محسوس نہیں ہوتی تھیں۔

☆☆☆

وہ فقط چھ سال کی تھی جب ایک ایکسیڈنٹ میں اس کے پاپا اسے اور ممی کو چھوڑ کر اپنے ابدی سفر پر روانہ ہو گئے تھے۔ اس کے پاپا کی بہت لمبی چوڑی جائیداد تو نہیں تھی، البتہ اتنا پیسہ چھوڑ کر ضرور گئے تھے کہ وہ دونوں ماں بیٹی عزت کی زندگی جی سکیں۔ پھر بھی تنہا تو وہ نہیں رہ سکتی تھیں۔ اس کی ممی اسے لے کر واپس اپنے میکے آ گئی تھیں۔ ممی صرف چھ سات مہینے ہی وہاں اس کے ساتھ رہی تھیں پھر نانا اور نانی نے ان کی دوسری شادی کروا دی تھی۔ ممی رخصت ہو کر مظہر آصف جو ان کے فرسٹ کزن بھی تھے، ان کے گھر چلی گئیں اور وہ اپنے ننھیال میں رہ گئی۔

مظہر انکل کی پہلی بیوی کا دوسرے بچے کی پیدائش کے وقت انتقال ہو گیا تھا۔ وہ بہت چھوٹی تھی اس کے لئے اس بات پر سمجھوتہ کرنا مشکل تھا کہ اس کا پیارا سا گھر اور اس کے پاپا اس سے چھن گئے ہیں اور ممی بھی اسے چھوڑ گئیں۔ شروع شروع میں وہ بہت روئی، اس نے ماں کے پاس جانے کی بہت ضد کی مگر پھر گزرتا وقت اس میں صبر پیدا کرتا چلا گیا۔ ممی میکے آتیں تو اسے بہت پیار کرتیں، اس کے لئے کھلونے اور چاکلیٹس لاتیں اور اگر مظہر انکل بھی ساتھ ہوتے تو اسے کبھی بھی اس طرح پیار نہ کرتیں جس طرح اکیلے آنے پر کرتی تھیں۔ اس سے زیادہ پیار تو وہ مونا جو ان کی سگی بیٹی بھی نہیں تھی اس سے کرتی نظر آتی تھیں۔ پھر ان کی گود میں عبداللہ آ گیا۔ مونا سے اگر وہ صرف مظہر انکل کی خاطر دکھاوے کا پیار کرتی تھیں تو عبداللہ تو ان کا سگا بیٹا تھا جس سے وہ والہانہ پیار کرتیں۔

اس کے دل میں ماں کے خلاف بہت سا غبار اور غلط فہمیاں پلتی چلی گئیں۔ یہ غلط فہمیاں اور بدگمانیاں اس وقت مزید شدت اختیار کر لیتیں جب ممانی یا ان کا کوئی بچہ اسے یہ احساس دلاتا کہ یہ اس کا گھر نہیں۔ وہ چودہ سال کی تھی جب آگے پیچھے نانا اور نانی دونوں کا انتقال ہو گیا اور ماموں، ممانی نے صاف صاف یہ بات کی کہ پرائی اولاد وہ بھی لڑکی کی ذمہ داری اٹھانے کو وہ تیار نہیں، لہٰذا وہ اپنی بیٹی کو اپنے ساتھ لے جائیں ممی کے چہرے پر یہ بات سنتے ہی پریشانی پھیل گئی تھی۔ اسے اس وقت اپنا آپ بڑا حقیر اور بے مقصد لگا تھا۔ وہ بہ حالت مجبوری اسے اپنے ساتھ اپنے گھر لائی تھیں اور اسے دیکھتے ہی مظہر انکل کا منہ بن گیا تھا۔ وہ کئی دنوں تک ممی سے بھی اس بات پر ناراض رہے تھے اور ممی ان کے آگے پیچھے انہیں منانے کے جتن کرتی ماہا کی شرمندگی اور ندامت کو دوچند کر دیا کرتیں۔ ماں کے خلاف جو وہ دل میں غلط فہمیاں، نفرتیں اور بدگمانیاں رکھتی تھی اچانک ہی ان سب کی جگہ ترس اور ہمدردی نے لے لی۔ اسے اس عورت پر ترس آنے لگا اور خود پر غصہ۔ وہ اپنی ماں کی پرسکون اور خوشگوار ازدواجی زندگی میں زہر گھولنے کا باعث بن رہی تھی۔ چاہے یہ حقیقت جتنی بھی تلخ اور ناقابل قبول تھی لیکن اپنی ممی کے اس گھر میں آنے کے صرف ایک گھنٹے کے اندر ہی اس نے یہ بات سمجھ لی تھی کہ اس کی ماں کی زندگی میں اب اس کی کوئی جگہ نہیں۔

مظہر انکل، مونا اور عبداللہ تینوں میں سے کوئی اس سے بات نہیں کرتا تھا اور ممی صرف اس وقت بات کرتیں جب مظہر انکل آفس گئے ہوتے۔ اس کے تعلیمی اخراجات، اس کے لباس اور دیگر بنیادی ضروریات ابھی بھی اس کے پاپا ہی کے پیسوں سے پوری ہوتی تھیں پھر بھی مظہر انکل کو ایسا لگتا جیسے وہ ان کے بچوں کا حق چھین کر کھا رہی ہے۔ وہ

اسکول سے دیر سے آتی تھی تب تک وہ سب کھانا کھا چکے ہوتے تھے۔ مونا کچن میں اس کے کھانے کے لئے کوئی چیز نہیں چھوڑتی تھی۔ وہ بچا ہوا کھانا فریزر میں ڈال دیتی، ماسی کو دے دیتی اور کچھ نہ ہوتا تو اپنی پالتو بلی کے آگے ڈال دیتی۔ یہ اس کا گھر نہیں تھا۔ جو وہ اس ناانصافی پر کسی سے احتجاج کرتی۔ وہ لباس تبدیل کر کے خاموشی سے ٹینک کے پاس والی جگہ پر اسکول کا کام کرنے بیٹھ جاتی اور وہیں پر پڑھتے پڑھتے سو بھی جاتی۔

یہ بھی عجیب اتفاق تھا کہ ماں کی طرف سے یا کسی بھی طرف سے کسی بھی توجہ کے بغیر اس کے امتحانی نتائج ہمیشہ شاندار ہوتے۔ مونا کو تو پڑھائی کا زیادہ شوق تھا ہی نہیں۔ مگر عبداللہ جس پر ممی اور مظہر انکل دونوں بھرپور توجہ دیتے۔ وہ بھی کسی غیر معمولی کارکردگی کا مظاہرہ نہیں کر پاتا تھا۔ مظہر انکل کو اس کی اعلیٰ تعلیمی کارکردگی بالکل اچھی نہیں لگتی تھی۔ مونا کی پڑھائی سے اتنی لاتعلقی اور غیر دلچسپی کو دیکھتے ہوئے مظہر انکل نے انٹر کرتے ہی اس کی شادی کر دی تھی۔ مونا کی شادی سے اسے یہ فائدہ ہوا تھا کہ لاؤنج میں سونے اور گھر کے پچھلے کونے میں یکسوئی سے پڑھنے کے بجائے اب اسے ایک کمرہ مل گیا تھا لیکن وہ اندر سے جانتی تھی کہ نہ یہ کمرہ اس کا ہے اور نہ یہ گھر۔

☆☆☆

حمیر کے بھائی اور بھابی اگلے روز شام کو ان کے گھر آئے تھے۔ وہ ممی کو یہ تو بتا چکی تھی کہ وہ اس کا کلاس فیلو نہیں بلکہ اس سے سینئر تھا چھٹی کا دن تھا، مظہر انکل گھر پر ہی موجود تھے مگر انہوں نے ڈرائنگ روم میں آ کر مہمانوں سے ملنا پسند نہیں کیا تھا، وہ کونسا ان کی سگی بیٹی تھی جو اس کے لئے آنے والے کسی رشتے میں وہ دلچسپی لیتے۔ حمیر کے بھائی اور بھابی اس کے تصور کے بالکل برعکس تھے۔ اس کے بھائی صرف شکل میں اس سے ملتے تھے ورنہ ان کی کوئی چیز ایسی نہیں تھی جو یہ ظاہر کرتی کہ وہ حمیر کے بھائی ہیں۔ وہ اپنی گفتگو ہی سے واجبی سے پڑھے ہوئے معلوم ہو رہے تھے اور ان کی بیگم ان سے بھی زیادہ کم تعلیم یافتہ اور عام سی تھیں۔ اس کے بھائی کی مردانہ کپڑے کی دکان تھی۔ وہ اپنے بیوی بچوں کے ساتھ الگ رہتے تھے، ان کے والدین کا انتقال ہو چکا تھا اور وہ بس دو ہی بھائی تھے۔ وہ حمیر سے عمر میں کافی بڑے تھے۔ ممی کے چہرے پر انہیں دیکھ کر تو کوئی متاثر ہونے والے تاثرات آ نہیں سکتے تھے مگر وہ یہ تو جانتی تھیں کہ جس کے لئے وہ آئے ہیں وہ IBA میں ان کی بیٹی سے سینئر تھا۔ اپنے بھائی کے متعلق مزید تفصیلات جب حمیر کے بھائی نے ممی کے گوش گزار کیں تو ان کے چہرے کے تاثرات ہی تبدیل ہو گئے۔ وہ ماہا کی شادی جلد از جلد کر دینا چاہتی تھیں اور اس کے لئے انہیں رشتے کی بھی تلاش تھی۔ مگر وہ ان کی اولاد تو تھی نا، جلدی کی خواہش رکھنے کے ساتھ وہ یہ بھی چاہتی تھیں کہ اس کی شادی کسی اچھی جگہ ہو اور یہ تو واقعی ایک بہترین رشتہ نظر آ رہا تھا۔

جواد رضا، حمیر کی تصویر اور اس کا وزیٹنگ کارڈ انہیں دے گئے تھے اور ساتھ ہی یہ بھی کہہ گئے تھے کہ وہ یہ رشتہ جلدی طے کر دینا چاہتے ہیں۔

مظہر انکل جنہوں نے اس کے رشتے کے لئے آنے والوں سے ملنا پسند نہیں کیا تھا انہوں نے رات کے کھانے پر ممی سے اس بارے میں پوچھا ضرور تھا۔ اور ممی نے جیسے ہی انہیں حمیر کے متعلق تمام تفصیلات بتائیں اس نے ان کے چہرے پر جلن اور حسد جیسے تاثرات دیکھے۔ اسے ان کے چہرے پر دکھائی دیتی جیلسی سے دکھ پہنچا تھا اتنے برسوں میں انہیں اس سے اتنی سی بھی انسیت نہیں ہو سکی تھی کہ اس کی کسی خوشی پر خوش ہو سکیں؟



ممی تو اس کی شادی کل کی کرتی آج کر دیتیں پھر یہ تو ایک بہترین رشتہ تھا۔ انہوں نے حمیر کے بارے میں کسی بھی طرح کی کوئی انکوائری یا معلومات کروائے بغیر بس ایک دفعہ اس کے گھر جا کر اس سے ملنے کے بعد اس رشتے کے لئے ہاں کہہ دی۔

باقاعدہ کوئی منگنی نہیں ہوئی تھی۔ بس بات پکی کر کے شادی کی تاریخ طے کر لی گئی تھی۔ اسے بہت عجیب عجیب سے خیال آتے، اسے آنے والے وقت سے بہت ڈر لگتا، وہ کیسا تھا، وہ کس طرح کی عادتوں کا مالک تھا، وہ کچھ بھی تو نہیں جانتی تھی۔ ڈاکٹر اعجاز جس لڑکے کی ذہانت کے قصے ہمہ وقت سناتے تھے کیا ضروری تھا کہ وہ عادتوں اور مزاج میں بھی اچھا ہوتا؟

بات طے ہو جانے کے بعد حمیر نے صرف ایک مرتبہ اس سے فون پر رابطہ کیا تھا اور اس میں بھی ان دونوں کی بہت مختصر بات ہوئی تھی۔

”اب تو یقین آ گیا کہ جس لڑکی کا راستہ میں نے کیمپس میں روکا تھا میں اس کے ساتھ وقت نہیں بلکہ اپنی پوری زندگی گزارنا چاہتا ہوں۔“

”آپ نے مجھے، میرا مطلب اتنا بڑا فیصلہ، آپ میرے بارے میں کچھ بھی تو نہیں جانتے پھر یہ سب۔“ وہ اس کی شوخی کے جواب میں سنجیدگی سے بولی۔

”اس سوال کا جواب دینے کے لئے مجھے جو کچھ کہنا پڑے گا، وہ ابھی کہنا مناسب نہیں۔ اس سوال کا جواب میں تمہیں 16 فروری کو اپنے گھر میں۔ سوری تب تو وہ ہمارا گھر ہو چکا ہو گا تو میں ہمارے گھر میں 16 فروری کو تمہیں تمہارے سوال کا جواب دوں گا۔“ وہ بے تکلفانہ انداز میں ہنستے ہوئے بولا اور وہ اس مختصری بے تکلفانہ گفتگو کے بعد بھی اپنے اندر کے ڈر اور خوف کو دور نہیں کر پائی تھی۔

وہ زندگی میں تیسری بار ایک گھر کو چھوڑنے والی تھی جس گھر میں اب وہ جا رہی تھی کیا وہ گھر واقعی اس کا گھر ہو گا؟ کیا وہ شخص واقعی ویسا ہو گا جیسا دکھتا ہے؟ آگے کیا ہونے والا تھا اسے کچھ پتا نہیں تھا۔ وہ بس ایک جوا کھیل رہی تھی اور اگر وہ سب کچھ ہار گئی تو اس کے پاس تو پیچھے پلٹ کر دیکھنے پر میکے نام کا آسرا بھی نہیں ہو گا۔

اس کی شادی کی تقریبات میں مہندی، مایوں کچھ نہیں ہوا تھا۔ اگر وہاں حمیر ان رسومات کے خلاف تھا تو یہاں اتنا فالتو پیسہ کسی کے پاس نہیں تھا کہ ان اللوں تللوں میں خرچ کرتا۔

تعلیم حاصل کرنے کے بعد اتنے ہی پیسے بچے تھے کہ اس کی اس عام سے انداز میں شادی ہو سکے۔ بہت عام سا ہی اس کا جہیز تھا۔ شادی ہو جانے کے بعد اب پیچھے اگر ماں اور اس کا گھر نہیں تھا تو باپ کا ترکہ بھی سب تمام ہو گیا تھا۔ شادی کے دن وہ اپنے پاپا کو یاد کر کے بہت روئی تھی۔ اگر وہ ہوتے تو اس کی ذہانت اور اس کی تعلیم پر کتنا خوش ہوتے، اس پر فخر کرتے، آج اس کی شادی کے دن اسے دلہن کے روپ میں دیکھ کر وہ کبھی مسکراتے اور کبھی اس کی جدائی پر آنسو بہاتے۔

وہ رخصت ہو کر حمیر رضا کے ساتھ اس نئے گھر میں آ گئی۔ حمیر کے بھائی، بھابی، ان کے بچے اور اس کے چند قریبی دوست رخصتی کے بعد اس کے اپارٹمنٹ میں ان دونوں کے ساتھ موجود تھے۔ وہ سب کچھ دیر ان دونوں کے

ساتھ رہے تھے۔ پھر ایک ایک کر کے وہ سب جانے کے لئے اٹھنے لگے۔ پہلے حمیر کے دوست رخصت ہوئے اور پھر رات دو بجے بھائی، بھابی اور ان کے پانچوں بچے بھی جانے کے لئے اٹھ گئے۔ حمیر نے رسماً بھی جواد بھائی اور ان کی فیملی کو رات یہیں رکنے کی دعوت نہیں دی۔ وہ سر جھکائے خاموش بیٹھی تھی، پھر بھی اسے حمیر کے غیر جذباتی پر تکلف اور رسمی انداز گفتگو پر حیرت ہوئی۔ اتنے دنوں کی اعصاب شکن صورتحال، خوف، اندیشے، ڈر وہ ان سب سے نڈھال ہو چکی تھی اور اب جب وہ اس بیڈ روم میں اکیلی بیٹھی تھی تو اسے ایسا لگا کہ اب ڈرنے اور اندیشے پالنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ اس نے خود کو پرسکون اور مطمئن کرنے کی کوششیں کرنی شروع کیں۔ حمیر چند لمحوں ہی میں جواد بھائی اور ان کی فیملی کو خدا حافظ کہہ آیا تھا۔

آج سب لوگوں نے اس کی بہت تعریفیں کی تھیں، کلثوم اور صنم نے خاص طور پر دلہن بنے اس کے اس روپ کو دل کھول کر سراہا تھا۔ اس کے چہرے میں کچھ ایسی غیر معمولی کشش اور جاذبیت تھی جو اس پر نگاہ ڈالنے والے کسی بھی شخص کو دوسری نگاہ ڈالنے پر مجبور کیا کرتی تھی۔ صنم کو یقین تھا کہ آج حمیر اس کے حسن کی شان میں ایک آدھ غزل نہیں بلکہ پورا دیوان کہہ ڈالے گا۔ اور حمیر نے نہ غزل کہی تھی نہ دیوان۔ اس نے اس کی تعریف بے شک بہت کی تھی، یہ بھی کہا تھا کہ وہ یونیورسٹی میں جیسی خوبصورت لگتی تھی آج اس سے بھی کہیں زیادہ خوبصورت اور بالکل مختلف لگ رہی ہے۔ مگر اس کی ماہا سے شادی کی وجہ اس کی خوبصورتی سے زیادہ اس کی ذہانت تھی۔ وہ اس کی ذہانت سے متاثر ہوا تھا۔ اسے اس کے بات کرنے کا انداز اچھا لگا تھا۔

''میں کبھی کسی ایسی لڑکی سے متاثر نہیں ہو سکتا تھا جس کے پاس حسن تو ہو پر ذہانت نہ ہو۔ ہر نارمل انسان کی طرح خوبصورتی مجھے بھی متاثر کرتی ہے مگر صرف اسے بنیاد بنا کر میں کسی لڑکی کو شادی کے لئے پسند نہیں کر سکتا تھا۔ میری خوش قسمتی کہ اللہ نے میرے نصیب میں دونوں ایک ساتھ لکھ دی تھیں۔ مجھے ایسی لڑکی مل گئی جو بے تحاشا خوب صورت بھی ہے اور بے انتہا ذہین بھی۔'' اس کی انگلی میں ڈائمنڈ رنگ پہناتے ہوئے حمیر نے کہا تھا۔

''جب تم ڈاکٹر اعجاز کے آفس میں آئیں تو میں نے تمہیں ذرا بھی اہمیت نہیں دی تھی۔ میں ان سے جو بات کرنے گیا تھا وہ کر چکا تھا اور جب تم آئیں تو وہاں سے اٹھنا ہی چاہ رہا تھا۔ مگر پھر یوں ہوا کہ میں وہاں سے اٹھ نہیں پایا۔ تم نے محض پانچ منٹ میں ہی مجھے اپنی جانب اس طرح متوجہ کر لیا کہ میں وہاں بیٹھا رہنے کے سوا اور کچھ کر نہیں پایا۔ تمہارے بولنے کا خوبصورت انداز۔ ایک تو آواز اتنی پیاری اوپر سے لہجہ ایسا دلنشین۔ مجھے کبھی کسی لڑکی نے اس طرح متاثر نہیں کیا تھا۔ میں وہیں بیٹھے بیٹھے تم سے شادی کا فیصلہ کر چکا تھا۔ تب ہی تم سے ذاتی نوعیت کے وہ سوالات پوچھے تھے جنہیں سن کر تمہارے چہرے پر ناگواری پھیل گئی تھی اور پھر اسی ناگواری کے ساتھ تم گفتگو ادھوری چھوڑ کر جب ایک دم ہی وہاں سے اٹھیں تو میرا دل چاہا تھا میں تمہارا ہاتھ پکڑ کر تمہیں روک لوں۔'' ماہا تم کہیں مت جاؤ۔ بس میرے پاس بیٹھ کر مجھ سے باتیں کرتی رہو۔ میں تمہیں دیکھتے رہنا چاہتا ہوں۔ میں تمہیں سنتے رہنا چاہتا ہوں۔ اس وقت اگر میں واقعی ایسا کر جاتا تو تم میرے ساتھ کیا سلوک کرتیں؟'' متبسم نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے اس نے پوچھا۔ لہجے کی شرارت یہ بتا رہی تھی کہ وہ اس کے ممکنہ ردعمل کو تصور کی آنکھ سے دیکھ کر انجوائے کر رہا ہے۔ جو وہ کرتی اسے سوچ کر اب اس وقت، اس جگہ بیٹھ کر اسے خود بھی ہنسی آنے لگی تھی، جسے اس نے بمشکل



کنٹرول کیا تھا۔'' اگلے روز مجھے انسٹی ٹیوٹ میں دیکھ کر جو تاثرات تمہارے چہرے پر آئے تھے انہیں دیکھ کر مجھے واقعی ایسا لگا تھا جیسے میں کوئی سڑک چھاپ لفنگا ہوں، جو خوامخواہ ایک شریف لڑکی کو تنگ کئے چلا جا رہا ہے۔ ویسے اس روز میں کسی سیمینار میں نہیں، صرف تمہاری خیریت ہی پوچھنے آیا تھا۔'' وہ ہنستے ہوئے بولا اور اس بار وہ اپنی مسکراہٹ اس سے چھپا نہیں پائی تھی۔

ایک انجانے سے خوف کی جس مسلسل کیفیت میں وہ گھری تھی دھیرے دھیرے اس سے نجات پانے لگی تھی۔

اگلے روز ان کا ولیمہ ہوا تھا۔ ولیمے کی تقریب میں گو کہ مہمانوں کی تعداد بہت کم تھی مگر وہ تقریب تھی بہت شاندار۔ جواد بھائی اور ان کی فیملی کے سوا، حمیر کے خاندان کا کوئی فرد اس تقریب میں موجود نہیں تھا۔ مہمانوں میں سب اس کے کولیگز، اس کے قریبی دوست اور دیگر ملنے ملانے والے شامل تھے۔ اسے یہ بات بہت عجیب لگی۔ مگر صرف ایک دن میں وہ حمیر سے اتنی بے تکلف نہیں ہوئی تھی کہ اس بارے میں کچھ پوچھ پاتی۔

اگلی صبح اس کی آنکھ کھلی تو حمیر اسے ڈریسنگ ٹیبل کے آگے کھڑا ٹائی باندھتا نظر آیا۔ وہ چونک جانے والے انداز میں یک دم اٹھ بیٹھی۔ اپنی شادی کے تیسرے دن وہ صبح صبح اتنے اہتمام سے تیار ہو کر کہاں جا رہا تھا؟

''آپ کہیں جا رہے ہیں؟''

''تم یہ آپ آپ کر کے مجھ سے بات کرنا چھوڑ دو۔ مجھے ایسا لگتا ہے جیسے میری بیوی نہیں، بلکہ میری کوئی کولیگ مجھ سے مخاطب ہے۔'' اسے اٹھ کر بیٹھتا دیکھ کر وہ فوراً ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے سے ہٹا اور پھر اس کے پاس آتے ہوئے اس طرز تخاطب پر اپنے اعتراض کا برملا اظہار کیا۔

''ویسے میں بینک جا رہا ہوں۔ یعنی اپنے آفس۔''

''آفس؟'' اس کی آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئی تھیں۔

''نہیں جاؤں؟'' وہ مسکراتے ہوئے اس کے قریب بیٹھ گیا۔

''نہیں، میں نے ایسا تو نہیں کہا۔'' وہ اسے اتنا قریب بیٹھتے دیکھ کر تھوڑا دور ہٹی۔ وہ اگر قریبی دوستوں کے سوا دوسرے لوگوں سے پر تکلف طریقے سے اور فاصلے رکھ کر ملا کرتی تھی تو یہاں گڑبڑ یہ تھی کہ حمیر رضا ''لوگ'' نہیں اس کا شوہر تھا اور وہ اس کے پر تکلف انداز کو اہمیت دینے کو تیار نہیں تھا، اسی لئے جیسے ہی وہ دور ہٹی اس نے اسے ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے دوبارہ اپنے اتنا ہی قریب کر لیا جتنی وہ پہلے تھی۔

''خاتون! اب آپ مس ماہا احمد علی نہیں کہ مجھ سے ایک کرسی چھوڑ کر بیٹھیں اور میں دیکھتا رہوں، اب آپ مسز ماہا حمیر رضا بن چکی ہیں اور یہ بات آپ کو یاد رہنی چاہئے۔''

☆☆☆

وہ دن اور اس سے اگلا دن بھی اسی طرح گزر گیا تھا۔ وہ صبح تیار ہو کر آفس چلا جاتا اور پھر شام ساڑھے چھ اور سات کے درمیان اس کی واپسی ہوتی اور دن بھر میں صرف ایک بار اس نے ماہا کو فون کیا۔ تیسرے دن وہ اسے اپنے ساتھ لے کر اسلام آباد آ گیا۔ یہاں اسے کوئی میٹنگ اٹینڈ کرنی تھی اور غالباً کسی ورک شاپ یا سیمینار میں بھی شرکت کرنی تھی۔ یہ ہنی مون کی کون سی قسم تھی وہ جانتی نہیں تھی۔ پورے تین دن وہ ہوٹل میں سارا سارا دن اکیلے رہ کر

اپنا ہنی مون مناتی رہی۔ اور چوتھے دن جب اسے لگا کہ اب وہ اس بندے کی ان نہ سمجھ میں آنے والی باتوں کو مزید برداشت نہیں کر سکتی، تب وہ صبح سویرے اس سے سامان پیک کرنے کا کہنے لگا۔

''ہم ایبٹ آباد، سوات اور گلگت جا رہے ہیں۔''

''وہاں پر بھی کوئی میٹنگز ہیں کیا؟'' نہ چاہتے ہوئے بھی اس کا لہجہ طنزیہ ہو گیا تھا اور وہ بے ساختہ قہقہ لگا کر ہنس پڑا تھا۔

''ہاں، ایک لڑکی ہے ماہا حمیر رضا اس کے ساتھ اگلے دس دنوں تک، چوبیس گھنٹے میری میٹنگز رہیں گی۔ ان تمام جگہوں پر۔'' وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے قریب بٹھاتے ہوئے بولا۔

☆☆☆

''میں نے اپنی زندگی کے اگلے سات آٹھ سالوں تک کی جو منصوبہ بندی کر رکھی تھی اس میں شادی کی کسی چیز کا کوئی ذکر نہیں تھا۔ اگلے آٹھ سالوں تک میرا شادی کرنے کا سرے سے کوئی ارادہ ہی نہیں تھا۔ مگر آٹھ سالوں بعد جب میں شادی کرنے کا سوچتا تب ماہا احمد علی مجھے مل بھی پاتی، اس کی کیا گارنٹی تھی؟ جو لڑکی مجھے دیکھتے ہی آنکھیں ماتھے پر چڑھا لے، تیوریوں پر بل ڈال لے۔ کیا اس سے میں یہ کہہ سکتا تھا کہ۔

''سنو ماہا! میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں مگر ابھی نہیں، آٹھ سال بعد۔ کیا تم آٹھ سالوں تک میرا انتظار کر سکتی ہو؟'' سوات میں اس کے ساتھ گھومتے ہوئے حمیر اس سے باتیں کر رہا تھا۔ ''میں تم ہی سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ مگر ابھی نہیں، سات آٹھ سال بعد۔ یہ میرے کیریئر کی شروعات ہے میں اس وقت شادی کا سوچنا بھی نہیں چاہتا تھا، مگر ڈر مجھے یہ لگا کہ جب میں شادی کرنے کی پوزیشن میں آ جاؤں گا تب یہ لڑکی نجانے کہاں کھو چکی ہو گی۔ مجھے تمہیں کھو دینے کا ڈر لاحق تھا اور اس ڈر نے میری ساری پلاننگز کا بیڑا غرق کر کے مجھ سے قبل از وقت شادی کا فیصلہ کروا لیا۔''

''مجھے ان پلاننگز کے ناکام ہو جانے پر خوشی کا اظہار کرنا چاہئے یا افسردگی؟''

''تمہاری مرضی ہے۔ ویسے تم اس بات پر اگر چاہو تو فخر بھی محسوس کر سکتی ہو کہ ایک ایسا شخص جو زندگی میں شادی سے ہٹ کر ابھی اور بہت سے کام کرنا چاہتا تھا، تم نے اس سے باقی سب کاموں سے پہلے شادی کا فیصلہ کروا لیا اور وہ بھی بالکل آناً فاناً۔'' اس کے شوخی بھرے سوال کے جواب میں وہ مصنوعی سنجیدگی سے مسکراہٹ لبوں پر روکتے ہوئے بولا۔

''پتا نہیں بات فخر کرنے والی ہے بھی یا نہیں۔ دنیا میں ایک میں اکیلی ذہین لڑکی تو نہیں۔ اگر کسی دن کوئی مجھ سے زیادہ ذہین لڑکی مل گئی تو میں اور میرا فخر تو منہ دیکھتے رہ جائیں گے۔'' اپنی شادی شدہ زندگی کے ان چند دنوں میں ان کے درمیان بہت سے موضوعات پر بہت ساری باتیں ہوئی تھیں، مگر وہ ایک لفظ جو اس کے لئے بہت اہمیت رکھتا تھا ایک بار بھی درمیان میں نہیں آیا تھا۔ وہ خوبصورتی سے متاثر نہیں ہوا تھا تو ذہانت سے ہو گیا تھا اور محبت؟ یہ ایک لفظ وہ بڑی شدت سے اس کے منہ سے سننا چاہتی تھی۔ اور وہ اس کے جواب میں چھپے مفہوم کو سمجھ بھی گیا تھا تب ہی اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے بولا۔ ''کیا یہ کہنا بہت ضروری ہے کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں؟''

''ہاں۔ ورنہ مجھے کیسے پتا چلے گا کہ جس بندے کو میں آفس، آفس اور کام، کام اور کام میں مصروف



دیکھ رہی ہوں اس کی زندگی میں میری کیا اہمیت ہے؟'' ابتدا جس جھجک اور تکلف کو وہ محسوس کرتی رہی تھی اب آہستہ آہستہ اس کے حصار سے نکلتی جا رہی تھی۔ اس کی وہ تنہائی جسے وہ بچپن سے سہتی آئی تھی یک دم ہی کہیں غائب ہو گئی تھی۔ اس کی تنہائیاں بانٹنے ہر وقت کوئی اس کے ساتھ تھا اور اس کے لئے یہ بڑا انوکھا اور دلفریب احساس تھا کہ جو شخص اس کے ساتھ ہے، وہ اس پر بلا شرکت غیرے پورا حق رکھتی ہے اور حق رکھنے والا یہ احساس از خود ہی اس کے اندر پیدا ہوتا چلا جا رہا تھا۔

اپنی زندگی کے اتنے برسوں تک رشتوں اور محبتوں کی محرومیاں سہتی رہنے والی لڑکی کو اچانک ہی ایسا لگنے لگا تھا جیسے اسے سب سے زیادہ اپنا کہہ سکنے والا ایک مضبوط رشتہ اور پورا حق رکھنے والی ایک بھرپور محبت مل گئی ہے۔ اور زندگی سے کیا چاہا تھا ماہا احمد علی نے؟

''میری زندگی میں تمہاری بہت اہمیت ہے ماہا! اور اگر محبت کا اظہار لفظوں سے کرنا ضروری ہوتا ہے تو میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں ماہا! تم میری زندگی کا سب سے خوبصورت احساس ہو۔'' اس کے ہاتھ پر اپنے ہاتھ کی گرفت مضبوط کرتے ہوئے اس نے محبت اور چاہت سے بھرپور لہجے میں کہا تھا۔

☆☆☆

وہ گلگت میں تھے اور سخت ترین سردی میں وہ اپنے کمرے میں ہیٹر آن کئے کمبل میں گھس کر بیٹھے ہوئے ڈرائی فروٹس کھانے اور باتیں کرنے میں مصروف تھے۔ آج وہ قدرے سنجیدہ موضوعات پر اس سے باتیں کر رہا تھا۔

''تمہیں میرے ساتھ بہت تیز رفتار اور بہت بھاگتی ہوئی زندگی گزارنی پڑے گی۔ میں زندگی کو جیسی ہے اور جہاں ہے کی بنیاد پر نہیں گزار سکتا۔ میں ابھی زندگی میں بہت کچھ حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ یہ میرے کیریئر کی ابتداء ہے ابھی مجھے بہت آگے جانا ہے۔ کیا تم میری رفتار کا ساتھ دے سکو گی؟'' اس نے ایک لمحہ کی بھی دیر لگائے بغیر سر اثبات میں ہلا دیا تھا۔ کیسی عجیب سی بات تھی جس شخص کے سنگ زندگی کا نیا سفر شروع کرتے ہوئے وہ بے شمار اندیشوں اور وسوسوں کا شکار تھی اب اس کی محبت میں مبتلا ہو کر اپنے ان اندیشوں اور وسوسوں پر ہنس رہی تھی۔ اسی رات حمیر نے اسے اپنے فیملی بیک گراؤنڈ کے متعلق بھی سب کچھ بہت سچائی اور ایمانداری سے بتایا تھا۔ اپنے خاندانی پس منظر اور اپنے بچپن کی کوئی بات اس نے ماہا سے نہیں چھپائی تھی۔ اسے حمیر کی صاف گوئی اور سچائی نے بے انتہا متاثر کیا تھا۔

اس جیسے مہذب بندے کے بارے میں کوئی سوچ بھی سکتا تھا کہ وہ ایک ایسے خاندان سے تعلق رکھتا ہے جہاں اعلیٰ تعلیم تو کیا عام سی تعلیم حاصل کرنے کا بھی رواج نہیں تھا۔ اس کی والدہ لکھنا پڑھنا کچھ نہیں جانتی تھیں اور والد بھی بس واجبی ہی سے تعلیم یافتہ تھے۔ اس کے والد کسی مل میں ایک معمولی سے ملازم تھے۔ اس نے اپنے چھوٹے سے گھر میں غربت اور کسمپرسی والے حالات دیکھے تھے۔ ایسے حالات کہ جہاں سفید پوشی کا بھرم رکھنا مشکل ہو جاتا تھا۔ جواد بھائی اس سے سولہ سال بڑے تھے اور صرف اپنے دو بچوں کا خرچ اٹھانا ہی اس کے والد کے لئے اپنی محدود آمدنی کے سبب سخت دشوار تھا۔ انہوں نے اسے ایک سرکاری اسکول میں داخل کروایا تھا مگر سرکاری اسکول میں اسے تعلیم دلانا بھی ان کی استطاعت سے باہر ہوا کرتا تھا۔ اس نے اپنی والدہ کو اپنے بچپن ہی سے بیمار دیکھا تھا۔ مگر اس ماحول اور ان حالات میں وہ اپنی ذہانت کے بل بوتے پر وظیفے حاصل کرتے رہنے کے سبب اپنی تعلیم کا سلسلہ کامیابی کے ساتھ

جاری رکھتا رہا۔ وہ اس ماحول میں اتنا مختلف کیسے پیدا ہو گیا تھا، یہ تعجب کی بات تھی، مگر سچ یہی تھا کہ وہ گدڑی کا لعل تھا۔ اس کی قدرتی ذہانت اور قابلیت اسے اپنے ماحول سے الگ کرتی تھی۔ وہ دس سال کا تھا تو اس کی والدہ اور بارہ سال کا تھا تب والد کا بھی انتقال ہو گیا تھا۔ اسے میرٹ اسکالرشپس ملتی رہیں۔ تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ اپنی ضروریات پوری کرنے کے لئے اس نے پارٹ ٹائم چھوٹی موٹی بہت سی ملازمتیں کی تھیں، ٹیوشنز پڑھائی تھیں۔ اس کے پاس قدرتی ذہانت تو تھی باقی مدد اس نے اپنی آپ کی تھی۔ وہ مکمل سیلف میڈ تھا۔

اب جس لب و لہجے میں وہ روانی سے انگریزی بولتا تھا اسے سن کر کوئی یقین نہیں کر سکتا تھا کہ وہ کسی گورنمنٹ اسکول کا پڑھا ہوا ہے۔ اس کے مینرز، اس کے ایٹی کیٹس، اس کی گفتگو، اس کا اٹھنا، بیٹھنا، ان سب کو اس نے خود محنت کر کے سنوارا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ ''جس انسان کے پاس کر گزرنے کا عزم ہو، ذہانت ہو، قابلیت ہو، خود پر اعتماد ہو تو پھر اسے آگے بڑھنے اور ترقی کرنے سے دنیا کی کوئی طاقت نہیں روک سکتی۔'' وہ صرف انٹر کرنے تک جواد بھائی اور ان کی فیملی کے ساتھ رہا تھا۔ پھر اس نے اپنا راستہ ان سے الگ کر لیا تھا۔ اسے ان کی زندگی گزارنے کے طریقہ، محدود سوچ اور گھٹے ہوئے ماحول والے گھر سے الجھن ہوتی تھی۔ نہ ان میں آگے بڑھنے کی جستجو تھی اور نہ ترقی کرنے کی لگن۔ تعلیم چلو اگر انسان زیادہ حاصل نہ بھی کر پایا ہو تب بھی اپنے لئے محنت اور کوشش کے ذریعے ترقی کی راہیں کھول سکتا ہے۔ مگر وہ تو کنوئیں کے مینڈک کی طرح اپنے حال میں مگن بڑے خوش تھے۔ بڑا تیر مارا تھا انہوں نے تو کپڑے کی مل کی نوکری چھوڑ کر اپنی بیوی کے بھائیوں کے ساتھ شراکت داری کر کے کپڑے کا کاروبار شروع کر دیا تھا۔ لیاقت آباد میں کرایہ کی دکان اور شراکت داری والا محدود سا کاروبار۔ وہ انہیں ایک ناکام انسان کہتا تھا۔ محدود آمدنی، محدود وسائل، پانچ بچوں کے اخراجات، نہ کوئی اسٹیٹس نہ کوئی اسٹینڈرڈ، جواد بھائی کے گھر کو چھوڑنے کے بعد وہ اندرون سندھ سے آئے اپنے پانچ دوستوں کے ساتھ ایک کمرے کے فلیٹ میں رہا کرتا تھا۔

اس نے کوئی آسان زندگی نہیں گزاری تھی۔ وہ محنت کر کے، سختیاں جھیل کر اور کڑی مشکلات سے گزر کر اس مقام تک پہنچا تھا۔ لیکن یہ مقام اس کی نگاہوں میں کافی نہیں تھا۔ ابھی اسے آگے جانا تھا، بہت آگے۔ اسے ترقی کرنی تھی، بہت ترقی۔ ابھی جو کچھ اس نے حاصل کیا تھا وہ تو اس کی نگاہوں میں آغاز تھا۔ ترقی اور کامیابی کی شاہراہ پر اس کا پہلا قدم۔ آگے ایک لمبا اور دشوار سفر تھا۔ وہ زندگی میں ناکام نہیں ہونا چاہتا تھا۔ وہ اپنے پروفیشن میں کامیابی کی آخری حدوں تک پہنچنا چاہتا تھا۔ ایک ملکی و بین الاقوامی سطح پر کامیاب سمجھا جانے والا قابل اور ماہر بینکر۔ ڈیفنس کے جس فیز میں وہ دو کمروں کے کرایہ کے اپارٹمنٹ میں رہتا تھا، وہ وہاں نہیں بلکہ ڈیفنس کے سب سے وی آئی پی فیز میں اپنے ذاتی دو تین ہزار گز کے بنگلے میں رہنا چاہتا تھا۔ جو گاڑی وہ ڈرائیو کرتا تھا، وہ دوسروں کو شاید اچھی لگتی ہو مگر اس کے معیار کے حساب سے وہ اچھی نہیں، بس صرف گزارے لائق تھی۔ وہ معمولی چیزوں کے ساتھ سمجھوتہ کر لینے والا انسان نہیں تھا۔ اسے حمیر کا ترقی اور کامیابی کی انتہائی منزلوں کو چھو لینے والا خواب اس لئے اچھا لگا کہ اس کے حصول کے لئے وہ محنت کرنے کی بات کر رہا تھا، کسی غلط راستے پر چلنے کی نہیں۔ اس کے سب خواب اس نے اپنی پلکوں پر سجا لئے تھے۔ جب اس شخص کو دل و جان سے اپنا لیا تھا تو اس کے خوابوں کو کیوں نہ اپناتی۔

وہ ماہا کی محبت میں مبتلا ہو کر اپنی سوچوں کے برخلاف جلدی شادی کرنے پر تو مجبور ہو گیا تھا لیکن ابھی چند



سالوں تک وہ اپنی فیملی میں اضافہ نہیں چاہتا تھا اور یہ بات اس نے ماہا سے اسی رات ہی کافی سنجیدگی سے کہی تھی۔

''بچوں کی ذمہ داری بہت بڑی ہوتی ہے ماہا! ماں باپ کا کام صرف انہیں پیدا کرنا نہیں بلکہ انہیں بہترین رہائش، بہترین آسائشیں اور بہترین تعلیم دینا بھی ہوتا ہے۔ میں اپنے بچوں کو ویسا بچپن اور ویسی زندگی نہیں دینا چاہتا جیسی میرے ابا جی نے مجھے دی۔ ہم اپنے بچوں کو ایک بہترین زندگی دیں گے ماہا! مگر اس کے لئے ہمیں چند سال انتظار کرنا ہو گا۔'' اس نے حمیر کی یہ بات بغیر کسی اختلاف کے فوراً مان لی تھی۔ محبت کی ایسی مضبوط ڈور اس شخص کے ساتھ بندھی تھی کہ اسے لگتا وہ اس کی کوئی بات کبھی رد کر ہی نہیں سکتی تھی۔ وہ ایک شخص، وہ ایک رشتہ، وہ ایک محبت، اس کی زندگی اب اس محور سے کبھی ہٹ نہیں سکتی تھی۔

وہ دس دن ان دونوں نے ساتھ یوں گزارے جیسے انہیں دنیا میں ایک دوسرے کے سوا کسی بھی شخص اور کسی بھی چیز سے کوئی دلچسپی نہ ہو۔ وہ اس کے ساتھ بہت گھومی، بہت انجوائے کیا اور وہ ہر پل اپنے رویوں سے اسے اپنی محبت کا بھرپور انداز میں احساس دلاتا رہا۔

☆☆☆

ہنی مون سے لوٹے تو زندگی صرف گھومنے پھرنے اور انجوائے کرنے والے دور سے نکل کر اپنے معمول پر آ گئی۔ ان کی شادی سے مہینہ بھر پہلے ہی حمیر اس نئے اپارٹمنٹ میں شفٹ ہوا تھا، اس لئے ابھی اپارٹمنٹ پوری طرح فرنشڈ اور ڈیکوریٹڈ نہیں تھا۔ وہ حمیر سے وہاں کا کرایہ سن کر بے ہوش ہوتے ہوتے بچی۔ اگر وہ اتنے دنوں میں اس کے مزاج کو سمجھ نہ گئی ہوتی تو وہ یہ ضرور کہتی کہ یہاں کے بجائے وہ کسی سستے اپارٹمنٹ میں نہیں رہ سکتے؟

وہ جہیز میں جو فرنیچر لائی تھی، وہ اس جگہ کے شایان شان نہیں اور نہ ہی حمیر کے معیار کے مطابق ہے، یہ بات وہ خود بہت اچھی طرح سمجھتی تھی۔ حمیر نے اس کی اجازت سے وہ سارا فرنیچر فروخت کر کے نیا قیمتی اور خوبصورت فرنیچر خرید لیا تھا۔ نیا فرنیچر خریدنے میں سارے پیسے تو حمیر ہی کے خرچ ہوئے تھے۔ حمیر کے ساتھ ساتھ وہ بھی اس نئے فرنیچر کے وہاں سج جانے پر بہت خوش تھی۔ اپنے گھر کی پہلی پہلی سجاوٹ اسے خوشی کے ساتھ فخر میں بھی مبتلا کر گئی تھی۔ ماہا احمد علی کو پورے حق کے ساتھ اپنا کہہ سکنے والا ایک گھر آخر کار مل ہی گیا تھا۔

☆☆☆

جس طرح حمیر نے اسے اپنے بارے میں سب کچھ بالکل سچائی سے بتایا تھا، اسی طرح اس نے بھی اسے پوری سچائی سے اپنے متعلق سب کچھ بتا دیا تھا۔ وہ سب جو کبھی کسی سے شیئر نہیں کر پائی تھی۔ دوستوں کے سامنے بھرم قائم رکھنے کو وہ ممی کی محبت، مظہر انکل کا التفات اور بھائی بہن کی چاہت کے جھوٹے قصے گھڑا کرتی تھی، مگر اس شخص کے سامنے اسے جھوٹی عزت اور جھوٹا بھرم قائم رکھنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ وہ ساری دنیا میں اس کا سب سے زیادہ اپنا تھا۔ وہ کسی بھی طرح کی شرمندگی محسوس کئے بغیر اس سے اپنا ہر دکھ کہہ سکتی تھی۔

''تمہیں ایسی بیوی ملی ہے جو کبھی میکے جایا ہی نہیں کرے گی۔ شوہروں کو بڑی آزادی کا احساس ہوتا ہے نا، جب بیویاں میکے جاتی ہیں۔ تمہیں یہ احساس کبھی نہیں مل سکے گا۔'' اس کے کندھے پر سر رکھ کر اس نے آنسو بہائے تھے، اپنے سارے دکھ اس سے کہے تھے اور اس نے اپنے ہاتھوں سے اس کے آنسو خشک کئے تھے۔ رو رو کر جب وہ اپنا

دل ہلکا کر چکی تو ماحول کی اداسی دور کرنے کی خاطر قصداً شرارتی انداز میں یہ بات اس سے کہہ گئی۔

''تم اگر مجھ سے دور جاؤ گی تو مجھے آزادی کا نہیں بلکہ گھٹن کا احساس ہوگا۔ اچھا ہے کہ تم اپنی ممی کے گھر نہیں جایا کرو گی، ورنہ اور کسی بات پر ہمارا جھگڑا ہوتا یا نہیں، تمہارے وہاں جانے پر ضرور ہوا کرتا۔ میں تمہیں خود سے دور اب کبھی دیکھ ہی نہیں سکتا۔'' وہ اسے اپنی محبتوں کا یقین دلا رہا تھا اور وہ سرشاری ہوتی اس کے بازو پر سر رکھ کر سونے کے لئے لیٹ گئی تھی۔

☆☆☆

انہیں اپنی روٹین لائف پر آئے زیادہ دن نہیں ہوئے تھے جب ماہا کا رزلٹ آ گیا۔ اپنی توقع کے عین مطابق وہ بڑے شاندار اور نمایاں انداز میں کامیاب ہوئی تھی۔ حمیر نے اس کی کامیابی کو بڑے جوش وخروش سے سلیبریٹ کیا تھا۔ وہ بے تحاشا خوش تھا بلکہ اسے تو یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اس سے بھی زیادہ خوش ہے۔ اپنی تمام مصروفیات چھوڑ چھاڑ کر اس نے وہ ساری شام ماہا کے نام کر دی تھی۔ ساری شام وہ دونوں ساتھ رہے تھے پھر رات میں حمیر نے اسے فائیو سٹار ہوٹل میں شاندار ڈنر کرایا اور گفٹ میں اسے وائٹ گولڈ کی چین دی جس میں ڈائمنڈز سے سجا لاکٹ تھا۔ یہ گفٹ بے شک بہت قیمتی تھا مگر اس کی اصل قیمت یہ تھی کہ حمیر نے یہ اسے خود اپنے ہاتھوں سے پہنایا تھا۔ زندگی میں پہلی بار اس نے احساس پایا تھا کہ اپنی خوشیاں وہ کسی کے ساتھ بانٹ بھی سکتی ہے، کوئی اور بھی ہے جو اس کی کامیابیوں اور اس کی خوشیوں کو اپنی کامیابیاں اور اپنی خوشیاں سمجھ کر بے تحاشا خوش ہو سکتا ہے۔

ڈنر کرنے کے بعد وہ دونوں، بہت دیر تک سمندر کے کنارے گھومے تھے۔ اگلے روز چھٹی کا دن تھا، اسی لئے بے فکری سے رات گئے تک جاگ کر انہوں نے ماہا کی پسند کی مووی دیکھی تھی۔

اگلی صبح وہ دونوں بارہ بجے سو کر اٹھے تھے۔ انہوں نے ناشتہ اور لنچ ایک ساتھ ملا کر کیا تھا۔ وہ برتن دھونے میں مصروف تھی جب حمیر نے اسے آواز دے کر بلایا۔

''کیا بات ہے حوی؟'' اسے حوی کہنا ماہا کو اچھا لگا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ جب وہ اسے اس نام سے بلاتی ہے دل میں محبت اور قربت کا احساس مزید بڑھ جاتا ہے۔

وہ اپنے سامنے انگریزی اخبار پھیلائے بیٹھا تھا۔

''یہ دیکھو، میں نے تمہارے لئے کتنی زبردست چیز تلاش کی ہے۔'' وہ فلور کشن پر اس کے برابر میں بیٹھ گئی اور پھر پوری طرح اخبار پر جھک کر اس اشتہار کو دیکھنے لگی جس پر حمیر نے انگلی رکھی تھی۔ ایک ملٹی نیشنل کمپنی کو فریش MBA کیے ہوئے Trainees کی ضرورت تھی۔ اس اشتہار کے علاوہ حمیر نے تین اور اشتہارات پر بھی نشان لگا رکھا تھا، جن میں ایک اشتہار ایک لوکل کمرشل بینک کا بھی تھا مگر وہ زیادہ ایکسائیٹڈ اس پہلے والے اشتہار ہی کے بارے میں تھا۔

''تم یہاں اپلائی کرو ماہا! اگر تمہیں یہاں جاب مل گئی تو مزہ آ جائے گا۔ اتنے شاندار کیریئر والی جاب اور اتنا بہترین سیلری پیکج۔'' وہ اس کی ایکسائٹمنٹ پر ہولے سے مسکرائی۔

''حوی! جاب تو بہت اچھی ہے لیکن ناین ٹو فائیو والی جاب کیا اب میں کر پاؤں گی؟ میں اپنے گھر کو اور تمہیں اگنور نہیں کرنا چاہتی۔ صبح تم آفس جاؤ تو میں تمہیں دروازے تک جا کر بڑے اہتمام سے رخصت کروں اور



جب شام میں واپس آؤ تو تمہارے لئے بہت اچھا سا کھانا پکا کر رکھوں اور خوب اچھی طرح ہو کر بج سنور کر تمہارا دروازے پر ہی استقبال کروں۔''

''تو کیا ماہا احمد نے علی نے MBA کرنے کی مشقت اس لئے اٹھائی تھی کہ وہ شادی کے بعد آج آلو گوشت پکاؤں یا گوبھی گوشت، جیسی سوچوں میں اپنا وقت گزارا کریں گی؟ اگر یہی کرنا تھا تو بی اے بلکہ انٹر بھی تمہارے لئے کافی رہتا۔'' وہ دادا ابا والے اس کی خفگی سے بھرپور لہجے پر کھل کر مسکرائی تھی۔

''میں آلو گوشت اور گوبھی گوشت کے علاوہ دوسرے سالن پکانے کے متعلق بھی سوچا کروں گی، فکر مت کرو۔'' پھر اسے تنبیہی نگاہوں سے گھورتا پا کر وہ بھی قدرے سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی۔

''میں نے یہ کب کہا ہے کہ میں گھر میں بیٹھی رہوں گی۔ میرا مطلب تھا، میں کوئی ہلکی پھلکی سی جاب کر لوں، ٹائم پاس کرنے والی۔ مجھے کسی کیریئر Oriented جاب کی طرف جا کر اور کسی سنجیدہ ومحنت طلب کیریئر کو اپنا کر اپنے گھر کو بالکل اگنور نہیں کرنا۔ کیا میری یہ سوچ غلط ہے؟''

''صرف غلط نہیں بلکہ ایک دم بکواس ہے۔ اتنی بڑی ڈگری حاصل کر کے چھوٹی موٹی جاب کرو گی؟ اتنی محنت کی ہے، اتنا پڑھا ہے تو اس کا کچھ ریٹرن بھی تو انسان کو حاصل کرنا چاہئے۔ IBA سے ایم بی اے کی ہوئی لڑکی، وہ بھی اتنے شاندار طریقے سے، کیا کوئی معمولی سی چند ہزار روپوں والی جاب کرتی اچھی لگے گی؟ انسان کو اپنے کیریئر کے اسٹارٹ میں خوب سوچ سمجھ کر صحیح راستے پر قدم رکھنا چاہئیں۔ جہاں میں کہہ رہا ہوں، وہاں جاب کرنے سے تمہارا کیریئر بنے گا احمق لڑکی!

تمہاری جیسی ٹیلنٹڈ لڑکی جاب اور گھر سب کچھ ساتھ ساتھ لے کر چل سکتی ہے پھر ہم گھر میں افراد ہی کتنے ہیں؟ صرف دو۔ ہمارے گھر کا ایسا کوئی کام نہیں جس پر تمہارے صبح سے شام تک گھر میں موجود نہ ہونے سے کوئی فرق پڑے گا۔ اگر تمہارا کیریئر صحیح ٹریک پر چل پڑا تو چند سالوں میں تم کہاں سے کہاں پہنچ جاؤ گی۔''

''اچھا بابا، تم جیتے میں ہاری۔'' وہ اس کے مضبوط دلائل سے بھری لمبی تقریر کے جواب میں مسکرا کر بولی۔

''ویسے ہم اس طرح بات نہیں کر رہے جیسے جاب مجھے آفر ہو چکی ہے۔ بس اب اسے قبول کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ مجھے کرنا ہے۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ میں ٹیسٹ میں ہی فیل ہو جاؤں یا وہ انٹرویو ہی میں مجھے ریجیکٹ کر دیں اور انڈوں کی ٹوکری ہمارے سر پر سے گر جائے۔''

''ناممکن، ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔'' اس کے شرارتی انداز کے جواب میں وہ نفی میں سر ہلاتا سنجیدگی اور بہت یقین کے ساتھ بولا۔ ''حمیر رضا کبھی کسی جگہ فیل نہیں ہوا تو اس کی بیوی کیسے ہو سکتی ہے؟''

☆☆☆

حمیر نے اس سے جہاں جہاں کہا تھا، اس نے ان تمام جگہوں پر اپلائی کر دیا تھا۔ اس کے پاس انٹرویو کے لئے کالز آنا بھی شروع ہو گئی تھیں۔ حمیر کو زیادہ شدت سے اس کمپنی سے کال کا انتظار تھا پھر آخر کار وہاں سے بھی اس کے پاس کال آ گئی۔ تب تک دو تین جگہوں پر سے تو اسے جاب مل جانے کی نوید بھی مل چکی تھی حمیر ٹیسٹ اور انٹرویو کی تیاری کے سلسلے میں اس سے کہیں زیادہ سنجیدہ تھا۔ اس نے خود ساتھ بیٹھ بیٹھ کر اسے ان دونوں چیزوں کی تیاری کروائی تھی۔

”حومی! میں بور ہوگئی ہوں، تمہارے منہ سے یہ خشک باتیں سن سن کر۔ کتنے دنوں سے تم نے نہ مجھے یہ بتایا کہ تم مجھ سے کتنی محبت کرتے ہو اور نہ یہ کہ میری براؤن آنکھوں کی طرف دیکھنے کے بعد تم باقی ہر بات بھول جاتے ہو۔“ وہ ڈھیر ساری کتابیں سامنے سے ہٹا کر ناز بھرے انداز میں اس کے کندھے پر سر رکھ کر بولی۔

”تم زیادہ میرلیس نہیں لگ رہی ہو مجھے، بس اس لئے ڈر رہا ہوں کہ کہیں تم وہاں کچھ گڑبڑ نہ کر آؤ۔“ اس نے اس کی غیر سنجیدگی اور غیر دلچسپی پر اسے سرزنش کی۔

”اچھا اب تم سنجیدہ ہو جاؤ اور دور ہٹ کر بیٹھو۔“ ماہا اس کے کندھے سے سر ہٹا کر فوراً سنجیدہ ہو کر بیٹھ گئی۔ وہ اسے لیٹ ڈاؤن نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اگر وہ چاہتا ہے کہ ماہا یہ جاب حاصل کرے تو وہ اسے حاصل کر لینا چاہتی تھی۔

اور پھر اس نے حمیر کو لیٹ ڈاؤن کیا بھی نہیں تھا۔ تحریری امتحان اور انٹرویو، وہ دونوں مراحل میں سرخرو ہوئی تھی۔ تین مہینوں کا ٹریننگ پیریڈ بہت بھاگتے دوڑتے اور مصروف گزرا تھا۔ اسے اپنے آفس میں ایسی کارکردگی کا مظاہرہ کرنا تھا کہ وہ وہاں مستقل ملازمت کی حقدار قرار پا سکے اور اس مقصد کے حصول کے لئے اسے بے تحاشہ محنت کرنی پڑ رہی تھی۔ اور پھر اس کی محنت رائیگاں گئی بھی نہیں تھی، اسے وہاں مستقل ملازمت مل گئی تھی۔ حمید اس کی جاب سے بہت خوش اور مطمئن ہوا تھا۔

ماہا کی پوری کی پوری تنخواہ گھر کے اخراجات میں خرچ ہو جاتی تھی۔ وہ ایک مہینے کچھ بچت کر بھی لیتی تو اگلے مہینے گھر کے لئے کسی نئی چیز کے خرید لینے پر وہ بچت خود بخود ہی ٹھکانے لگ جاتی۔

ان دونوں نے زیرو سے اسٹارٹ کیا تھا، اس سے شادی سے پہلے تک تو حمیر دوستوں کے ساتھ اپارٹمنٹ شیئر کر کے رہتا رہا تھا۔ گھر تو ان دونوں کا پہلا یہ تھا۔ چاہے کرایہ کا ہی سہی، وہ اپنے گھر کو بنانے، سجانے اور سنوارنے کے لئے ایک ایک کر کے گھر کی ضرورت کی ہر چیز خریدتی رہی۔ اپنی ساری تنخواہ خرچ کر ڈالتی تھی۔ حمیر اور وہ الگ الگ تو نہیں تھے۔ اگر اس کی پوری کی پوری تنخواہ گھر کے اخراجات میں خرچ ہو بھی جاتی تھی تو کیا ہوا؟ حمیر کی آمدنی جو اس کے مقابلے میں دگنی تھی، وہ اس میں سے ہر ماہ کافی رقم بچا لیا کرتا تھا۔ یہ بچت ان دونوں ہی کی تو تھی۔ ان دونوں کے اس گھر کے لئے یہ رقم جمع ہو رہی تھی جو ان کا اپنا ہوگا۔ اپنے ذاتی گھر کا خواب اس کا اور حمیر کا مشترکہ خواب تھا۔ اکثر وہ دونوں گھنٹوں بیٹھ کر اپنے گھر کے بارے میں باتیں کیا کرتے۔

”ہم اپنے گھر کے لان میں ایک حصے میں صرف گلاب ہی گلاب لگائیں گے۔ سرخ، سفید، گلابی، بہت سے رنگوں کے گلاب۔“ وہاں کا لان کیسا ہوگا والی بات جیسے ہی شروع ہوتی وہ فوراً یہ کہا کرتی اور جب یہ باتیں ہو رہی ہوتیں، تب وہ چپکے سے دل میں یہ بھی سوچا کرتی کہ ان کے بچوں کا کمرہ کس طرح کا ہوگا؟ ان کے درمیان بچوں کے موضوع پر بہت زیادہ بات نہیں ہوتی تھی۔ ہاں حمیر یہ ضرور کہتا تھا کہ وہ دو بچوں سے آگے اپنی فیملی نہیں بڑھائیں گے۔ وہ ابھی سے اس وقت کی سوچ کر دل میں انوکھی سی خوشی اور سرشاری محسوس کرتی۔ وہ وقت جب وہ ماں بنے گی، اس شخص کے بچے کی جسے وہ دل و جان سے چاہتی ہے۔ اپنا آپ کتنا معتبر اور کتنا مکمل لگنے لگے گا اسے اس وقت۔ وہ اس آنے والے وقت کا بہت صبر سے انتظار کر رہی تھی۔

☆☆☆



اسے حمیر کی ہر بات اچھی لگتی تھی۔ بس جواد بھائی کے ساتھ اس کا رویہ اسے اچھا نہیں لگتا تھا۔ اس موضوع پر کئی بار ان میں تکرار ہوتے ہوتے رہ گئی تھی۔ جواد بھائی، حمیر سے واقعی بہت محبت کرتے تھے۔ اس کا اندازہ اسے ہنی مون سے واپس آنے کے چند روز بعد ہی ہو گیا تھا۔ کتنے پیار سے وہ ان دونوں کو اپنے گھر کھانے کی دعوت دینے آئے تھے اور حمیر نے انہیں روکھے انداز میں صاف انکار کر دیا تھا۔ اس کے انکار پر ان کا چہرہ کیسا بجھ گیا تھا۔ اس نے کچھ نہیں کہا تھا۔ اس انکار میں اس کا کوئی عمل دخل نہیں تھا پھر بھی وہ شرمندہ ہوگئی تھی۔ وہ ان کے گھر مٹھائی اور پھل بھی لے کر آئے تھے۔ حمیر نے ان میں سے کسی چیز کو نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا تھا کہ وہ چیزیں اس کے معیار کی نہیں تھیں۔

”ہمیں جواد بھائی کے گھر جانا چاہئے تھا حومی! وہ اتنے پیار سے ہمیں انوائٹ کرنے آئے تھے۔“ ان کے جانے کے بعد وہ دل پر بوجھ سا محسوس کرتی حمیر سے بولی۔ حمیر اس کی بات سنی ان سنی کر کے اس کے ہاتھوں میں پڑی چوڑیوں سے کھیلتا رہا۔

”کون سا ہم دونوں کے کوئی بہت ڈھیر سے سارے رشتہ دار ہیں۔ ایک جواد بھائی ہی تو ہیں، انسان خونی رشتوں سے کٹ کر تو زندگی نہیں گزار سکتا۔“

”فار گاڈ سیک ماہا! پلیز بور مت کرو یار! یہ فضول قسم کی نصیحتیں کر کے تم میرے رومنٹک موڈ کا ستیاناس کر رہی ہو۔“ اس وقت وہ چپ ہوگئی تھی مگر وہ دیکھتی تھی کہ حمیر کے نظر انداز کرنے اور ہتک آمیز انداز اختیار کرنے کے باوجود جواد بھائی ان لوگوں سے ملنے آنا اور فون پر خیریت دریافت کرنا کبھی نہیں بھولتے تھے۔ وہ بھائی کی کامیابیوں پر بہت خوش ہوتے تھے، انہیں اپنے قابل بھائی پر بڑا فخر تھا۔ حمیر کے رویوں کی تلافی کرنے کے لئے وہ خود ان سے بہت اچھی طرح ملتی تھی۔

☆☆☆

می نہ کل کبھی اس کی زندگی میں شامل رہی تھیں اور نہ آج تھیں پھر بھی وہ ہفتہ میں ایک بار انہیں فون ضرور کر لیا کرتی تھی۔ کبھی کسی وجہ سے وہ فون نہ کر پاتی تو می اسے خود فون کر کے اس کی خیریت پوچھ لیا کرتی تھیں۔ تین، چار مہینوں بعد وہ کھڑے کھڑے می کے گھر بھی ہو آتی تھی۔

ان کی شادی کی دوسری سالگرہ سے چار ماہ پہلے حمیر کا پروموشن ہوا تھا۔ اپنی ترقی کی خوشی میں اس نے ماہا کو بلیک پرل کے ایئر رنگز گفٹ کئے تھے۔ اس موقع پر وہ خوش تو تھا مگر ایسا نہیں کہ اس نے کوئی کارہائے نمایاں سرانجام دے ڈالا ہو۔ جو معیار اس نے خود اپنے لئے طے کر رکھا تھا، ابھی وہ اس سے بہت دور تھا۔

☆☆☆

رات تقریباً پونے نو بجے دروازے پر بیل ہوئی تھی۔ اس نے بھاگتے ہوئے آکر دروازہ کھولا۔ حمیر نے اندر داخل ہوتے ہی اس کی تیاری کو بغور دیکھا۔

”آج کیا ہمیں کہیں جانا تھا؟ تم نے مجھے یاد کیوں نہیں دلایا فون پر؟“ وہ اس کی فون کال اور اب اتنی زبردست تیاری دیکھ کر یہی اندازہ لگا پایا کہ شاید آج وہ کسی پارٹی میں انوائیٹڈ ہیں۔

”جانا تھا نہیں، جانا ہے۔ آج تم مجھے باہر ڈنر کرانے لے جا رہے ہو، کسی بہت اچھی سی جگہ پر کیونکہ آج میں

نے گھر پر کھانا نہیں پکایا ہے، اس لئے۔'' وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اندر لاتے ہوئے متبسم لہجے میں بولی۔ وہ نہ سمجھ میں آنے والی نگاہوں سے اسے دیکھتا، اس کے ساتھ اندر آ گیا اور جیسے ہی ڈائننگ ٹیبل پر اس کی نگاہ پڑی، وہ ٹھٹک کر وہیں رک گیا۔ ٹیبل کے بیچوں بیچ رکھا خوبصورت سا کیک اور اس پر لگی دو موم بتیاں جو بیل کی آواز سنتے ہی اس نے جلا بھی دی تھیں۔

''ماہا!'' وہ آگے کچھ بھی نہیں بول پایا۔ اس کے چہرے پر یک دم ہی شرمندگی پھیل گئی تھی۔ شاید اپنا پچھلے سال کا وہ وعدہ بھی یاد آ گیا تھا جو سالگرہ بھول جانے پر اس نے یہ کہہ کر کیا تھا کہ وہ آئندہ اس دن کو ہرگز نہیں بھولے گا۔

''ہیپی اینی ورسری حوی!'' وہ اس کے گلے میں بانہیں ڈال کر مسکراتے ہوئے بولی۔

''ماہا! آئم سو سوری۔ میں پھر بھول گیا۔ تم نے مجھے یاد کیوں نہیں دلایا؟'' وہ اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لے کر بولا۔

''ہاں واقعی یہ تو میری غلطی ہے، مجھے یاد دلانا چاہئے تھا۔'' شرارتی سے لہجے میں مسکراہٹ دباتے وہ جیسے بڑی آسانی سے اپنی غلطی مان گئی تھی۔ ''اب ہم کیک کاٹ لیں؟'' وہ حمیر کا رخ کیک کی سمت کرتے ہوئے سوالیہ انداز میں گویا ہوئی۔ ''اس کے بعد میں تمہیں فریش ہونے کے لئے صرف دس منٹ کا ٹائم دینے والی ہوں کیونکہ مجھے بھوک بہت شدید لگ رہی ہے اور گھر میں کھانے کو آج واقعی کچھ نہیں ہے۔'' وہ چھری ہاتھ میں پکڑ کر کھلکھلائی۔ ان دونوں نے مل کر موم بتیاں بجھائیں، کیک کاٹا اور پھر اسے ایک دوسرے کو کھلایا۔

''میں تمہارے ساتھ اسی طرح اپنی شادی کی پچیسویں، چالیسویں، بلکہ پچاسویں سالگرہ بھی منانا چاہتی ہوں۔ یونہی تم بھول جاؤ اور یونہی میں تمہیں یاد دلاؤں۔''

''پچاسویں سالگرہ یعنی پچاس موم بتیاں۔ پچاس موم بتیاں کیک پر سمائیں گی کیسے؟''

''کوئی مسئلہ نہیں ہے، میں کیک بہت بڑا سا بیک کروں گی۔ اتنا بڑا کہ اس پر پچاس موم بتیاں لگائی جا سکیں۔''

وہ اسے ڈنر کرانے لے آیا تھا اور ڈنر کرتے ہوئے وہ دونوں اسی طرح کی باتیں کرتے رہے۔ اس کا تحفہ اور کارڈ حمیر کو پسند تو بہت آئے تھے مگر وہ خود اس کے لئے کچھ نہیں لا سکا۔ اس بات پر وہ خاصا شرمندہ تھا۔

''تم نے میری ذرا بھی تعریف نہیں کی۔ تم سے اچھا تو آئینہ ہے جس نے کم از کم مجھے یہ تو بتا دیا تھا کہ میں اچھی لگ رہی ہوں۔'' اپنی ظاہری خوبصورتی سے بے نیاز رہنے والی لڑکی کو اب اپنی تعریفیں سننا اچھا لگنے لگا تھا۔ وہ اس کے شکوے پر مسکرایا مگر بولا کچھ نہیں۔

''حوی! کیا میں اچھی نہیں لگ رہی؟''

''بس ٹھیک لگ رہی ہو۔'' حمیر نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا۔

''بس ٹھیک؟ پتا ہے، آج میں پارلر میں کتنے پیسے خرچ کر آئی ہوں؟ اور یہ ساڑھی جو میں نے خاص آج کے دن کے لئے خریدی تھی، کتنے کی ہے۔ میری نہیں تو کم از کم اس ساڑھی ہی کی تعریف کر دو۔'' ڈنر کے دوران وہ یونہی اسے اپنی تعریفیں کرنے کے لئے اکساتی رہی اور وہ ''ٹھیک لگ رہی ہو'' کہہ کہہ کر اسے چڑاتا رہا مگر وہاں سے واپس آنے کے بعد جیسے ہی وہ اپنے اپارٹمنٹ میں داخل ہوئی، حمیر اس کے شانوں کے گرد ہاتھ رکھ کر اسے اپنے قریب



کرتے ہوئے اس کے کان میں مدھم آواز میں بولا۔

''تم بہت خوبصورت لگ رہی ہو ماہا! اور تمہارے خوبصورت لگنے میں اس ساڑھی کا کوئی کمال نہیں کیونکہ مجھے تو تم ہمیشہ ہی خوبصورت لگتی ہو۔ کبھی یہ سوچنے لگوں کہ اللہ نے مجھے جو کچھ بھی دیا ہے اس میں میرے پاس سب سے قیمتی کیا ہے تو میرے ذہن میں صرف تم آتی ہو۔ تم میرے لئے بہت انمول اور بہت نایاب ہو۔ میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں ماہا!''

''کتنے دنوں بعد آج اتنے دل سے تم نے میری تعریف کی ہے۔'' وہ اس کے سینے پر سر رکھ کر دھیمے لہجے میں بولی۔

''دنوں کو یاد رکھنے اور انہیں منانے کا یہی فائدہ ہوتا ہے حوی! ہم زندگی کی مصروفیات اور بھاگ دوڑ میں الجھ کر، اپنے کاموں میں لگ کر خود سے وابستہ ان لوگوں کو جن سے ہمیں بہت محبت ہوتی ہے، اکثر یہ نہیں بتا پاتے کہ ہمیں ان سے کتنی بے تحاشا محبت ہے۔ جیسے آج تم نے کتنے سارے دنوں بعد مجھے یہ بات پھر سے بتائی کہ میں تمہارے لئے کتنی اہم ہوں۔ میں چاہتی ہوں، سال بھر میں کم از کم ایک آج کے دن ہم دونوں صرف ایک دوسرے کے لئے ہوں۔ ایک دوسرے کو یہ یاد دلانے کے لئے کہ ہمیں اب بھی ایک دوسرے سے پہلے جتنی ہی محبت ہے۔ گزرتا وقت ہماری محبت میں کمی نہیں بلکہ اس میں اضافہ کر رہا ہے۔'' حمیر نے جیسا کہا تھا، وہ واقعی اس کے ساتھ ویسی ہی زندگی گزار رہی تھی۔ انتہائی تیز رفتار، اتنی تیز، بھاگتی ہوئی کہ فرصت کے لمحات ان کے درمیان بہت کم آتے تھے۔

''کتنی جلدی دو سال گزر گئے، پتا ہی نہیں چلا ماہا!'' کتنے دنوں بعد آج وہ دونوں اتنی فرصت سے اپنی باتیں کر رہے تھے۔ آج حمیر کی آنکھوں میں نیند اور تھکن نہیں بلکہ صرف محبت تھی اور وہ اس کی یہ بات مان رہا تھا کہ دنوں کو یاد رکھنا چاہئے، انہیں سیلیبریٹ کرنا چاہئے۔''

''مجھے بہت اچھا لگے گا حوی! جب ایک روز تم مجھ سے کہو گے۔'' کتنی جلدی پچیس سال گزر گئے، پتا ہی نہیں چلا ماہا!'' وہ جواباً قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

''بہت جلدی ہے پچیس سال گزارنے کی۔ پچیس سال بعد تم بوڑھی بھی تو ہو جاؤ گی۔ پہلی بار دیکھا ہے کہ کوئی لڑکی اتنی شدت سے بڑھاپے کی تمنا کرے۔'' حمیر کے قہقہے میں اس کی ہنسی بھی شامل ہو گئی تھی۔

''اگلے سال میں آج کے دن کو ہرگز نہیں بھولوں گا۔ یکم فروری کو ہی اپنے آفس کے اور گھر کے کیلنڈر پر سولہ فروری کی تاریخ کو ہائی الرٹ کر دوں گا اور گفٹ تو تمہارے لئے جنوری کے آخر ہی میں خرید کر رکھ لوں گا۔'' وہ جواب میں کچھ کہے بغیر شرارتی مسکان لبوں پر لئے اسے دیکھتی رہی تو وہ اسے گھورتے ہوئے بولا۔

''تمہیں لگ رہا ہے میں پھر بھول جاؤں گا؟ دیکھ لینا، میں اب کبھی نہیں بھولوں گا۔''

''میں کب کچھ کہہ رہی ہوں، مجھے پتا ہے تم یاد رکھو گے۔'' وہ شوخی اور شرارت سے بھرپور مسکراہٹ اپنے لبوں پر روکتے ہوئے فوراً بولی۔

رات کو ساڑھے تین بجے تک جاگنے کا اثر یہ تھا کہ صبح آنکھ ذرا مشکل سے کھلی۔ روز وہ الارم بجنے سے پہلے اٹھ کر بیٹھ جاتی تھی جبکہ آج الارم سے بھی بمشکل اس کی آنکھ کھلی۔ حمیر بے خبر سو رہا تھا۔ اس کے ماتھے پر بکھرے بالوں

کو اپنے ہاتھوں سے پیچھے ہٹاتے ہوئے اس نے اسے آواز دی۔ اس نے اپنی سوئی ہوئی آنکھیں کھول کر اسے دیکھا تو وہ اسے اٹھنے کا کہہ کر بالوں میں کلپ لگاتی بستر سے اٹھ گئی۔ صبح وہ اپنے تیاری اور ناشتے کی تیاری ساتھ ساتھ کرتی تھی۔ آملیٹ کی پلیٹ ٹیبل پر رکھ کر وہ تیزی سے کمرے میں آئی تو وہ ہنوز بے خبر گہری نیند سوتا نظر آیا۔

''اوہ مائی گاڈ۔'' اس نے اپنا سر پیٹ لیا۔

''حومی! دیر ہوگئی، اٹھو۔'' اس نے زور سے اس کے کندھے کو ہلایا۔

دیر کا لفظ سنتے ہی وہ فوراً اٹھ بیٹھا اور جیسے ہی اس کی نگاہ گھڑی پر گئی وہ بوکھلائے ہوئے انداز میں بستر سے چھلانگ مار کر اترا اور بغیر کچھ کہے سنے سیدھا باتھ روم میں گھس گیا۔ کپڑوں کے ساتھ ہی ہینگر میں ٹائی بھی لٹکا کر وہ انہیں بیڈ پر رکھ کر باہر نکلی اور تیزی سے ناشتے کی چیزیں ٹرے میں لگانے لگی۔ وہ ناشتہ لے کر کمرے میں واپس آئی تو وہ ہڑبونگ مچائے شرٹ کے بٹن بند کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے والٹ میں سے کچھ تلاش بھی کر رہا تھا۔

''دیر ہوگئی، میں ناشتہ بالکل نہیں کر سکتا۔ اتنی امپورٹنٹ میٹنگ ہے۔ آج تو مجھے آٹھ بجے بھی پہلے نکلنا تھا۔''

وہ اس کے ہاتھ میں ٹرے دیکھ کر عجلت بھرے انداز میں بولا۔ وہ سینڈوچ اٹھا کر اس کے پاس آگئی۔

''میں ناشتہ نہیں کروں گا ماہا!'' اس نے پلٹ کر ہینگر میں سے ٹائی نکالی اور اسے گلے میں ڈالتے ہوئے اسے ایک مرتبہ پھر منع کیا۔

''تم اپنی تیاری کرو۔''

''میں تمہیں کیا کہہ رہی ہوں، ناشتہ تم منہ سے کرو گے اور تیاری ہاتھوں سے۔ دونوں کام ساتھ ساتھ ہو سکتے ہیں۔'' اس کے پاس اس وقت بحث و مباحثہ اور انکار کا بھی ٹائم نہیں تھا، وہ اس کے پیچھے پیچھے بھاگ کر اپنے ہاتھ سے اسے سینڈوچ کھلاتی رہی۔ بریف کیس میں فائلز سیٹ کر کے رکھتے وہ اس کے ہاتھ سے سینڈوچ کھانے کے ساتھ ساتھ اورنج جوس کا پورا گلاس بھی پی چکا تھا۔ اپنا کوٹ، موبائل اور بریف کیس اٹھا کر وہ کمرے سے باہر نکلا تو وہ اس کا والٹ لے کر تیزی سے اس کے پیچھے آئی۔

''اوہ...... تھینکس ماہا! ارے آٹھ دس ہو رہے ہیں، تمہاری وین نکل گئی۔ چلو میں تمہیں ڈراپ کر دوں۔'' اس کی تیاری میں لگ کر وہ خود آج لیٹ ہوگئی تھی۔

''مجھے ڈراپ کرو گے تو تمہیں اور دیر نہیں ہو جائے گی؟ تم جاؤ، میری فکر مت کرو، میں چلی جاؤں گی۔ ہاں ڈرائیو احتیاط سے کرنا، کہیں دیر ہوگئی کے چکر میں ریش ڈرائیونگ کرنے لگو۔'' وہ دروازے تک اس کے ساتھ ساتھ آئی اور اسے محتاط ڈرائیونگ کی نصیحت کرنا بھی نہیں بھولی۔ دن بھر مختلف کاموں کے پیچھے خوار ہوتے رہنے کے بعد انسان رات گئے تک بھی کاموں ہی میں الجھا رہے اور خود کو آرام نہ دے تو صحت کا کیا حال ہوگا۔ کیسا بے خبر ہو کر گہری نیند سو رہا تھا وہ۔ دیر ہو جانے کے سبب وہ بغیر ناشتہ کئے اپارٹمنٹ کا دروازہ لاک کرتی باہر نکلی تو حمیر ہی کے متعلق سوچ رہی تھی۔ اس کا دل اسے اتنی گہری نیند سے جگانے پر ذرا خوش نہیں تھا۔ وہ اس کی صحت کا سوچ سوچ کر کڑھ رہی تھی۔ وہ خود خالی پیٹ گھر سے جا رہی ہے اُسے خیال ہی نہیں آیا تھا۔

☆☆☆



''کل لوگ پی سی میں ڈنر کرتے بڑے خوب صورت لگ رہے تھے۔'' فائز اس کے کیبن میں داخل ہونے کے بعد اس کی میز کے آگے سے کرسی گھسیٹ کر اس پر دھم سے بیٹھتے ہوئے بولا۔ وہ یونہی شور مچاتا اور ہنگامے کرتا تھا۔

وہ کمپیوٹر پر اپنے کام میں مصروف تھی، اس نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

''تم میری جاسوسی کس خوشی میں کر رہے تھے؟'' فائز عبید آئی بی اے میں اس کے ساتھ تھا۔ کمپیوٹر اسٹڈیز کی طرف ہونے کی وجہ سے وہ ماہا کا کلاس فیلو تو ہرگز نہیں تھا مگر چونکہ وہ کلثوم کا فرسٹ کزن تھا اور اس کے ساتھ اس کی دوستی بھی بہت تھی، اسی لئے وہ وہاں اکثر ان لوگوں کے پاس آتا رہتا تھا۔ ذہین ہونے کے ساتھ ساتھ وہ بلا کا بذلہ سنج اور حاضر جواب تھا۔ اپنی ریزرو رہنے والی عادت کے برخلاف اس کی فائز سے آئی بی اے میں ان کی ملاقات کے چند ہفتوں ہی میں دوستی ہوگئی تھی بلکہ یہ کہنا غلط ہے کہ اس نے دوستی کی تھی، وہ خود ہی اپنے بے تکلف انداز سے اس کا دوست بن بیٹھا تھا اور یہ محض اتفاق تھا کہ جب ماہا نے یہ کمپنی جوائن کی، تب اس سے ایک ماہ قبل ہی وہ بھی اسی کمپنی کو جوائن کر چکا تھا۔

اپنے پاپا کے ٹھیک ٹھاک قسم کے بزنس اور ان کی کمپنی کو چھوڑ کر اس نے یہاں صرف اس ضد میں ملازمت اختیار کی تھی کہ وہ اپنے مما، پاپا اور تمام قریبی احباب کو جنہیں اس کی صلاحیتوں پر اگر کچھ شبہ تھا تو یہ دیکھ کر دور ہو جائے کہ وہ اپنی قابلیت کے بل بوتے پر ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں باآسانی ملازمت حاصل کر سکتا ہے۔

وہ یہاں سسٹم اینالائسٹ کی پوسٹ پر کام کر رہا تھا مگر ڈیپارٹمنٹ الگ ہونے کے باوجود وہ اکثر اس کے پاس آجایا کرتا تھا۔

''میں نے تمہیں نہیں دیکھا تھا۔ ویسے تم نے اگر مجھے دیکھ لیا تھا تو آ کر ملے کیوں نہیں؟ میں تمہیں حمیر سے ملواتی۔'' مونیٹر سے نظریں ہٹا کر اس نے فائز کو دیکھا۔

''جس بندے سے میں دن کے چوبیس میں سے سترہ گھنٹے جلتا رہتا ہوں، اس سے مل کر کیا کرتا۔ ویسے سات گھنٹے میں نے سونے والے مائنس کئے ہیں۔'' وہ میز کو اپنی انگلیوں سے بجاتا افسردگی سے بولا۔ ''میں بے چارہ تو سوچتا ہی رہ گیا کہ ذرا ایم بی اے مکمل کر لوں اور کوئی معقول سی جاب حاصل کر لوں پھر اس لڑکی سے حال دل کہوں گا مگر وہ بندہ تو مجھ سے کہیں زیادہ اسمارٹ نکلا۔ لے اڑا ہمارے انسٹیٹیوٹ کی سب سے خوبصورت لڑکی کو۔'' اپنی بے تکی باتوں کے دوران وہ ٹھنڈی آہیں بھرنا نہیں بھولا۔

''ذرا کسی دن میرے میاں کے سامنے کرنا یہ بکواس۔ وہ اچھی طرح تمہاری مزاج پرسی کرے گا۔''

''اچھا اچھا اب اپنے اس ہیرو کے ڈراوے مت دو مجھے۔ ویسے وہ بندہ تمہاری کچھ قدر شدر کرتا بھی ہے یا نہیں۔ کلثوم کہتی ہے، مشکل ہے کہ یہ لڑکی کسی جگہ لوگوں کو اپنی اہمیت کا احساس دلا سکے۔ ذرا وقتاً فوقتاً جتاتی رہا کرو محترم کو کہ وہ دنیا کے خوش قسمت ترین انسان ہیں، جنہیں اتنی اچھی بیوی ملی ہے۔'' وہ پکی سہیلیوں والے انداز میں اسے گر کی باتیں سکھانے لگا۔

''وہ خوش قسمت ہے یا نہیں، یہ تو نہیں معلوم مگر میں واقعی بہت خوش قسمت ہوں جو مجھے حمیر جیسا شوہر ملا ہے۔'' دوبارہ مونیٹر کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے وہ بہت سنجیدہ اور پریقین لہجے میں بولی۔

''اب تم اس طرح میری طرف کیا دیکھ رہے ہو۔ تمہیں کچھ اپنا کام وام ہے بھی یا نہیں۔'' وہ پرنٹر میں پیپیز لگا رہی تھی۔

''جیلس ہو رہا ہوں اس بندے سے جس کے تم ہر وقت گن گاتی ہو اور دعا کر رہا ہوں کہ وہ تم جیسی اچھی لڑکی کی ہمیشہ قدر کرے اور جناب! کاموں کا یہ ہے کہ لنچ ٹائم ہو چکا ہے، میں یہاں سے گزرتے ہوئے آپ کے کیبن کے پاس اسی لئے رکا تھا کہ لنچ ٹائم ہو جانے کی اطلاع دے سکوں۔'' وہ کرسی سے اٹھتے ہوئے بولا۔ ''چلو گی میرے ساتھ لنچ کرنے؟''

''نہیں، میں نے اپنے لئے یہیں پر سینڈوچ اور جوس منگوالیا ہے۔'' اس نے قطعیت سے انکار کیا۔

''ہماری ایسی قسمت کہاں کہ مسز ماہا حمیر رضا ہمارے ساتھ لنچ یا ڈنر کریں۔ لڑکی تم نے مسز بننے میں بہت جلدی کی ہے۔''

''فائز! تم یہاں سے چلتے پھرتے نظر آؤ، ورنہ میں ابھی زارا کو فون کرتی ہوں۔'' اس نے مصنوعی ناراضی سے اسے گھورتے ہوئے زارا کا نام لے کر اسے دھمکایا جو اس کے انکل کی بیٹی ہونے کے علاوہ اس کی منگیتر بھی تھی اور ایک بہت ہی سنجیدہ اور لمبے چوڑے لوافیئر کے بعد یہ منگنی انجام پائی تھی۔ زارا اور فائز کو اکیسویں صدی کا رومیو جولیٹ یا لیلیٰ مجنوں بڑے آرام سے کہا جا سکتا تھا۔ ''چلے جاتے ہیں جناب، ویسے کچھ اُڑتی اُڑتی خبر ملی ہے ہمیں مسز ماہا حمیر رضا کے پروموشن کی۔''

''واقعی، تم سچ کہہ رہے ہو۔ کس سے سنا تم نے؟'' وہ اپنا سب کام چھوڑ چھاڑ کر خوشی و بے یقینی کی ملی جلی کیفیت میں اس سے پوچھنے لگی۔ وہ اس کی بے قراری پر مسکرایا۔

''ابھی تو ہمیں نکالا جا رہا تھا۔ سچ ہے یارو! یہ دنیا ہے ہی مطلب کی۔''

''اچھا، صاف صاف بتاؤ ساری بات۔'' وہ واپس اس کے پاس آ کر اسے اس کے مطلوبہ سوالوں کے جواب دینے لگا۔

رات کو ڈنر کرتے ہوئے اس نے اپنے ممکنہ پروموشن کی خبر حمیر کو بھی سنائی جس عہدے پر اسے ترقی ملنے کا امکان تھا اس عہدے پر ترقی پانے کے ممکنہ دو امیدوار اور بھی تھے۔

''میں نے تم سے کہا تھا نا کہ یہ کیریئر والی جاب ہے۔ یہاں تم نے اپنی جگہ بنالی ہے، اب دیکھنا تم کتنا آگے تک جاؤ گی۔'' حمیر ڈنر کے دوران اس کی جاب اور کیریئر ہی کے متعلق باتیں کرتا رہا۔

کچن سمیٹنے، اپنے اگلے دن پہننے والے کپڑے استری کرنے اور دیگر ضروری گھریلو کاموں سے فارغ ہونے کے بعد وہ حمیر کے لئے گلاس میں دودھ لے کر کمرے میں آ گئی۔ وہ کمپیوٹر کے سامنے بیٹھا تھا۔ اسے اس کی صبح کی وہ گہری نیند ابھی بھولی نہیں تھی، اس لئے دودھ کا گلاس اس کے قریب رکھ کر خفگی سے گویا ہوئی۔

''آج تم دیر تک جاگ کر کوئی کام نہیں کرو گے۔ دودھ پیو، دانت برش کرو اور اچھے بچوں کی طرح لیٹ کر سو جاؤ۔ یہ کام کبھی بھی ختم نہیں ہوگا، ہاں اس کے چکر میں تمہاری صحت ضرور خراب ہو جائے گی۔'' وہ بڑی تیز رفتاری سے کی بورڈ پر انگلیاں چلا رہا تھا۔ وہ اپنے کام میں اتنا مصروف تھا کہ اس نے نہ اسے سر اٹھا کر دیکھا اور نہ پاس رکھے



دودھ کے گلاس کو۔

''حومی! میں تم سے بات کر رہی ہوں۔''

''میں نے سن لیا ہے ماہا! میں دودھ پی لوں گا۔ تم پلیز مجھے ڈسٹرب مت کرو۔ یہ رپورٹ بہت اہم ہے اور مجھے اسے آج ہر قیمت پر مکمل کرنا ہے۔'' اس نے لمحہ بھر کے لئے اپنے سامنے رکھے صفحات اور کی بورڈ سے نظریں ہٹا کر اسے دیکھا۔ ''میرے مطلب کا کام کوئی اور نہیں کر سکتا۔ یہ رپورٹ احسان کے حوالے کر دی تھی اور دیکھو ذرا کیا حشر کیا ہے محترم نے اس کا۔'' اس نے اپنے سامنے رکھے صفحات کا پلندہ ہاتھ میں اٹھا کر بہت غصے سے اسے دکھایا۔

''اتنا کام تو میں بھی کر سکتی ہوں حومی! اور یقین کرو، میں بالکل تمہارے مطلب کا کام کروں گی۔ تمہارے لئے آج پوری نیند سونا بہت ضروری ہے۔ پچھلے کتنے سارے دنوں سے تم ڈھنگ سے پوری نیند سوئے تک نہیں ہو۔ خدا کے لئے رحم کرو اپنے حال پر۔'' اس نے اسے ہاتھ پکڑ کر کرسی پر سے اٹھانے کی کوشش کی۔

''تم...... لیکن ماہا......''۔

''لیکن ویکن کچھ نہیں، یہ کام میں کر دیتی ہوں اور یقین رکھو تمہارے احسان صاحب جیسی کوئی گڑبڑ میں نہیں کروں گی۔'' اس نے اسے زبردستی وہاں سے اٹھا دیا اور پھر ضد کر کے اسے بستر پر لیٹ جانے پر بھی مجبور کر دیا۔ وہ واقعی اتنا تھکا ہوا تھا کہ بستر پر لیٹتے ہی ادھر اس کی آنکھیں بند ہوئیں اور ادھر وہ گردوپیش سے غافل گہری نیند سو گیا، اس کی نیند کو کمرے کی جلی ہوئی لائٹ تک ڈسٹرب نہیں کر رہی تھی۔ وہ اگرچہ بڑی احتیاط سے کام کر رہی تھی۔ کسی قسم کا کوئی شور بھی پیدا نہیں ہونے دے رہی تھی مگر پرنٹس لیتے وقت پرنٹر کا مخصوص شور جب سناٹے میں گونجا تو اس نے فوراً پلٹ کر حمیر کو دیکھا، وہ اسی طرح بے خبر سو رہا تھا۔ یوں جب وہ تمام صفحات کے پرنٹ آؤٹس لینے اور کمپیوٹر بند کرنے کے بعد بستر پر آئی تو سوا چار بج رہے تھے۔ اس کی آنکھ لگنے والی تھی جب سوتے میں حمیر نے کروٹ بدلی اور اس کا ہاتھ ماہا کے کندھے سے ٹکرایا۔

''کام ہو گیا ماہا؟'' اس نے غنودگی میں اس سے پوچھا۔ تھکاوٹ کے شدید احساس اور نیند کے غلبے کے باوجود اسے بے اختیار ہنسی آ گئی۔ سوتے میں بھی اسے اپنے کاموں ہی کی ٹینشن تھی۔

''سو تو سکون سے جایا کیجئے مسٹر حمیر رضا! ہاں ہو گیا۔'' اسے اطمینان دلاتے ہوئے اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

صبح اس کی آنکھ اپنے مقررہ وقت پر کھل گئی تھی اور اٹھتے ہی اسے یوں لگا تھا جیسے ابھی تو آنکھ لگی تھی۔ آج حمیر صحیح وقت پر جاگ گیا تھا۔

''تھینک یو ماہا!'' حمیر نے کھڑے کھڑے رپورٹ پر نگاہیں دوڑائیں اور پھر مطمئن ہو جانے والے انداز میں اسے اپنے بریف کیس میں رکھ دیا۔

''تم مجھے اپنی سیکرٹری اپائنٹ کر لو، میں تمہارا سارا کام بالکل ٹھیک ٹھیک کیا کروں گی، تمہاری مرضی کے مطابق۔''

''اتنی خوبصورت اور اتنی ذہین سیکرٹری، پھر تو میں گھر آیا ہی نہیں کروں گا۔ سارا وقت آفس میں رہا کروں گا۔'' وہ ماہا کے شرارتی انداز کے جواب میں ہنستے ہوئے بولا۔

وہ آفس جانے کے لئے اپنے اپارٹمنٹ سے نکل آئی تھی۔ لفٹ سے اتر کر اس کی نگاہ ریکا پر پڑی۔ ان کی بلڈنگ کے فرسٹ فلور پر رہنے والی جاپانی میاں بیوی کی دو سالہ بیٹی۔ باوجود اس کے کہ اس وقت اس کی وین آنے کا ٹائم ہو رہا تھا پھر بھی وہ ریکا کو پیار کئے بغیر وہاں سے کیسے جا سکتی تھی؟ وہ اتنی چھوٹی سی اور اتنی پیاری سی تھی۔ واقعی جاپانی گڑیا اور جب اپنی ماں سے ہاتھ چھڑا کر وہ تیز تیز چلتی تو اس کا دل چاہتا، وہ گود میں اٹھا کر اسے خوب ہی پیار کرے۔ اس کی جاپانی پڑوسن اپنے مخصوص تہذیبی انداز کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کے سامنے کچھ جھکی اور پھر اس کی خیریت دریافت کی۔ اس نے بھی جواباً اس کی خیریت پوچھی اور اس دوران ریکا کو گود میں اٹھا کر جلدی سے اس کے دونوں گالوں پر پیار بھی کر لیا تھا۔

آفس میں ایک اور مصروف ترین دن اس کا منتظر تھا پھر آج تو آفس سے واپسی میں سیدھے اپنے اپارٹمنٹ جانے کے بجائے اسے کلثوم کے گھر جانا تھا۔ کلثوم کے جڑواں بچوں کی پہلی سالگرہ اور عقیقے کا فنکشن ایک ساتھ ہوا تھا، اور اس تقریب میں کلثوم نے اپنے شوہر کے ساتھ ان کے گھر پر آ کر بڑے خلوص سے اسے اور حمیر کو انوائٹ کیا تھا۔ وہ وہاں جانا چاہتی تھی مگر حمیر کے پاس اس روز بالکل فرصت نہیں تھی۔ اس نے کلثوم کے جانے کے بعد حمیر سے وہاں چلنے کے بارے میں پوچھا تو اس نے اپنی مصروفیت کا بتا کر وہاں جانے سے معذرت کر لی۔

رات کے وقت وہ اکیلی تو نہیں جا سکتی تھی۔ اسی لئے اسے اپنا جانا بھی ملتوی کرنا پڑا تھا۔ کلثوم سے اس نے فون پر معذرت کر لی تھی مگر وہ جانتی تھی کہ اس نے اس کے نہ آنے پر بہت برا مانا ہوگا، اس لئے تب ہی اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ اپنی پہلی فرصت میں کلثوم کے گھر اس کے بچوں کے لئے گفٹس لے کر ضرور جائے گی۔ حمیر کو وہ کل ہی اپنے آج کے پروگرام سے آگاہ کر چکی تھی۔ وہ اس پر پابندیاں نہیں لگاتا تھا مگر وہ اس کے علم میں لائے بغیر کبھی کہیں نہیں جاتی تھی۔

آفس وین سے وہ راستے میں پڑنے والے شاپنگ سینٹر پر اتر گئی۔ کھلونوں کی ایک دکان سے اس نے کلثوم کے بچوں کے لیے تحفے خریدے۔ بچوں کے کھلونوں کی دکان کتنی اچھی لگ رہی تھی۔ اگر اسے کلثوم کے گھر پہنچنے کی جلدی نہ ہوتی تو وہ ابھی مزید کچھ وقت یہاں رکھے کھلونوں کو دیکھتے ہوئے بتا دیتی۔

وہ کلثوم کے گھر پہنچی تو وہ غیر متوقع طور پر اسے اپنے سامنے دیکھ کر اتنی خوش ہوئی کہ اپنی ساری ناراضی بھلا کر والہانہ پن اور گرم جوشی سے اسے گلے سے لگا لیا۔ اسے شاید ماہا کے آنے کی امید نہ تھی۔ ”اکیلی آئی ہو؟“ جواباً سر اثبات میں ہلا کر وہ اس کی گود سے اس کی بیٹی کو اپنی گود میں لے کر اسے پیار کرنے لگی۔

”جو ڈول میں تمہارے لئے لائی ہوں تم تو اس سے بھی زیادہ پیاری ہو گئی ہو۔“ وہ اس کے گالوں پر چٹا چٹ پیار کرتے ہوئے محبت سے بولی۔

”شام کے وقت اکیلی کیوں آئیں ماہا؟ شہر کے حالات اتنے اچھے بھی نہیں ہیں۔“ کلثوم کے چہرے پر اس کے لئے محبت بھری تشویش پھیلی ہوئی تھی۔

”مائی ڈیئر فرینڈ! میں اب یونیورسٹی گرل نہیں رہی۔ شادی شدہ عورت اور ورکنگ وومن ہوں۔ شام کا وقت مجھے کچھ نہیں کہتا۔“ کلثوم نے جواباً کچھ کہنے کے لئے لب کھولے مگر پھر اپنی ساس کو ڈرائنگ روم میں آتا دیکھ کر قصداً اس ذکر کو چھوڑ کر اس کی اور حمیر کی خیریت پوچھنے لگی۔ کلثوم کے لیے چائے کے لوازمات سے لطف اندوز ہونے کے بعد وہ فوراً گھر واپسی کے لئے اٹھ جانا چاہتی تھی۔



”میں اتوار کے دن فرصت سے خوب لمبا بیٹھنے کے لئے آتی۔ مگر کیا کروں یار! چھٹی کا دن باقی سارے ہفتے سے بھی زیادہ مصروف گزرتا ہے۔“

”کتنا گھن چکر بنا کر رکھا ہوا ہے تم نے خود کو ماہا! ذرا حال تو دیکھو اپنا۔ کیسی کمزور لگ رہی ہو۔ اور آنکھوں کے نیچے اتنے گہرے حلقے جیسے نجانے کب سے پوری نیند بھی نہیں سوئیں۔“

”جو آپ سے بہت محبت کرتے ہیں، انہیں آپ ہمیشہ ہی کمزور لگتے ہیں۔ وہ کلثوم کے تشویش بھرے انداز پر مسکرا دی۔

”کبھی یہ حمیر رضا فرصت سے میرے ہاتھ لگے تو میں اسے خوب کھری کھری سناؤں۔ میری اتنی پیاری اور نازک سی دوست کا کیا حشر کر دیا ہے اس نے۔“

”ایکسکیوزی، آپ میرے منہ پر میرے میاں کی برائی کر رہی ہیں۔“ اس نے کلثوم کو گھورا، مگر وہ اس کے گھورنے سے ذرا متاثر نہیں ہوئی۔

”اس کے پاس تمہارے لئے کوئی ٹائم نہیں بڑی مصروف شخصیت ہیں موصوف۔ تم میرے گھر فنکشن پر آنا چاہتی تھیں مجھے اچھی طرح پتا ہے۔ مگر وہ جو منسٹر لگے ہیں ان کے پاس بیوی کو اس کی اکلوتی سہیلی کے گھر لے جانے کا وقت نہیں تھا اور آج تم اتنی شام گئے یہاں اکیلی آئی ہو اور اکیلی ہی جاؤ گی۔ اسے تمہاری کچھ پروا ہے بھی کہ نہیں؟“ وہ حمیر کے خلاف کوئی بات نہیں سن سکتی تھی اسی لئے اس کے چہرے پر ناگواری سے بھرپور تاثر پھیل گیا۔

”پلیز کلثوم“۔ اس نے سخت لہجے میں کلثوم کو ٹوکا۔ مگر کلثوم غصے میں تھی سو بولے گئی۔ حمیر مجھے ویسا نہیں لگتا جیسا تم اسے بتاتی ہو۔ بہت چالاک اور خود غرض لگتا ہے یہ مجھے۔ تمہیں فورس کر کے اس نے جاب کروائی۔ میں یہ نہیں کہہ رہی کہ جاب کرنا برا ہے۔ مگر شادی کے بعد یہ میری مرضی ہے کہ میں نوکری کروں یا نہیں۔ میرا تمام تر خرچ اٹھانا اور ساری ضروریات پوری کرنا میرے شوہر کی ذمہ داری ہے۔ کما کر لانا مرد کی ذمہ داری اور گھر خوش اسلوبی سے چلانا عورت کی ذمہ داری۔ جب ایک مرد ایک عورت کو اپنے نکاح میں لیتا ہے تو پھر وہ اس کے نان نفقے اور تمام اخراجات کی ذمہ داری قبول کرتا ہے۔ یہ میں نہیں کہہ رہی، یہ ہمارے مذہب نے ہمیں بتایا ہے۔ تم اس کے مجبور کرنے پر اس کے ساتھ برابر کا کما رہی ہو اور اس کے پاس تمہیں دینے کے لئے وقت تک نہیں؟ پاکستان میں رہتے ہوئے تم دونوں امریکن اسٹائل کی زندگی گزار رہے ہو۔“

”بس کرو کلثوم! تم حمیر کے خلاف یہ ساری بکواس اس لئے کر رہی ہو کہ میں تمہارے بچوں کے فنکشن پر نہیں آسکی اور اس روز جب تم مجھے انوائٹ کرنے آئی تھی تب اس نے تم لوگوں کو یہ کہہ دیا تھا کہ وہ تم لوگوں کے آنے سے پہلے کہیں جانے کے لئے نکلنے والا تھا۔ وہ تم لوگوں کو اگنور نہیں کرنا چاہ رہا تھا، وہ واقعی ایک بہت اہم ڈنر میں جانے کے لئے لیٹ ہو رہا تھا۔“ حمیر کے یہ کہنے کے بعد کہ وہ کہیں جا رہا تھا، کلثوم اور اس کا شوہر پھر ان کے گھر پر زیادہ دیر نہیں رکے تھے۔ اسے خود محسوس ہوا تھا کہ کلثوم کو حمیر کا روکھا پھیکا انداز برا لگا تھا۔ تب حمیر کے رویے سے اسے بھی رنج ہوا تھا مگر وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ جس ڈنر میں جانے کے لئے وہ لیٹ ہو رہا تھا وہ اس کے پروفیشن کے حوالے سے

اس کے لئے کس قدر اہم تھا۔

"تمہیں کیا معلوم وہ مجھ سے کتنی بے تحاشا محبت کرتا ہے۔ ہر انسان میں کچھ نہ کچھ خامیاں ہوتی ہیں کیا تم میں اور مجھ میں نہیں؟ وہ اپنے پروفیشن اور اپنے کیریئر کو بہت سنجیدگی سے لیتا ہے اور میں اسے برائی ہرگز نہیں سمجھتی۔ بس اسی وجہ سے، اس کے پاس کسی اور کے لئے تو کیا خود اپنے لئے بھی وقت نہیں ہوتا۔ پھر وہ تمہارے میاں کی طرح نہیں کہ باپ کے ترکہ میں اسے ایک گھر اور دولت جائیداد مل گئی ہو۔ نہ اسے اپنے ماں باپ کی طرف سے وراثت میں کچھ ملا ہے اور نہ مجھے۔ ہم دونوں کو مل کر اپنا ذاتی گھر بنانا ہے۔ ہمیں اپنی زندگی خود بنانی اور خود سنوارنی ہے، ماں باپ کی طرف سے کسی سپورٹ کے بغیر۔ اگر اس مقصد کے حصول کے خاطر میں اس کے ساتھ مل کر جدوجہد کر رہی ہوں تو کس کے لئے؟ اپنے ہی لئے نا۔ اپنے ہی گھر کے لئے، اس میں کیا برائی ہے؟ اور اس کی محبت جس پر تمہیں شک ہے اس میں نہ کل میرے لئے کوئی کمی تھی اور نہ آج ہے۔ وہ پورا کا پورا میرا ہے۔" اسے کلثوم کی باتیں بہت بری لگی تھیں۔ اسی لئے وہ اپنے لہجے میں در آنے والے غصے پر قابو نہیں رکھ پائی تھی۔ اسے یہ اندازہ نہیں تھا کہ کبھی کلثوم کا فون آنے پر وہ گھر پر نہ ہوتی اور پھر دوبارہ کبھی اسے فون پر بات ہونے پر اپنی غیر موجودگی کی وجوہات کے سلسلے میں یہ بول دیتی کہ وہ اپنے سردیوں یا گرمیوں کے کپڑے خریدنے گئی ہوئی تھی۔ گھر کا دوسرا کوئی بھی سامان خریدنے گئی ہوئی تھی تو اس کی ان تمام باتوں کو کلثوم اس انداز اور اس پیرائے میں لے گی، نہ صرف یہ کہ لے گی بلکہ انہیں یاد بھی رکھے گی اور اسے جتائے گی بھی۔ اگر اسے اس بات کا تھوڑا سا بھی اندازہ ہوتا تو کبھی بھی اپنے منہ سے روانی اور سادگی میں نکلے ان جملوں کو نہ نکلنے دیتی۔

"محبت...... ہونہہ۔" اس کے غصے کا اثر قبول کئے بغیر کلثوم تلخی سے بولی۔ "مجھے تو تمہاری یہ بات بھی سراسر جھوٹ لگتی ہے ماہا! کہ تم ابھی بچوں کے جھنجھٹ میں پڑنا نہیں چاہتیں۔ اگر بچے تمہیں ایسا ہی جھنجھٹ اور وبال لگتے تو میرے بچوں کو یوں تڑپ کر والہانہ انداز میں پیار نہ کیا کرتیں۔ جو عورتیں ماں بننے سے اتنی بیزار ہوتی ہیں پھر وہ دوسروں کے بچوں کو اس طرح پیار بھی نہیں کرتیں۔" کلثوم نے قدرے بے رحمانہ انداز میں یہ بات کہتے وقت ماہا اور اس کی گود میں عشناء کو بغور دیکھا۔ یوں جیسے اسے یہ جتانا چاہتی ہو کہ وہ جب سے یہاں آئی ہے، اس کی بیٹی مسلسل اس کی گود میں بیٹھی ہے اور وہ باتوں کے دوران تھوڑی تھوڑی دیر بعد اس کے گالوں اور ہاتھوں پر پیار بھی کرتی جا رہی ہے۔ بے ساختہ اور قطعاً غیر اختیاری طور پر اس نے فوراً عشناء کو گود سے اتار کر صوفے پر بٹھا دیا۔

"میری نجی زندگی میں مداخلت کا تمہیں کوئی حق نہیں ہے کلثوم! میں کب ماں بننا چاہوں گی، اس بات کا فیصلہ میں اور میرا شوہر مل کر کریں گے، تمہیں اس بارے میں فکر کرنے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں۔ مجھے افسوس ہو رہا ہے اپنے یہاں آنے پر۔ نہ میں آج تمہارے گھر آتی اور نہ تم حوی کے خلاف میرے ہی منہ پر یہ فضول بکواس کرتیں۔"

وہ یک دم ہی صوفے پر سے اٹھ گئی۔

"تم ناراض ہو جاؤ یا برا مانو، مگر میں کیا کروں ماہا! میں تمہاری دوست ہوں۔ تم مجھے بہت عزیز ہو۔ میں تم سے بہت پیار کرتی ہوں اور میرا یہی پیار مجھے تمہاری فکر کرنے پر اکساتا ہے۔ میں تمہیں کیسے سمجھاؤں کہ اس شخص پر یوں اندھا بھروسہ مت کرو۔ پتا نہیں کیا ہے مگر میری چھٹی حس کہتی ہے یہ ویسا نہیں جیسا دکھتا ہے۔ اس روز جب سے



میں تمہارے گھر سے آئی ہوں تب سے تم سے یہ بات کہنا چاہ رہی ہوں ماہا! کہ اس شخص پر اتنا اعتبار مت کرو۔ اندھا بھروسہ تو کسی بھی بیوی کو اپنے شوہر پر نہیں کرنا چاہئے اور تم...... تم تو خاص طور پر، وہ بندہ جو تمہارے ساتھ امریکن اسٹائل کی زندگی گزار رہا ہے تم اس پر آنکھیں بند کر کے اعتبار مت کرو۔ اپنی ساری کمائی بے دریغ خرچ مت کر دیا کرو۔ اپنا کچھ پیسہ اس سے چھپا کر کہیں محفوظ رکھو، کسی الگ بینک اکاؤنٹ میں شوہر سے چھپا کر رقم جمع رکھنے کا کام کوئی غلط نہیں ایسا تو وہ بیویاں بھی کرتی ہیں جو شوہر ہی کی کمائی پر گزارا کرتی ہیں۔ وہ بھی شوہر ہی کے دیئے پیسوں میں سے شوہر کو خبر دیئے بغیر کچھ نہ کچھ پیسے پس انداز کر کے ضرور رکھتی ہیں۔

مردوں کی قوم پر کبھی بھروسہ نہیں کرنا چاہئے ماہا! یہ محبت کا نام لے کر ہمیشہ عورت کو بے وقوف بناتے ہیں، اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔" کلثوم اس کے قریب آ کر اس کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر رسانیت سے بولی۔

اس نے شدید غصے کے عالم میں کلثوم کے ہاتھ جھٹک دیئے۔ کلثوم سے بہت ناراض اور بے انتہا خفا وہ اس وقت وہاں سے واپسی کے لئے اٹھ گئی مگر کلثوم نے اسے اکیلے واپس جانے نہیں دیا۔

وہ اپنے شوہر کے ساتھ گاڑی میں اسے اس کے اپارٹمنٹ تک چھوڑ کر گئی تھی۔

"دماغ خراب ہو گیا ہے کلثوم کا۔ جو منہ میں آتا ہے بکے جاتی ہے۔ خود کے میاں نے گھرداری کرنے، بچے پالنے اور اپنی ماں کی خدمت کروانے کے لئے اسے گھر پر بٹھا کر رکھا ہے اس لئے اسے جاب کرنے والی ہر شادی شدہ لڑکی معصوم اور اس کا شوہر ظالم نظر آتے ہیں۔ حوی اس روز صحیح تو تبصرہ کر رہا تھا اس کے میاں کے بارے میں۔ ایک سیدھا سادہ MBBS کر کے اپنی گورنمنٹ جاب سے خوش اور مطمئن فیملی کی ٹھیک ٹھاک سپورٹ ہونے کے باوجود نہ اسپیشلائزیشن کیا نہ اپنا کچھ اچھا سا سیٹ اپ بنایا۔ وہی کنویں کے مینڈک۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ بیوی کو بھی گھر بٹھا لیا کہ چلو تم میرے کمائے چند ہزار روپوں میں ہنسی خوشی گزارا کرو۔"

گھر آنے کے بعد تھوڑی دیر وہ کلثوم کی باتوں پر اپنا خون جلاتی رہی۔ پھر اس پر اور اس کی باتوں پر لعنت بھیج کر وہ منہ ہاتھ دھونے اور کپڑے تبدیل کرنے کے بعد کچن میں آ گئی۔ آج دیر ہو گئی تھی اس لئے زیادہ اہتمام کرنے کا وقت نہیں بچا تھا۔ کام کے دوران ہی فون کی گھنٹی بجی۔

"ہو گئی اپنی سہیلی سے ملاقات؟" حمیر کی آواز سنتے ہی اس کے لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

"ہاں...... اب تو مجھے واپس آئے بھی کافی دیر ہو گئی۔ تم کب آ رہے ہو؟" کارڈلیس کندھے کے سہارے کان کے پاس لگائے وہ ہنوز سیب کاٹنے میں مصروف تھی۔

"یہی بتانے کے لئے میں نے فون کیا ہے۔ مجھے دیر ہو جائے گی۔ تم کھانے پر میرا انتظار مت کرنا۔"

"اور جو میں تمہارے لئے اتنی زبردست سوئٹ ڈش تیار کر رہی ہوں، اس کا کیا ہو گا؟"

"میں آ کر کھا لوں گا۔ پلیز یار سمجھا کرو۔ ارسلان صاحب نے ایک کام میرے سپرد کیا ہے۔ تمہیں پتا ہے نا میں انہیں انکار نہیں کر سکتا۔"

"ہاں مجھے پتا ہے اور تمہیں مجھے صفائیاں دینے اور وضاحتیں پیش کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ تم اطمینان سے اپنا کام کرو مگر رات میں بہت زیادہ دیر بھی مت لگا دینا اور گھر واپسی میں احتیاط سے گاڑی ڈرائیو کرنا۔ جب دیر

ہو جاتی ہے پھر تم بہت تیز ڈرائیونگ کرتے ہو۔'' وہ حسب عادت اسے یہ نصیحت کرنا نہیں بھولی۔ ارسلان ایاز نے حمیر کو کوئی دفتری کام سونپا تھا یا ذاتی وہ نہیں جانتی تھی مگر اسے اتنا بہرحال معلوم تھا کہ حمیر ان کے ذاتی نوعیت کے کام بھی اکثر کر دیا کرتا تھا۔ ان کی فیملی امریکہ سے آ رہی ہے، وہ خود تو اسلام آباد میں ہوں گے، اس لئے حمیر ان کی فیملی کو ریسیو کرنے ائیر پورٹ جائے گا یا نہیں اپنے بیٹے کے لئے نیا کمپیوٹر خریدنا ہے اور چونکہ انہیں اس بارے میں کچھ خاص معلومات نہیں، اس لئے حمیر ان کے بیٹے کے لئے کمپیوٹر خرید کر اسے ان کے گھر پہنچوا بھی دے گا۔ ان سے تعلقات اور دوستی اس کے لئے بہت اہم تھی۔

ان کے کانٹیکٹس اور ان کا اثر و رسوخ زبردست تھا۔ حمیر برملا اس سے کہتا تھا کہ یہ دور پبلک ریلیشنگ کا دور ہے۔ آپ صرف اپنی ذہانتوں اور صلاحیتوں کے سہارے وہ سب کچھ نہیں پا سکتے جو ذرا سی پی آر بڑھا لینے سے حاصل کر سکتے ہیں۔

''اسلام آباد میں میرے کوئی چاچے، مامے نہیں بیٹھے اور نہ میرا باپ میرے لئے کوئی مضبوط فیملی بیک گراؤنڈ اور اثاثے چھوڑ کر گیا ہے۔ مجھے اپنے آپ کو خود مضبوط کرنا ہے، اپنی مدد آپ کرنی ہے۔ ہمارا ملک تو وہ ہے کہ نااہل سے نااہل آدمی اسلام آباد میں کسی چاچے، مامے کی مہربانیوں سے اونچی سے اونچی پوسٹ پر براجمان ہو جاتا ہے۔ پھر ہم جو اہلیت بھی رکھتے ہیں، قابلیت اور صلاحیت بھی صرف کسی مضبوط بیک گراؤنڈ کے نہ ہونے کی پاداش میں پیچھے کیوں رہ جائیں؟'' حمیر اکثر اس موضوع پر اس سے اسی طرح کی باتیں کیا کرتا تھا۔ یہ چیز خود اس کے اپنے مزاج کے خلاف تھی مگر اس نے کبھی حمیر سے اس بارے میں بحث نہیں کی تھی۔

اس کے ڈیپارٹمنٹ کے ہیڈ کا بیٹا ہاورڈ سے گریجویشن کر کے آیا۔ ان کے اسٹاف کے تقریباً تمام افراد نے فرداً فرداً انہیں جا کر مبارکباد دی۔ یہاں تک کہ اس کے بعض کولیگز تو ان کے گھر پھول اور مٹھائی تک لے کر پہنچ گئے اور اس سے اتنا بھی نہ ہو سکا کہ ایک رسمی سی مبارکباد ہی انہیں ان کے آفس میں جا کر دے آتی۔ ایک بار تو انہوں نے اسے یہ کہہ کر ٹوک دیا تھا کہ عید پر اس کے سوا ان کے پاس تمام اسٹاف ممبرز کے عید مبارک کہنے کے لئے فون آئے تھے اور وہ پھر بھی خود کو بدل نہ سکی۔

☆☆☆

''تم تھوڑا سا پہلے مجھے بتا دیتے تو مجھے بہت آسانی ہو جاتی حوی!''

''دراصل میرا ارادہ تو پیٹر اور ان کی مسز کو کسی اچھے سے ہوٹل میں ڈنر کے لئے انوائٹ کرنے کا تھا۔ آج جب میں نے انہیں دعوت دی تو انہوں نے بہت خوشی سے قبول کر لی، مگر ساتھ ہی یہ شرط بھی عائد کر دی کہ اگر میں انہیں ڈنر کروانا چاہتا ہوں تو اپنے گھر پر کرواؤں۔ وہ گھر کے بنے ہوئے پاکستانی کھانے کھانا چاہتے ہیں۔ اب تم ہی بتاؤ، میں انہیں انکار کیسے کرتا؟'' امریکہ سے حمیر کے بینک کے ایک سینئر عہدیدار اپنی بیگم کے ساتھ پاکستان آئے ہوئے تھے اور ان ہی کو حمیر نے کل رات اپنے گھر کھانے پر انوائٹ کر لیا تھا۔ یہ بات سن کر وہ اس وجہ سے فکرمند اور پریشان ہو گئی تھی کہ اسے اس دعوت کی اطلاع رات دس بجے کھانا کھاتے ہوئے حمیر نے دی تھی۔ یہ حمیر کے ایک سینئر آفیسر کی دعوت تھی اور اس میں ہر چیز بہت بہتر چاہئے تھی۔ کل اسے آفس جانا تھا اور اب رات کے دس بجے وہ دعوت



کے لئے درکار سامان کہاں خریدنے پہنچتی۔ اس کا ذہن بہت تیز رفتاری سے سوچ بچار میں مصروف تھا۔ وہ کیا کرے اور کس طرح کرے۔

''کیا سوچ رہی ہو ماہا؟ کیا تم مینیج نہیں کر پاؤ گی؟ اگر ایسا ہے تو پھر میں کسی ہوٹل سے کھانا گھر پر منگوا لوں گا۔ اب انہیں گھر پر انوائٹ کر چکا ہوں تو کھانا تو انہیں گھر پر ہی......''

''تم فکر مت کرو، میں سب کچھ کر لوں گی۔ کسی ہوٹل سے کھانا منگوانے کی کوئی ضرورت نہیں۔''

''آر یو شیور؟'' حمیر کے استفسار پر اس نے سر اثبات میں ہلا دیا۔

حمیر کے سو جانے کے بعد اس نے اپنے قریب ٹائم پیس رکھ کر اس میں چار بجے کا الارم لگایا اور خود بھی لیٹ گئی۔ اس کے اعصاب پر دعوت ایسی سوار تھی کہ الارم بجنے سے پہلے ہی پونے چار بجے اس کی آنکھ کھل گئی۔ حمیر بے خبر سو رہا تھا، فریزر میں مرغی، مچھلی اور گائے کا گوشت سب موجود تھا اور پھر دعوت بھی فقط دو ہی افراد کی تھی، اس نے چاروں چولہوں پر ایک ایک کر کے مختلف چیزیں چڑھا دی تھیں۔ سب سے زیادہ احتیاط اسے یہ کرنی پڑ رہی تھی کہ کوئی شور شرابا نہ ہو۔ ہلکے سے کھٹکے سے حمیر کی آنکھ ضرور کھل سکتی تھی۔

آفس جانے کے وقت تک جتنا کچھ وہ کر سکتی تھی، اس نے کر لیا تھا۔ ''پیٹر کو ان کے ہوٹل سے لے کر تو میں ہی آؤں گا۔ میں انہیں نو، ساڑھے نو بجے سے پہلے گھر نہیں لاؤں گا۔ اتنے میں تیاری کا زیادہ موقع مل جائے گا۔'' وہ اس کے اطمینان دلانے پر مسکراتے ہوئے اپارٹمنٹ سے نکل آئی۔

اسے کیا کیا کرنا تھا، یہ سب وہ اب پوری طرح طے کر چکی تھی، اسی لئے جیسے ہی اس کا لنچ ٹائم ہوا، وہ اپنے آفس سے فوراً نکل آئی۔

لنچ ٹائم ختم ہونے میں صرف دو منٹ باقی تھے، جب وہ خوب لدی پھندی اپنے آفس میں داخل ہو رہی تھی۔ فائز کہیں باہر سے لنچ کر کے آ رہا تھا۔ اس نے اسے اتنے ڈھیرے سارے تھیلوں کے ساتھ دیکھا تو اس کے قریب آ کر پرتجسس انداز میں بولا۔

''خیریت تو ہے؟ کیا آج تم ہم سب کولیگز کو کوئی سرپرائز پارٹی دینے والی ہو؟''

''بلی کو خواب میں چھیچھڑے ہی نظر آتے ہیں۔'' فائز نے جواباً اسے گھورتے ہوئے اس کے ہاتھوں سے تھیلے پکڑنے چاہے تو وہ جلدی سے بولی۔

''اٹس او کے فائز! میں اٹھا لوں گی۔''

''دوستوں کو ایک سیکنڈ میں پرایا بنانے میں تمہیں بہت مزا آتا ہے ماہا حمیر رضا!'' اس کے انکار کے باوجود اس نے اس کے ہاتھوں سے شاپنگ بیگز لے لئے۔

''حمیر نے اپنے ایک جاننے والے کو آج دعوت پر بلایا ہے، اسی لئے یہ تھوڑی سی چیزیں خریدنے گئی تھی۔''

وہ لفٹ سے نکل کر اس کے ساتھ اس کے کیبن تک آ گیا تھا۔

''تم اکیلے کہاں سے لنچ کر کے آ رہے ہو؟''

''اکیلا کہاں، وہ محترمہ زارا صاحبہ ہیں نا۔ حالانکہ آج میں اتنا بزی تھا پھر بھی محترمہ نے حکم جاری فرما دیا کہ

میرا پیرا ہٹ میں لنچ کرنے کا موڈ ہے۔ تم لنچ ٹائم میں وہاں پہنچو، میں بھی اپنے کالج سے سیدھی وہیں آجاؤں گی۔ ارے یار! میں کہتا ہوں بندے کو محبت نہیں کرنی چاہئے، نری خواری ہے۔''

وہ سارے شاپنگ بیگز اس کی میز کے قریب زمین پر رکھتے ہوئے جھنجلائے ہوئے انداز میں بولا۔ فائز کے برا مان جانے کے خوف سے اس نے اسے تھینکس نہیں کہا تھا۔

آفس وین دیر سے گھر پہنچاتی، اسی لئے وہ شام میں خود ہی رکشہ سے گھر واپس آگئی اور آتے ہی اس نے اسی پھرتی اور تیز رفتاری سے کام شروع کیا جیسے واقعی کوئی مشین ہو کہ کھانے میں سب کچھ بہترین ہونا چاہئے تھا۔ نو پینتیس پر جب ان کے اپارٹمنٹ کی ڈور بیل بجی تو نہ صرف یہ کہ کھانا پوری طرح تیار تھا بلکہ وہ خود بھی بہترین تراش خراش والا اسٹائلش سا سوٹ پہنے اور ہلکا سا میک اپ کئے تیار تھی۔

خیر مقدمی مسکراہٹ لئے ہوئے دوستانہ انداز کے ساتھ اس نے مہمانوں کا استقبال کیا۔ وہ دونوں میاں بیوی اگر حمیر رضا کی بیوی کی خوش اخلاقی اور مہمان نوازی سے متاثر ہوئے تھے تو اس کا پکایا پاکستانی کھانا بھی انہیں بہت پسند آیا تھا۔ پیٹر کی بیگم کو اس کی بنائی ہوئی کھیر اس قدر پسند آئی تھی کہ بصد اصرار انہوں نے اس سے اس کی ترکیب مانگی۔

''میں امریکہ میں یہ اپنی دوستوں کو بنا کر ضرور کھلاؤں گی۔'' چلتے وقت انہوں نے اس کے پکائے کھانوں کی تعریف کرنے کے بعد یہ بات کہی۔

حمیر انہیں واپس ان کے ہوٹل چھوڑنے چلا گیا تو وہ جلدی سے لباس تبدیل کر کے برتن سمیٹنے میں مصروف ہو گئی۔ بچے ہوئے سارے کھانے فریزر میں پہنچنے کے بعد وہ برتن دھونے لگی۔ مین ڈور کا لاک کھلنے کی اسے آواز آئی تھی۔ اسے پتا تھا کہ یہ حمیر ہے، اسی لئے وہ اپنے کام میں مصروف رہی۔ اندر آنے کے بعد وہ سیدھا کچن ہی میں آیا تھا۔

''تھینکس ماہا!'' وہ اس کے بالکل پیچھے آکر کھڑا ہو گیا اور اس کی گردن میں بازو حمائل کر دیئے۔

''تم بہت تھک گئی ہوگی نا؟''

''اگر کھانا اور باقی سب کچھ تمہارے معیار کے مطابق تھا تو بالکل نہیں تھکی اور اگر کوئی ایک بھی چیز تمہارے معیار سے کم تھی تو واقعی بہت تھک گئی ہوں۔''

''سب کچھ بہت اچھا تھا ماہا! ایک دم پرفیکٹ۔ پیٹر کو گھر پر بلانے سے مجھے بہت فائدہ ہوا ہے۔ ہوٹل میں ہمارے درمیان یہ بے تکلفانہ فضا کبھی پیدا نہ ہو پاتی جیسی گھر پر ہوئی ہے۔ میں ان کے ساتھ جس طرح کے قریبی تعلقات استوار کرنا چاہتا تھا، وہ تمہاری وجہ سے ہو گئے ہیں ماہا! میری ایونز تو تمہاری اور تمہاری ککنگ کی پکی عاشق ہو گئی ہیں۔ ابھی راستے میں مجھ سے تمہاری بہت تعریف کر رہی تھیں۔ پیٹر ایونز اور ان کی بیوی کے ساتھ اس بے تکلفی کا سارا کریڈٹ تمہیں جاتا ہے ماہا!'' وہ اس کے پیچھے سے ہٹ کر اس کے برابر میں آکر کھڑا ہو گیا اور اس کے صابن لگا کر رکھے برتنوں کو دوسرے سنک میں کھنگالنے لگا۔

''ارے تم یہ کیا کرنے لگے؟''

''تمہاری ہیلپ کروا رہا ہوں۔'' اس نے پلیٹ پانی سے دھو کر سائیڈ میں رکھتے ہوئے اسے جواب دیا۔



''مجھے کوئی ہیلپ نہیں چاہئے، تھوڑے سے تو برتن ہیں۔ تم جاؤ، میں بھی بس دس پندرہ منٹ میں کمرے میں آرہی ہوں۔'' اس نے فوراً اسے وہاں سے ہٹا دیا۔

''اچھا پھر جلدی سے آؤ۔ میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔'' اس کے کہنے سے وہ وہاں سے ہٹ گیا اور پھر کچن سے نکلتے ہوئے اسے کمرے میں جلدی آنے کا کہا۔

☆☆☆

حمیر نے نئی گاڑی خریدی تھی۔ اپنی نئی گاڑی میں سب سے پہلے اس نے ماہا ہی کو اپنے ساتھ بٹھایا۔ اپنی نئی گاڑی پر خوش ہونے کے ساتھ ساتھ وہ یہ بھی کہہ رہا تھا کہ یہ گاڑی بھی وہ گاڑی نہیں جو وہ ڈرائیو کرنا چاہتا ہے۔ اس نے مرسڈیز، BMW اور نجانے کن کن مہنگی گاڑیوں کی باتیں کرنا شروع کیں تو وہ بے ساختہ مسکراتے ہوئے اسے ٹوک گئی۔

''حوی! مجھے پتا ہے آسمانوں سے بھی اونچے تمہارے معیار ہیں مگر پلیز کچھ دیر تو اپنی اس خوشی پر پوری طرح خوش ہو لو۔''

وہ جواباً سر اثبات میں ہلا کر ہنسا۔ ''جو حکم جناب کا۔'' ایک گھنٹے کی ڈرائیو کے بعد حمیر نے ایک آئس کریم پارلر کے سامنے گاڑی پارک کر دی۔ اندر آکر ایک میز منتخب کرنے کے بعد وہ اس پر بیٹھی تو اس کی نگاہ اپنی میز کے قریب ایک میز پر بیٹھی پانچ لڑکیوں کے گروپ پر پڑی۔ وہ پانچوں اسے اور حمیر کو بہت غور سے دیکھ رہی تھیں۔

''کیا دیکھ رہی ہو؟'' اسے کن انکھیوں سے ایک میز کی طرف دیکھتے اور مسکراہٹ دباتے دیکھ کر حمیر نے تعجب سے پوچھا۔

''میں ان لڑکیوں کو دیکھ رہی ہوں۔ میرا خیال ہے، تم انہیں بہت ہینڈسم لگ رہے ہو اور مجھے بہت ملامتی نگاہوں سے وہ سب اس طرح دیکھ رہی ہیں جیسے میں اپنے گھر والوں سے چھپ کر تمہارے ساتھ ڈیٹ پر آئی ہوں۔''

حمیر محظوظ ہو جانے والے انداز میں بے اختیار ہنس پڑا۔ ''سچ کہہ رہی ہوں حوی! ان کی نظریں دیکھ کر ایسا ہی لگ رہا ہے جیسے میں تمہارے ساتھ ڈیٹ پر آئی ہوں، پتا نہیں مسئلہ کیا ہے، میں لوگوں کو شادی شدہ کیوں نہیں لگتی؟''

''یہ افسوس کی بات ہے یا خوشی کی کہ تم ابھی بھی کالج گرل نظر آتی ہو؟'' وہ اس پر ستائشی نظریں ڈالتے ہوئے بولا۔

''وہ بات تو صحیح ہے مگر ہر وقت یہ چیز فائدہ مند ثابت نہیں ہو سکتی۔ اب دیکھو، ہمارے جو نئے فنانس ڈائریکٹر آئے ہیں۔ حالانکہ بے چارے بڑے شریف آدمی ہیں مگر کیا کریں کہ انہوں نے آتے ہی از خود یہ فرض کر لیا کہ میں غیر شادی شدہ ہوں۔ دن میں پانچ دفعہ مجھے اپنے آفس میں بلواتے اور ان میں سے تین دفعہ بالکل غیر ضروری، کسی ایسے فضول کام کے لئے جس پر سوچنا ان کی پوسٹ کے شایان شان بھی نہیں تھا۔ مجبوراً مجھے ان کے سامنے تمہارا ذکر کرنا پڑا۔ یہ بتانا پڑا کہ جی میں خیر سے شادی شدہ ہوں۔ مسز واصف کہہ رہی تھیں کہ اس میں ان بے چارے کا کوئی قصور نہیں۔ میں کیل کانٹے سے لیس غیر شادی شدہ نظر آتی ہوں۔''

وہ آئس کریم کا چمچ منہ میں لے جاتے ہوئے بولی۔ وہ جیولری میں فقط تین چیزیں پہنتی تھی جو حمیر نے اسے

تحفے میں دی تھیں اور جو اس نے خود اپنے ہاتھوں سے اسے پہنائی تھیں۔

''میں سوچ رہی ہوں، گولڈ کی دو چوڑیاں خرید کر ہاتھوں میں ڈال لوں۔ شاید اس سے لوگوں کو میں شادی شدہ لگنے لگوں۔''

''پہلی فرصت میں یہ کام کرو بلکہ میں تو کہتا ہوں تھوڑا سا وزن بھی بڑھا لو اور یہ فنانس ڈائریکٹر کا کیا قصہ ہے۔ تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا اس خبیث کے بارے میں؟'' وہ مصنوعی قسم کا غصہ طاری کر کے اس سے بولا پھر اسے ہنستا دیکھ کر خود بھی قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

وہاں سے باہر نکل کر وہ اپنی گاڑی کی طرف آ رہی تھے جب فٹ پاتھ پر اپنی دھن میں مگن چلتے ایک شخص کی نگاہ حمیر پر پڑی۔ وہ چلتا چلتا ٹھٹک کر رک گیا۔ چند سیکنڈ اس نے جیسے اسے پہچاننے میں لگائے اور پھر وہیں سے چلایا۔

''حمیر!'' وہ شخص تیز رفتاری سے بھاگتا سیدھا ان دونوں کے پاس آ کر رکا۔ تیز بھاگنے سے اس کا سانس بری طرح پھول رہا تھا اور اس کے چہرے پر والہانہ خوشی بکھری ہوئی تھی۔ وہ بہت پر جوش طریقے سے حمیر سے بغل گیر ہو گیا تھا۔

''کیسا ہے یار تو، پہچانا نہیں مجھے، میں غلام عباس ہوں۔''

کسی بہت پرانے اور بہت پیارے دوست کے مل جانے کی سچی خوشی اسی کے ہر ہر انداز سے ظاہر ہو رہی تھی مگر حمیر کے چہرے پر کوئی خوشی نظر نہیں آ رہی تھی۔ اپنے گلے سے لگے اس شخص کو اس نے فوراً ہی خود سے دور ہٹایا۔

''میں ٹھیک ہوں۔'' حمیر کا جواب مختصر اور کسی بھی طرح کے جوش و خروش سے عاری تھا۔ اس شخص نے شاید ابھی اس سرد مہری کو محسوس کیا نہیں تھا۔ اس کی نگاہیں ماہا پر پڑیں تو سوالیہ انداز میں حمیر کی طرف دیکھا۔

''میری بیوی ہے۔'' حمیر نے خشک لہجے میں تعارف کروایا۔ اس کی نگاہوں اور لہجے میں سرد مہری اور اجنبیت بڑھتی جا رہی تھی اور وہ اس کے پل پل کی ساتھی تھی، اس کی مزاج آشنا، اس لئے ان نگاہوں کو ایک لمحہ میں محسوس کر چکی تھی۔

''السلام علیکم! بھابی جی!''

''وعلیکم اسلام!'' وہ ہچکچاتے ہوئے بہت ہلکا سا مسکرائی۔

''بڑی خوشی ہو رہی ہے آپ سے مل کر۔ یہ حمیر میرے بچپن کا دوست ہے۔ کبھی اس نے ذکر کیا میرا آپ سے؟ ہم نے پہلی کلاس میں ایک ساتھ داخلہ لیا تھا۔ پہلی سے آٹھویں تک ہم نے ایک ساتھ پڑھا۔ ہمارے اسکول میں بنچیں ونچیں بالکل نہیں تھیں۔ ہم زمین پر بیٹھتے تھے، میں اور حمیر ہمیشہ برابر بیٹھتے تھے۔ یاد ہیں تمہیں حمیر؟'' وہ پہلے اس سے اور پھر حمیر سے مخاطب ہوا۔ حمیر اسے جواب دینے کے بجائے جیب سے گاڑی کی چابی نکالنے لگا۔

''بڑا پڑھاکو تھا یہ۔ اپنے گھر پر پڑھنے کی جگہ نہیں ملتی تو میرے ساتھ میرے ابا کی دکان پر آ جاتا۔ میرے ابا کی کتابوں کی دکان تھی ناں، ابا دکان ہمارے حوالے کر کے شام میں گھر چلے جاتے۔ میں دکان پر آنے والے خریداروں کو نمٹاتا اور یہ دکان کے بالکل اندر کونے والی جگہ پہ بیٹھ کر پڑھائیاں کرتا رہتا۔ ہم رات دیر تک وہیں رہتے۔ ساتھ کھانا کھاتے اور کبھی کبھار تو ساری رات وہیں گزار دیتے۔ کیا وقت تھا وہ بھی۔'' اسے لگا کہ حمیر اس شخص سے فوراً پیچھا چھڑا کر کسی بھی طرح وہاں سے گاڑی تک پہنچنا چاہتا تھا۔



اس کے قدم اٹھنے کے لئے بالکل تیار تھے اور زبان پر شاید کوئی بداخلاقی اور بے مروتی سے بھرپور جملہ آنے ہی والا تھا۔ وہ حمیر کے کچھ کہنے سے پہلے بے ساختہ بولی۔

''آپ کیا کرتے ہیں غلام عباس بھائی؟'' حمیر کی غصہ بھری نگاہیں وہ نظر انداز کر گئی۔ وہ سادہ و مخلص سا شخص اسے اس سلوک کا حقدار قطعاً نہیں لگ رہا تھا، جو حمیر اس کے ساتھ کر رہا تھا اور جسے وہ اپنی خوشی اور جوش اور اپنی سادگی میں سمجھ نہیں پا رہا تھا۔

''ہم نے کیا کرنا ہے بھابی جی! گھر کے حالات ایسے تھے کہ آٹھویں سے آگے پڑھ ہی نہ سکا۔ بس ابا کی دکان سنبھال لی۔ ابا کی کرائے کی دکان تھی۔ میں نے اسے خرید لیا۔ بس جی بڑا کرم ہے مولا کا، بڑا اچھا گزارا ہو رہا ہے اور حمیر! تو کیا کر رہا ہے یار آج کل؟ پرانے محلے سے کیا گیا، اپنے پرانے دوست کو بھی بھول گیا۔''

''ماہا! میں گاڑی میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔'' حمیر، غلام عباس کو جواب دیئے بغیر ماہا سے کرخت لہجے میں آنے کا کہہ کر گاڑی کی طرف چلا گیا۔ وہ اپنے جوش و خروش اور خوشی سے نکل کر حیرت اور بے یقینی سے گاڑی میں بیٹھ جانے والے اپنے پرانے دوست کو دیکھ رہا تھا۔ وہ اس کم تعلیم یافتہ و سادہ سے انسان کی آنکھوں میں پھیلتے دکھ کو دیکھ نہیں سکتی تھی، اس لئے ان کی طرف نگاہیں ڈالے بغیر آہستگی سے بولی۔

''اصل میں حمیر ابھی جلدی میں ہیں، ہمیں کہیں بہت ضروری پہنچنا ہے۔ آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی ہے غلام عباس بھائی! اللہ حافظ۔'' اسے اس شخص سے ایسی ندامت محسوس ہو رہی تھی کہ اس کی طرف دیکھے بغیر یہ جملے کہہ کر تیزی سے اپنی گاڑی کے پاس آ گئی۔

دل پر ایسا بوجھ پڑا تھا جیسے حمیر نے نہیں، خود اسی نے اس شخص کی تحقیر کی ہے۔ حمیر لب بھینچے غصے سے گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا۔ اس کے چہرے پر کرختگی اور غصے کے سوا کوئی تاثر نہیں تھا۔

''حمی! اس نے حمیر کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ حمیر نے اس کے ہاتھ کو بہت غصے سے جھٹک دیا۔ ''وہ بے چارہ اتنے خلوص سے بات کر رہا تھا حمی! وہ ہم سے کیا مانگ رہا تھا؟''

''جس سے میں بات کرنا پسند نہیں کر رہا تھا، اس پر خلوص نچھاور کرنے کا تمہیں کیوں شوق ہو رہا تھا؟ ایسے ٹکے ٹکے کے لوگوں سے میری بیوی اخلاق بگھارے، ہونہہ۔ تمہیں کیا نظر نہیں آ رہا تھا کہ میں اس سے ملنا نہیں چاہتا۔'' وہ بہت ناراضی سے تیز آواز میں بولا۔

''اچھا آئم سوری۔ واقعی مجھ سے غلطی ہوئی۔ تم پلیز اپنا موڈ تو مت خراب کرو۔'' اس کا انداز مکمل طور پر معذرت خواہانہ اور صلح جوئی والا تھا۔ وہ اپنے جس فعل پر ذرہ برابر بھی شرمندہ نہیں تھی، اس پر سارا راستہ اس سے معافی مانگتی رہی۔ اسے منا لینے والی مسلسل کوششوں اور تسلسل سے معافی مانگتے رہنے سے یہ ہوا تھا کہ اپنے بیڈ روم میں آ کر بستر پر لیٹنے کے بعد وہ اس سے منہ پھیر کر کروٹ بدل کر نہیں لیٹا تھا۔ جب اس کے برابر لیٹنے سے پہلے اس نے اس کا ہاتھ سیدھا کیا اور پھر پورے استحقاق کے ساتھ اس پر سر رکھ کر لیٹ گئی تو اس نے نہ اپنا ہاتھ ہٹانے کی کوشش کی اور نہ اسے دور ہٹایا۔

"مجھ سے ناراض ہو کر سوؤ گے تو تمہیں نیند آ جائے گی؟" اس کی ناراضی میں قدرے کمی ہوتی دیکھ کر اس کے اوسان بحال ہوئے تھے۔ حمیر کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ ابھرتی دیکھ کر سکھ کا سانس لیتے اس نے خود سے ہزار دفعہ کیا وعدہ ایک مرتبہ پھر کیا۔

☆☆☆

اپنی ترقی کی خبر پر وہ بہت خوش تھی اور اس رات وہ حمیر کے ساتھ خوشی خوشی اپنی ترقی ہی کو ڈسکس کیے جا رہی تھی۔ اب اس کی تنخواہ میں کتنا اضافہ ہو جائے گا۔ دیگر کیا کیا مراعات اسے مزید ملنے لگیں گی مگر وہ اس کی باتوں میں اس طرح دلچسپی نہیں لے رہا تھا جیسی کہ عموماً لیا کرتا تھا۔ وہ ایک دو دن سے ہی ماہا کو کچھ چپ چپ سا اور الجھا ہوا لگ رہا تھا۔

"کیا بات ہے حومی! تم مجھے پرسوں شام سے ہی خاموش اور الجھے ہوئے لگ رہے ہو۔"

"کچھ نہیں ہوا۔ خوامخواہ تمہیں وہم ہو رہا ہے۔"

"وہم؟ اچھا تم مجھے یہ بتاؤ، ابھی میں تم سے کیا کہہ رہی تھی؟"

"تم اپنے پروموشن کی بات کر رہی تھیں۔"

"جی نہیں، وہ بات تو میں ختم بھی کر چکی تھی۔ میں تو اب یہ بات کر رہی تھی کہ آج ہمیں کوئی اچھی سی موودی دیکھنی چاہیے۔ کل چھٹی بھی ہے اور پھر ہمیں ایک ساتھ فلم دیکھے بہت دن بھی ہو گئے ہیں۔"

"آج نہیں ماہا! آج مجھے بہت نیند آ رہی ہے۔" اسے حمیر کے لہجے میں غیر معمولی پن محسوس ہوا۔

"حومی کیا ہوا ہے؟ تم مجھے تو بتاؤ۔ اگر کسی وجہ سے پریشان ہو تو پلیز مجھ سے شیئر کرو۔" وہ اس کی ٹھوڑی پر ہاتھ رکھ کر اس کا چہرہ اپنی طرف کرتے ہوئے بہت محبت سے بولی۔

"میں کہہ تو رہا ہوں کچھ نہیں ہوا، بلاوجہ لٹھ لے کر ایک ہی بات کے پیچھے مت پڑ جایا کرو۔" جھڑک دینے والے انداز میں اس سے کہتے ہوئے اس کے ہاتھ کو بھی اپنے چہرے پر سے ہٹا دیا، پھر تکیہ پر سر رکھ کر لیٹتے ہوئے تنبیہی لہجے میں اس سے بولا۔

"اب میں سونا چاہتا ہوں۔ پلیز مجھے ڈسٹرب مت کرنا۔" اس نے کروٹ بدل لی۔

صبح وہ اپنے نارمل موڈ میں اس کے ساتھ باتیں کر رہا تھا۔ اپنے رات کے رویے پر نہ اس نے ماہا سے سوری کہا اور نہ اس نے اُسے کچھ جتایا۔

دیر سے سو کر اٹھنے اور چھٹی والے دن کا خوب شاندار اہتمام والا ناشتہ کرنے کے بعد وہ اپنے چھٹی والے دن کے مخصوص کاموں میں مصروف ہو گئی۔ ایک طرف واشنگ مشین لگی ہوئی تھی، دوسری طرف کچن میں سارے چولہوں پر کچھ نہ کچھ چڑھا ہوا تھا اور تیسرا کام ہاتھ کے ہاتھ اس نے حمیر کے جوتوں کی پالش کرنے کا شروع کیا ہوا تھا۔ چھٹی والے دن فرصت سے یہ کام کر لو تو روز بس ایک ہلکا سا برش پھیرنا ہی کافی ہو جایا کرتا تھا۔

وہ باتھ روم میں کھڑا شیو بنا رہا تھا اور باتھ روم کا دروازہ چونکہ کھلا تھا، اس لیے اس سے باتیں بھی کر رہا تھا۔ گاہے گاہے اس پر نگاہ ڈال کر اسے یہ کہہ کر چھیڑ بھی رہا تھا کہ وہ اگر چاہتی تو بہت اچھی جوتے پالش کرنے والی بھی بن



سکتی تھی۔ سائیڈ ٹیبل پر رکھے حمیر کے موبائل کی بیل بجی تھی۔

"ماہا! دیکھنا کون ہے۔ اگر کوئی خاص فون ہو تو میری بات کروا دینا، ورنہ میسج لے لینا۔"

وہ سر اثبات میں ہلاتے ہوئے اٹھی اور بیڈ کے پاس آ کر موبائل اٹھایا۔

"ہیلو!"

"مجھے حمیر رضا سے بات کرنی ہے۔" اپنے ہیلو کے جواب میں اس نے ایک خوبصورت زنانہ آواز سنی۔

"آپ کون بول رہی ہیں۔"

"سدرہ آفاق۔" وہ اس نام کی کسی خاتون کو جانتی نہیں تھی، اس لیے ایک پل کو فون کے خاص یا عام ہونے کے بارے میں سوچا پھر کچھ سوچ کر حمیر کے پاس آ گئی۔

"کس کا ہے؟" حمیر نے بے آواز پوچھا۔

"کوئی سدرہ آفاق ہیں۔" اس نے بھی آہستہ ہی سے جواب دیا۔ حمیر نے اس کے ہاتھ سے موبائل لے لیا تو وہ باتھ روم سے باہر آ گئی اور دوبارہ اپنے کام میں منہمک ہو گئی۔ حمیر کی گفتگو کی نہ اسے آواز آ رہی تھی اور نہ اس نے قصداً سننے کی کوئی کوشش کی تھی۔

"یہ سدرہ آفاق کون ہے؟ پہلے کبھی نام نہیں سنا اس کا ہے؟" حمیر دوپہر میں اسی وقت شیو کرنے اور نہانے کے فوراً بعد اس سے کسی ضروری کام کا کہہ کر گھر سے چلا گیا تھا اور پھر اب رات کے کھانے سے کچھ پہلے اس کی واپسی ہوئی تھی۔

کھانا کھانے کے دوران وہ یونہی عام سے لہجے میں حمیر سے اس فون والی لڑکی کے متعلق پوچھ بیٹھی۔ بغیر کسی خاص تجسس کے۔

"کولیگ ہے میری، مہینہ بھر پہلے جوائن کیا ہے۔ ہاورڈ سے ماسٹرز کر کے آئی ہے۔ ہو گئی تسلی؟" وہ چاولوں کی ڈش زور سے پٹخ کر غصے سے بولا۔

"حومی!" اس نے حیرت سے اس کے غصے سے بھرے چہرے کو دیکھا۔

"کیا یہ ضروری ہے کہ میں اپنے ہر جاننے والے کی تفصیلات تمہاری خدمت میں پیش کیا کروں؟" اسے پتا نہیں کیوں اتنا غصہ آ گیا تھا۔ اس نے اپنے سامنے رکھی پلیٹ بھی غصے سے دور ہٹا دی تھی۔

"حومی! کیا ہو گیا ہے، میں نے ایسا تو کچھ بھی نہیں کہا۔ تم خفا کیوں ہو رہے ہو؟"

"دماغ خراب ہو گیا ہے میرا، پاگل ہو گیا ہوں۔" وہ کھانا چھوڑ کر میز پر سے اٹھا اور پھر کرسی کو ٹھوکر مارتے ہوئے دروازہ کھول کر بالکونی میں چلا گیا۔

"تمہیں میری کیا بات بری لگی ہے حومی! میں نے تو یونہی پوچھ لیا تھا۔ تم اتنی سی بات پر ناراض ہو رہے ہو۔ میں نے ایسی تو کوئی بات نہیں کی جو......" وہ اس کے پیچھے بالکونی میں آ گئی۔ حیران پریشان سی۔

"تم نے کچھ نہیں کہا مگر تمہیں بلاوجہ میرے سر پر سوار رہنے کی عادت ہو گئی ہے۔ میں کہاں جاتا ہوں، کس سے ملتا ہوں، کس سے بات کرتا ہوں۔ جب تک تم یہ سب پوچھ نہ لو، تمہیں اطمینان نہیں ہوتا۔"

وہ پتا نہیں کیوں ایک معمولی اور بلاوجہ کی بات کو ایشو بنا کر جھگڑا کرنا چاہ رہا تھا، لیکن اس نے بغیر کسی غلطی کے معافی مانگ لی اور پھر اس نے اسے منا کر ہی دم لیا۔ اسے منا کر وہ واپس کھانے کی میز پر لے آئی تھی۔

مگر یہ صرف اس ایک روز کا قصہ نہیں تھا، وہ نجانے کیوں بات بے بات اس سے الجھنے لگا تھا۔ اس کے خلاف مزاج تو ماہا نے کبھی کچھ نہیں کیا تھا، اب تو وہ مزید احتیاط برتنے لگی تھی مگر وہ پھر بھی چھوٹی چھوٹی باتوں پر چڑچڑے پن کا مظاہرہ کرنے لگا تھا۔ وہ اس کے ان الجھے رویوں کا سبب نہیں جانتی تھی مگر یہ الجھے رویے اسے پریشان بہت کر رہے تھے۔ اگلے پندرہ بیس روز تک حمیر کا مزاج یونہی چڑچڑا اور بدمزاجی سے بھرپور رہا پھر خود بخود ہی اس کے مزاج میں تبدیلی پیدا ہو گئی۔ وہ اس کے ساتھ نارمل طرح بی ہیو کرنے لگا۔ اس نارمل انداز میں بھی کچھ نہ کچھ ابنارمل تو ضرور تھا۔ کچھ ایسا جسے وہ صرف محسوس کرتی تھی، کوئی نام نہیں دے سکتی تھی۔ وہ صرف اس کے قدموں کی آہٹ سے مڑ کر دیکھے بغیر اس کا آنا محسوس کر سکتی تھی تو اس کی آنکھوں میں جھانکتی بیزاری کیوں نہیں پڑھ سکتی تھی۔ وہ بازو اب بھی ہر رات اس کے گرد حلقہ کیے ہوتے تھے، مگر ان میں محبت کی گرمی نہیں بلکہ برف کی سی ٹھنڈک ہوتی تھی۔

بظاہر دیکھنے میں ایسا کچھ تھا ہی نہیں جو غلط لگتا تھا ماہا کا دل خوش نہیں تھا۔ اداسی کی یہ کیفیت پچھلے کئی دنوں سے اس کے ساتھ تھی۔ وہ جس راستے سے، جس طرف سے اس کے دل میں چھپی سوچوں کو جاننے کے لئے اس کے قریب جانے کی کوشش کرتی، وہ وہیں ایک ان دیکھی دیوار کھڑی کر دیتا۔ بظاہر ہنستا، مسکراتا جیسے سب کچھ سو فیصد ٹھیک ہے۔

☆☆☆

چھٹی کا دن تھا اور حمیر اخبار اپنے سامنے پھیلائے بیٹھا تھا۔ سامنے ٹی وی بھی چل رہا تھا مگر جتنی دفعہ بھی وہ کمرے میں گئی، اس نے یہی دیکھا کہ وہ نہ اخبار پڑھ رہا ہے، نہ ٹی وی دیکھ رہا ہے اور نہ ہی اسے اس کے آنے اور جانے کی کوئی خبر ہے۔ اس نے کمرے میں ویکیوم کلینر چلایا، ڈسٹنگ کی اور وہ اس کی آمد سے بے نیاز اپنی کسی سوچ میں الجھا رہا۔ وہ کسی بہت گہری سوچ میں گم تھا۔ جو کام ہو گئے تھے، سو ہو گئے تھے اور جو رہ گئے تھے، انہیں ادھورا ہی چھوڑ کر وہ کمرے میں آ گئی۔

کیا بات ہے، تم چپ کیوں ہو، کوئی پریشانی ہے؟"

اس کے ان سوالوں پر وہ خفا ہوتا تھا، اس لئے اس نے ان میں سے کوئی بھی بات نہیں کی۔ وہ بس کسی بھی طرح ان کے بیچ حائل ہوتی اس ان دیکھی دیوار کو گرا دینا چاہتی تھی۔

"تمہارے بال کیسے روکھے روکھے سے ہو رہے ہیں حوی! اتنے خشک اور بے جان ہے۔ چلو میں تمہارے سر میں تیل کی مالش کر دوں۔" اس کے سر کو سہلاتے ہوئے کہا۔ حمیر خاموش بیٹھا رہا، اس نے اس سے کچھ بھی نہیں کہا۔ وہ ڈریسنگ ٹیبل سے تیل کی شیشی اٹھا کر لے آئی اور بیڈ پر اس کے پیچھے بیٹھ کر اس کے سر میں تیل ڈالنے لگی۔

"اب فوراً جا کر شیمپو مت کر لینا کہ "مجھ سے تیل کی بو برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ دو گھنٹے تک تیل لگا رہنے دینا سر میں۔"

"ماہا! مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔" وہ آہستہ آواز میں بڑی سنجیدگی سے بولا۔

"ہاں بولو نا حوی!"



"پہلے تم اپنا کام کر لو۔" اس نے اپنے سامنے پھیلے سارے اخبار سمیٹ کر ایک طرف رکھ دیئے اور ریموٹ سے ٹی وی بھی آف کر دیا۔ اب کمرے میں سوائے خاموشی کے کچھ نہیں تھا۔ تیل کی مالش کرتے اس کے ہاتھوں کی رفتار سست پڑنے لگی، ان میں خود بخود ہی کپکپاہٹ بھی پیدا ہو گئی۔ وہ اتنی سنجیدگی سے اس سے کیا کہنے والا تھا۔ تیل لگوانے والا یہ کام اس نے کبھی ماہا سے خاموشی سے نہیں کروایا تھا، آج اتنی خاموشی سے بغیر کسی بحث کے کروا رہا تھا۔ اس کے بالوں میں گردش کرتی اس کی انگلیاں ٹھہر گئی تھیں۔ اس نے تیل کی شیشی بند کی اور اس کے برابر میں بیٹھ گئی۔ وہ پوری توجہ سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"ماہا! جو بات میں تم سے کہنے والا ہوں، مجھے پتا ہے اس سے تم بہت ہرٹ ہو گی، تمہیں بہت دکھ ہو گا مگر میں کیا کروں، میرے پاس اور کوئی راستہ نہیں۔" وہ اس کے تیل لگے ہاتھوں ہی کو اپنے ہاتھوں میں لے کر رسانیت سے بولا۔

"حوی! کیا بات ہے؟" اس کے چہرے کی سنجیدگی اس کا دل دہلا رہی تھی۔ تیز تیز دھڑکتا اپنا دل اسے خود اپنے قابو سے باہر جاتا محسوس ہو رہا تھا۔

"میں شادی کر رہا ہوں ماہا!" اس نے حمیر کو یوں دیکھا جیسے وہ کسی ایسی زبان میں بات کر رہا تھا جسے وہ سمجھ نہیں سکتی تھی۔

"ماہا! میں شادی کر رہا ہوں سدرہ آفاق کے ساتھ۔" اس نے اپنی بات دہرائی۔

اس نے اس بار بھی کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا اور گم صم سے انداز میں اسے دیکھتی رہی تو وہ مزید بولا۔

"میں اس اتوار کو سدرہ کے ساتھ شادی کر رہا ہوں ماہا! تم سن رہی ہو میری بات؟" اس کی سکتے کی سی کیفیت اور بے تاثر آنکھوں کو دیکھ کر اس نے ذرا زور سے ایک بار پھر وہی بات دہرائی اور وہ کوئی ردعمل کیسے ظاہر کرتی جبکہ اس کی کوئی بات وہ سمجھ ہی نہیں پا رہی تھی۔

اس کی سکتے کی سی کیفیت اور بے تاثر آنکھوں کو دیکھ کر اس نے ذرا زور سے ایک بار پھر وہی بات دہرائی۔ اس نے اپنی آنکھیں زور سے بھینچ کر بند کیں پھر انہیں دوبارہ کھولا، مگر نہ اس کے سن ہوئے اعصاب بیدار ہو پائے اور نہ اس کے کان وہ سن پائے جو وہ سننا چاہتی تھی۔

"آئی لو یو ماہا۔"

"تم میرے لئے بہت قیمتی ہو۔"

"ماہا! تم میری زندگی کا سب سے خوبصورت احساس ہو۔"

میں جانتا ہوں، تمہیں اس بات سے بہت تکلیف ہو رہی ہے۔ تم بہت اچھی ہو ماہا۔ بلکہ میں تو یہاں تک بھی کہنے کے لئے تیار ہوں کہ تم میری زندگی میں آنے والی سب سے اچھی لڑکی ہو۔ مگر اپنی اس خوبی کے باوجود تم میری منزل نہیں۔ جو زندگی میں تمہارے ساتھ جی رہا ہوں یہ وہ زندگی نہیں جس کے میں نے خواب دیکھے تھے۔ میری منزل سدرہ آفاق ہے، میں نے تم سے کبھی غلط بیانی نہیں کی اب بھی سب کچھ سچ تمہیں بتا رہا ہوں۔ وہ مجھ سے بہت متاثر ہے، اسے لگتا ہے کہ اس کے فارن کوالیفائیڈ کزنز اور دوستوں میں وہ بات نہیں جو مجھ میں ہے۔ وہ جانتی ہے میں شادی شدہ ہوں اور وہ پھر بھی مجھ سے شادی کرنا چاہتی ہے۔ تم نہیں جانتی ہو گی کہ وہ کس کی بیٹی ہے۔ کتنے بڑے بینکر ہیں اس

کے ڈیڈی۔ دنیا کے بہترین بینکس اور بڑے بڑے اداروں میں سے کئی میں کام کرنے کا ان کے پاس وسیع تجربہ ہے۔

اس وقت وہ نیویارک میں کس بینک میں کام کر رہے ہیں اور کس پوسٹ پر کر رہے ہیں، میں یہ تمہیں بتاؤں تو تمہاری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جائیں گی۔ نیویارک، لندن، پیرس، روم کہاں کہاں پہ تو ان کے شاندار گھر ہیں۔ اتنی اونچی اونچی پوسٹوں پر کام کیا ہے تو نام اور شہرت کے ساتھ ساتھ خوب پیسہ بھی بنایا ہے۔

دنیا بھر کے بڑے بڑے بینکرز اور اقتصادیات کے ماہرین سے ان کے کانٹیکٹس ہیں۔ صرف پاکستان میں نہیں وہ دوسرے ممالک میں بھی کافی اثر و رسوخ رکھتے ہیں۔

یوں میں ان سے کبھی ملا ہوتا تو وہ مجھے ایک معمولی سا بینکر سمجھ کر شاید مجھ سے بات تک کرنا پسند نہیں کرتے مگر اب چونکہ ان کی اکلوتی بیٹی مجھ سے شادی کرنے کی خواہش مند ہے اس لئے تم اندازہ نہیں لگا سکتیں کہ وہ مجھ سے کس طرح ملتے ہیں۔ کس طرح میرے کیریئر کی فکر کرتے ہیں۔ میری ذہانت اور قابلیت کو کس درجہ قدر کی نگاہ سے دیکھتے اور یہ کہتے ہیں کہ ابھی مجھے بہت آگے جانا ہے۔ آگے میں بے شک اپنی قابلیت ہی کی بنیاد پر جاؤں گا مگر مجھے آگے بڑھنے میں مدد دینے والے، میرے لئے نئی راہیں کھولنے والے وہی ہوں گے۔ ڈیفنس میں اپنے جس تصوراتی عالیشان گھر کی ہم تم باتیں کیا کرتے تھے اور جو پتا نہیں کبھی ہم دونوں مل کر بنا بھی پاتے یا نہیں ڈیفنس کے اسی فیز میں ویسا گھر بلکہ اس سے بھی زیادہ شاندار ایک گھر انہوں نے سدرہ کے نام کر رکھا ہے۔ ان کے اثر و رسوخ، ان کے پاورز تم سوچ بھی نہیں سکتیں ماہا! اب تم خود بتاؤ میں کیا کروں؟ میرا کیریئر میرے لئے کتنا اہم ہے تم جانتی ہو میں ایک کامیاب نہیں کامیاب ترین انسان بننا چاہتا ہوں اور اس کے لئے مجھے سدرہ کا ہاتھ تھامنا ہی ہوگا۔"

اس کا لہجہ بہت نرم اور بڑا شیریں تھا۔ اس کی نگاہوں میں بھی پیار اور نرمی تھی۔ قتل کرنے کا یہ ایک نیا انداز تھا۔

وہ ابھی بھی پتھرائی ہوئی آنکھوں اور منجمد احساسات کے ساتھ یک ٹک اسے دیکھے جا رہی تھی۔ اس کے منہ سے کوئی بھی لفظ نہیں نکلا تھا اور نہ ہی ساکت بیٹھے اس کے وجود میں کوئی جنبش ہوئی تھی۔ وہ کسی مجسمے کی طرح ساکت و جامد تھی۔

"میں کل یہاں سے شفٹ ہو رہا ہوں ماہا! اتوار کو ہماری شادی ہے، بیچ کے یہ چھ دن میں کسی ہوٹل میں گزار لوں گا۔ میں ایسا صرف تمہاری وجہ سے کر رہا ہوں اگر اگلے اتوار کے دن یہاں سے گیا تو تمہیں یہ سوچ کر زیادہ دکھ ہوگا کہ میں چند گھنٹوں بعد شادی کر لینے والا ہوں۔"

"ہماری شادی؟"

ہماری؟ یہ کون تھی جو اس کے شوہر کے ساتھ مل کر ایک "ہم" بنا رہی تھی۔ وہ اس کے پاس سے اٹھا اور پھر بیڈ کے بائیں جانب کی الماری کھول کر اس میں سے اس نے اپنا سوٹ کیس نکالا۔ اس کا سکتہ جیسے ایک دم ہی ٹوٹا تھا۔ وہ تیزی سے اٹھ کر اس کے قریب آئی۔

"حومی! یہ سب جو ابھی تم نے کہا۔ یہ شادی، یہ سدرہ آفاق۔ یہ سب جھوٹ ہے ناں؟ یونہی تم مجھے تنگ کر رہے ہو ناں؟ وہ اس کے کندھوں کو جھنجھوڑ کر اس انداز سے بولی جیسے وہ ابھی ہنستے ہوئے یہ کہہ ہی دے گا کہ "ہاں میں مذاق کر رہا تھا۔"



"کہو حومی! کہ یہ جھوٹ ہے۔ تم مذاق کر رہے ہو۔" وہ ہذیانی انداز میں چلائی۔

"یہ جھوٹ نہیں ہے ماہا! میں اور سدرہ شادی کر رہے ہیں۔"

آہستہ آواز اور نرم لہجے میں بولا۔

"تم ایسا کس طرح کر سکتے ہو۔ میں مان ہی نہیں سکتی۔" "تم کسی سدرہ سے کیسے شادی کر سکتے ہو؟ تم مجھ سے محبت کرتے ہو اتنی دفعہ تم نے یہ بات مجھے بتائی ہے اور ابھی، ابھی ہماری ویڈنگ اینورسری پر، تب تم نے مجھ سے یہی کہا تھا۔ صرف سات مہینے تو گزرے ہیں اس دن کو، بولو کہا تھا ناں تم نے اس رات کہ تم مجھ سے محبت کرتے ہو۔" وہ روتے ہوئے یوں چلا رہی تھی جیسے اپنے حواسوں ہی میں نہ ہو۔

"ہاں میں تم سے محبت کرتا ہوں، لیکن ماہا۔"

"ہم ایک دوسرے سے اتنی بے تحاشا..... محبت کرتے ہیں۔ ہمارے درمیان کوئی تیسرا کیسے آ سکتا ہے۔ ہمارے درمیان کوئی سدرہ آفاق کبھی بھی نہیں آ سکتی۔"

اس نے حمیر کو "لیکن ماہا" سے آگے کچھ بولنے ہی نہیں دیا۔ اس لئے بس اس کا یہ کہہ دینا کافی تھا کہ وہ اس سے محبت کرتا ہے وہ اس کے سینے پر سر رکھ کر زار و قطار رونے لگی تھی۔

"پھر سے ایسا مذاق مت کرنا حومی! تمہارے لئے یہ مذاق ہوگا مگر مجھے ایسا لگا جیسے کوئی مجھے پھانسی کے تختے پر کھینچ کر لے جا رہا ہو۔ میں تم سے اتنی محبت کرتی ہوں، میں تمہارے بغیر زندہ رہ ہی نہیں سکتی۔"

"میں تم سے محبت کرتا ہوں ماہا، مگر صرف محبت میرے لئے کافی نہیں۔ محبت سے بڑھ کر میرے لئے زندگی میں اور بہت کچھ ہے۔ یہ فیصلہ کوئی آسان فیصلہ نہیں تھا۔ بہت دکھ کے ساتھ میں نے یہ فیصلہ کیا ہے۔ مجھے تمہاری فکر تھی، تمہارا خیال تھا، پورے دو مہینے میں اسی الجھن میں مبتلا رہا کہ کیا کروں۔ میں اپنے خوابوں کی قربانی دے کر فقط محبت کے سہارے زندگی نہیں گزار سکتا۔ محبت بہت کچھ ہے، مگر محبت سب کچھ نہیں۔ میرے سب خوابوں کی تعبیریں مجھ سے چند قدموں کے فاصلے پر ہیں اور میں انہیں نظر انداز نہیں کر سکتا۔" وہ اتنی دیر سے مسلسل جس نرمی و اپنائیت سے بات کر رہا تھا، ابھی بھی اس کا لہجہ ویسا ہی تھا۔

اپنے سینے پر سر رکھ کر روتی اس لڑکی کو اس نے دھکیل کر دور نہیں ہٹایا تھا، ہاں مگر ہمیشہ کی طرح اپنے بازوؤں کے حلقے میں بھی نہیں لیا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ ان قمیضوں کو پکڑے ہوئے تھے جنہیں وہ ماہا کے قریب آنے سے پہلے بیڈ پر ڈالنا چاہتا تھا۔

ڈھائی سال کا ساتھ تھا، اتنا حق تو رکھتی تھی وہ لڑکی کہ اسے دھتکارا بڑی عزت کے ساتھ جائے۔

"ہم ایک دوسرے کے ساتھ اتنے خوش ہیں حومی! ہر طرح سے آئیڈیل زندگی، آئیڈیل گھر، ہم میں تو کبھی کوئی لڑائی جھگڑا بھی نہیں ہوا۔" وہ ابھی تک بھی بے یقینی سے یقین کی طرف نہیں آ پائی تھی۔

"میں خوش نہیں تھا ماہا! یہ زندگی کبھی بھی میرا خواب نہیں تھی گن گن کر پیسے خرچ کرنا اور مہینوں کی بچت کے بعد اپنی مرضی کی کوئی چیز لے سکنا۔"

"وہ ہے" اور "ہیں" کہہ رہی تھی اور وہ "تھا" اور "تھی" وہ اس کے پاس کھڑے ہوئے ہی اسے اپنے ماضی کا حصہ

قرار دے رہا تھا۔ جس شخص کی محبت میں اس نے اپنی ہستی منا دی تھی، جسے خوش رکھنے کے لئے اپنے وجود کو فراموش کر چکی تھی، وہ کہہ رہا تھا کہ وہ اس کے ساتھ خوش نہیں۔ جس عورت کا شوہر یہ کہہ دے کہ وہ اس کے ساتھ خوش نہیں، اس سے بڑھ کر ہاری ہوئی عورت اور کون ہوگی۔

اس نے حمیز کے سینے رکھا اپنا سر اوپر اٹھایا اور آنسو برساتی آنکھوں سے بے یقینی کے ساتھ اس کی طرف دیکھا۔ جو اس کی زبان نے کہا تھا وہی اس کی آنکھوں میں بھی لکھا تھا۔

وہ آہستہ آہستہ اسکے پاس سے دور ہٹی تو وہ پُرسکون سا ہوتا دوبارہ اپنے کپڑے الماری سے نکالنے لگا۔ وہ دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑی یک ٹک اسے دیکھے جا رہی تھی۔ اپنے سارے کپڑے باہر نکالنے کے بعد اس نے اپنا دوسرا سامان اکٹھا کرنا شروع کر دیا تھا۔

وہ نہانے چلا گیا۔ نہا کر آنے کے بعد وہ اس کی طرف دیکھے بغیر سارا سامان لا لا کر ڈھیر کرنے کے بعد پتا نہیں کہاں چلا گیا۔ اس نے مین دروازہ کھلنے اور پھر بند ہونے کی آواز ضرور سنی تھی۔ کافی دیر بعد واپس آیا۔

''حمی! پلیز میرے ساتھ ایسا مت کرو۔ پلیز تم جیسا کہو گے میں ویسا کروں گی۔ میرا پروموشن تو ویسے ہی ہو گیا ہے۔ میری سیلری بڑھی ہے تمہیں پتا ہے ناں۔ پھر میں شام میں کوئی اور جاب بھی کر لوں گی اور، اور سنڈے کو بھی کچھ کر لیا کروں گی، کوئی ایسا کام جس میں اچھے پیسے مل جائیں۔ میں اب تمہیں بالکل بھی شکایت کا موقع نہیں دوں گی۔ یقین کرو، میں تمہاری ہر بات مانوں گی۔ تمہیں یقین بھی نہیں آئے گا کہ ماہا اتنی محنت کر سکتی ہے، بس تم مجھے چھوڑ کر مت جاؤ۔'' وہ بے اختیار بھاگتی ہوئی اس کے پاس آئی اور جنونی انداز میں کارٹن میں رکھا مانیٹر واپس باہر نکالنے لگی۔

''ماہا! بند کرو یہ پاگل پن۔'' وہ سخت لہجے میں بولا۔ پھر جیسے کچھ سوچ کر اس نے اپنے غصے کو قابو میں کیا اور دوستانہ انداز اختیار کر کے بولا۔

''تم جا کر منہ ہاتھ دھوؤ اور کھانا کھاؤ۔ شام کے چھ بج رہے ہیں اور تم دوپہر سے ایسے ہی بیٹھی ہو، لنچ میں بھی کچھ نہیں لیا۔ جاؤ جا کر کھانا کھاؤ اور ایک کپ گرم گرم چائے کا پیو۔ اس سے تم بہت بہتر محسوس کرو گی۔'' اس دوستانہ اور نرم لہجے میں یہ تنبیہ چھپی ہوئی تھی کہ وہ بغیر مداخلت کے اسے اس کا کام ختم کرنے دے۔

''حمی! اس طرح سے تو کوئی بھی نہیں کرتا۔ تمہیں مجھ سے شکایت کیا ہے؟''

''پھر وہی بات۔ میں کہہ تو چکا ہوں، مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں اب تم بے کار میں مجھے پریشان مت کرو۔'' اس بار اس کے لہجے میں نرمی کا عنصر قدرے کم تھا۔

''اور تمہارے بغیر میرا کیا ہوگا؟ تمہارے سوا اس دنیا میں میرا کوئی بھی نہیں، تم میرا واحد سہارا ہو، میرا واحد رشتہ ہو۔ میں تمہارے بغیر اکیلی کیسے رہوں گی، تم نے یہ بھی سوچا ہے؟'' وہ ایک بار پھر زور زور سے رونے لگی۔

''تم اپنی ممی کے پاس چلی جانا۔ وہ تمہاری ماں ہیں۔ جتنا ظالم تم انہیں سمجھتی ہو، وہ ایسی ہوں گی نہیں۔ پھر تم اپنا کھاتی کماتی ہو، کونسا ان کے گھر بوجھ بن کر رہو گی۔'' کتنا سادہ و آسان سا حل تھا یہ، واقعی اسے خیال ہی نہیں آیا کہ وہ واپس اس ماں کے گھر جا سکتی ہے جو بطور مہمان اپنے گھر آمد پر اسے ایک کپ چائے تک نہیں پلا سکتی۔ وہ اسے نظر انداز کر کے اپنی پیکنگ میں مصروف رہا۔ اب وہ اس کے قریب ہی کارپٹ پر گھٹنوں پر سر رکھے بے آواز آنسو بہا رہی



تھی۔ کچھ دیر بعد اسے کچن سے شامی کبابوں کے تلے جانے کی خوشبو آئی۔ اس کے کچھ دیر بعد چائے کی خوشبو۔

''میں نے کباب فرائی کئے ہیں، اگر تمہیں کھانا ہے تو کباب اور بریڈ ٹیبل پر ہی رکھے ہیں اور کیتلی میں چائے بھی ہے۔''

وہ چائے کا کپ ہاتھ میں لے کر کمرے میں واپس آ گیا اور اسے مخاطب کر کے اس کے جواب کا انتظار کئے بغیر ٹی وی آن کر لیا۔ وہ کارپٹ پر ابھی بھی اسی جگہ، اسی انداز میں بیٹھی تھی، اس کی آنکھوں سے ابھی بھی قطرہ قطرہ کر کے لہو ٹپک رہا تھا۔ خوش فہمیوں میں ڈوبا دل کبھی حقیقتوں کو جان کیوں نہ پایا۔

''ہیلو'' حمیز کے موبائل پر کال آئی تھی اور وہ ایک ہاتھ میں چائے کا کپ اور دوسرے میں موبائل لے کر کمرے سے نکل گیا تھا۔ اس کی آواز وہ بآسانی سن سکتی تھی۔

''میں بالکل ٹھیک ہوں۔ تم کیسی ہو؟'' اس کا لہجہ بہت پرجوش اور آواز خوشی سے بھرپور تھی۔

''نہیں۔ کوئی مسئلہ نہیں ہوا۔ تم میری فکر مت کرو۔''

''ڈونٹ وری سدرہ! میں کوئی چھوٹا سا بچہ ہوں جس کے پیچھے تم صبح صبح شیرٹن آؤ گی۔ میں گیارہ بارہ بجے تک آفس پہنچوں گا۔ ہاں بس پھر کل دوپہر ہی میں تم سے ملاقات ہوگی۔ او کے، ٹیک کیئر بائے۔''

ایسا کیا جادو تھا اس لڑکی میں؟ ڈھائی سالوں کی اس کی محبت بھری رفاقت کو اس نے محض دو ماہ میں خاک کر ڈالا۔ تنکا تنکا جوڑا اس کا آشیانہ کس آسانی سے اس نے اجاڑ ڈالا تھا۔

''تمہیں تو اور بہت سے مل سکتے ہیں۔ اتنے بڑے باپ کی بیٹی ہو۔ جسے چاہے خرید لو۔ مگر میری زندگی میں تو فقط یہی ایک شخص ہے۔ اسے مجھ سے مت چھینو۔ یہ مجھ سے چھن گیا تو میں کس طرح جی پاؤں گی؟'' اس کے جی میں آئی کہ وہ ابھی اور اسی وقت جا کر اس لڑکی سے ملے۔ اس کے سامنے ہاتھ جوڑنے پڑیں تو ہاتھ جوڑے۔ اس کے پاؤں پکڑنے پڑیں تو پاؤں پکڑ لے۔ اس کی منت کرے۔

وہ کمرے میں واپس آیا۔ موبائل میز پر رکھا، پھر ایک نظر اس پر ڈالی اور سونے کے لئے بیڈ پر لیٹ گیا۔ وہ کارپٹ پر بیٹھی رہی اور وہ بیڈ پر لیٹا رہا۔ جس شب کو اس کا دل چاہ رہا تھا، وہ ہاتھ پکڑ کر روک لے۔ وہ اتنی تیزی سے گزر رہی تھی کہ سویرا ہونے میں کچھ وقت رہ ہی نہیں گیا تھا۔ وہ کچھ دیر سونا چاہتی تھی، سو کر اٹھے گی تو سب کچھ پہلے جیسا ہوگا، یہ ڈراؤنا خواب سو کر اٹھنے پر اپنی موت آپ مر جائے گا، مگر نیند آنکھوں میں آنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ صبح کی روشنی پھیلتی دیکھ کر وہ گھبرا کر اٹھی اور تیزی سے اس کا سوٹ کیس کھول کر اس میں سے کپڑے واپس نکالنے لگی۔

''ماہا'' وہ اس کے سر پر کھڑا اسے خشمگیں نگاہوں سے گھور رہا تھا۔

''میں کل دوپہر سے تمہارا پاگل پن برداشت کر رہا ہوں۔ صرف اس لئے کہ ہم نے بہت سا وقت ایک ساتھ بہت اچھی طرح گزارا ہے، میں چاہتا تھا کہ ہم اچھے دوستوں کی طرح کسی تلخی اور کسی جھگڑے کے بغیر ایک دوسرے کو خدا حافظ کہیں۔ مگر تم مجھے رویہ بدلنے پر مجبور کر رہی ہو۔ تم ایک پڑھی لکھی، ماڈرن لڑکی ہو، کیوں بلاوجہ کسی ان پڑھ اور جاہل عورت کی طرح ری ایکٹ کر کے ماحول کو خراب کر رہی ہو۔''

''میرا شوہر مجھے چھوڑ کر کسی اور سے شادی کرنے والا ہے، نہیں ہوں میں پڑھی لکھی، نہیں ہوں میں ماڈرن،

میں جاہل ہی ٹھیک ہوں۔'' کاش وہ اسے جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر یہ بات کہہ پاتی۔

سوٹ کیس واپس بند کرنے کے بعد وہ نہانے چلا گیا، نہا کر وہ آ کر اسی اہتمام اور اسی انداز سے تیار ہونے لگا جیسے روز ہوتا تھا۔ اس کے بعد اس نے کمرے سے اپنا سوٹ کیس باہر نکالا، پھر بیگ۔ جیسے ہی اس نے آخری کارٹن کمرے سے باہر نکالا وہ فوراً اس کے پاس آئی اور اس کے بازو کو زور سے پکڑ کر منت بھرے لہجے میں بولی۔

''تمہیں اس سے شادی کرنی ہے کر لو، مگر مجھے چھوڑ کر مت جاؤ حومی! میں تم دونوں کی زندگی میں بالکل مداخلت نہیں کروں گی، بس اتنا حق دے دو کہ جہاں اب تم رہو گے وہیں میں بھی رہ سکوں۔'' حمیر نے اپنا بازو بہت ناگواری سے چھڑایا اور اس کی بات کا جواب دیئے بغیر کارٹن گھسیٹتا کمرے سے باہر آ گیا۔ وہ روتے ہوئے اس کے پیچھے پیچھے آئی۔

''تمہارے سوا میرا کوئی بھی نہیں ہے۔ میں تمہارے بغیر کیسے رہوں گی۔'' وہ اپنے پیچھے آتی اس روتی اور التجائیں کرتی آواز کو نظر انداز کر کے اپنا سارا سامان ایک ایک کر کے مین دروازے سے نکال کر لفٹ کی طرف لے جا کر رکھنے لگا۔

''دیکھو تو تمہارے سوا میرا کوئی بھی نہیں، میں بالکل اکیلی ہوں۔'' اس نے اس کی قمیض پیچھے سے پکڑ کر کسی بھکارن کے سے انداز میں اس سے بھیک مانگی۔ اس نے ایک جھٹکے سے اپنی قمیض اس کی گرفت سے چھڑائی اور انتہائی سخت لہجے میں اسے وارننگ دی۔

''تم نے اگر یہ ڈرامہ بند نہ کیا اور مزید ایک قدم بھی میرے پیچھے آئیں تو میں تمہارا بالکل لحاظ نہیں کروں گا۔'' وہ ڈر کر، سہم کر، ٹھٹک کر، خوف زدہ نگاہوں سے اسے دیکھتی رہی اور وہ اپنا بیگ دروازے کے اندر سے اٹھا کر لفٹ کی طرف چلا گیا۔

اس کا ذہن پھر سے ماؤف ہونے لگا، اعصاب پھر سے منجمد ہونے لگے، احساسات پر پھر سے برف جمنے لگی، ہوش و خرد سے بیگانہ کسی پاگل عورت کی طرح اس نے اپنے اپارٹمنٹ کا دروازہ واپس بند کیا اور وہیں دروازے کے پاس ہی فلور میٹ پر بیٹھ گئی۔ اسے اس جگہ بیٹھے کتنے گھنٹے ہو چکے تھے جب اس کے گھر کی خاموشی کو فون کی بیل نے توڑا۔

''مانتی ہو میرے سینس آف ہیومر کو؟ دیکھا کیسا پریکٹیکل جوک کیا تمہارے ساتھ۔ ڈرا کر رکھ دیا نا تمہیں تھوڑی سی دیر میں۔'' اس نے اپنے کانوں کے پاس ایک مانوس آواز سنی، وہ دیوانہ وار پاگلوں کی طرح فون کی طرف بھاگی۔ اتنا اندھا دھند کہ سامنے رکھی میز بھی اسے نظر نہیں آئی، بہت بری طرح وہ ٹھوکر کھا کر منہ کے بل زمین پر گری، اس کی ناک اور ہونٹ پر چوٹ لگی تھی، سخت تکلیف کا احساس بھی ہوا تھا مگر وہ اس چوٹ پر دھیان دیئے بغیر فون کی طرف لپکی اور جھپٹ کر ریسیور کان سے لگایا۔

''حومی۔'' یہ نام پکارتے ہی آنکھیں پھر آنسوؤں سے بھرنے لگی تھیں۔

''میں بول رہی ہوں بابا۔'' وہ ممی کی آواز تھی۔

''تمہیں کیا حمیر کے فون کا انتظار تھا؟''

''نہیں، ویسے ہی میں سمجھی شاید اس کا فون ہو۔'' اپنے آنسوؤں پر قابو پا کر وہ نارمل انداز میں بات کرنے



کی کوشش کرنے لگی۔ کسی کو کچھ پتا نہیں چلنا چاہئے، کسی کو بھی، ممی کو بھی۔

''بہت دنوں سے تمہارا فون نہیں آیا، اس لئے میں نے سوچا، تمہاری خیریت پوچھ لوں۔ تمہارے آفس فون کیا تو پتا چلا تم آج وہاں آئی نہیں، کیسی طبیعت ہے تمہاری؟''

''میری طبیعت ٹھیک ہے ممی! بس ویسے ہی آج گھر میں کچھ کام تھا، اس لئے چھٹی کر لی۔ آپ کیسی ہیں؟ اور انکل اور عبداللہ کیسے ہیں؟''

''ہاں میں بالکل ٹھیک نہیں۔ میرا گھر اجڑ گیا۔ کیسی ماں ہو، تمہیں میرے دکھ کیوں پتا نہیں چلتے؟''

''ہاں میں بالکل ٹھیک ہوں۔ مظہر بھی ٹھیک ہیں۔ وہ میں نے تم سے عبداللہ کی جاب کے لئے بات کی تھی، گریجویشن کب کا ہو گیا اس کا پھر اب تو اس نے کمپیوٹر کے بھی اتنے سارے کورسز کر لئے ہیں۔ دیکھی کوئی جگہ تم نے اس کے لئے اپنے آفس میں؟''

''جی ممی! میں کوشش کر رہی ہوں۔ انشاء اللہ کچھ نہ کچھ ضرور ہو جائے گا۔'' اس سے بالکل بھی بولا نہیں جا رہا تھا۔ بڑی مشکلوں سے اپنی تمام تر طاقتوں کو مجتمع کر کے وہ لفظوں کو ادا کر رہی تھی۔ ریسیور کریڈل پر رکھ کر اس نے اپنے ہونٹوں پر ہاتھ پھیرا۔ اس کی انگلیاں خون آلود ہو گئی تھیں۔ اس کے ہونٹ سے خون بہہ رہا تھا اور آنکھوں سے آنسو۔ خون صاف کرنے کے لئے ٹشو پیپر لینے وہ ڈائننگ ٹیبل کے پاس آئی۔ وہاں بہت سے جھوٹے برتن رکھے تھے۔ ایک پلیٹ میں ڈھک کر رکھے کباب اور اس کے قریب ڈبل روٹی، چائے کے خالی کپ۔ وہ ٹشو پیپر لینا بھول چکی تھی۔ وہ اب آہستہ آہستہ ان برتنوں کو چھو رہی تھی۔

وہ اپنے اپارٹمنٹ کے ایک ایک کونے میں پاگلوں کی طرح روتی ہوئی پھر رہی تھی۔ نہ زمین پھٹی تھی، نہ آسمان سر پر گرا تھا۔ کچھ بھی تو نہیں ہوا تھا، فقط اتنا کہ ایک گھر، ایک رشتے اور ایک محبت کی محبت میں خود کو مٹا دینے والی وہ لڑکی پھر سے تنہا رہ گئی تھی۔

☆☆☆

''تمہیں میرے بغیر نیند آ جاتی ہے؟ میں تو نہیں سو پائی تمہارے بنا، میں تو نہیں جی پاتی تمہارے بنا۔ تم کس طرح جی رہے ہو میرے بغیر؟ پلیز واپس آ جاؤ۔''

وہ روتے، سسکتے اس کی تصویر سے باتیں کر رہی تھی۔

آج رات وہ کسی اور لڑکی کے ساتھ تھا۔ اس کا حق کسی اور کو دینے والا تھا۔

گزرے چھ دنوں میں اس نے کئی مرتبہ اس کا موبائل نمبر ملایا تھا، اس کے آفس کا نمبر ملایا تھا اور وہ اس سے کہیں پر بھی بات نہیں کر رہا تھا۔ ایک موہوم سی امید تھی، شاید وہ اسے روک پائے، لیکن وہ اس سے بات نہیں کر پائی تھی اور وہ رات آ گئی تھی، وہ اپنے کمرے میں تنہا پھوٹ پھوٹ کر روئی۔ کبھی بہت زور زور سے چیخ کر، کبھی بغیر آواز کے۔

''مجھے بہت اچھا لگے گا حومی! جب ایک روز تم مجھ سے کہو گے کتنی جلدی پچیس سال گزر گئے، پتا ہی نہیں چلا ماہا!''

بہت جلدی ہے پچیس سال گزروانے کی۔ پچیس سال بعد تم تو بوڑھی ہو جاؤ گی۔'' اس رات جب وہ یہ باتیں حمیر سے کر رہی تھی۔ تب کا تب تقدیر اس کی سادگی پر کس قدر مسکرایا ہو گا۔ اس کی قسمت میں تو اس رات کے بعد

پچیس ماہ کی رفاقت بھی باقی نہیں رہی تھی۔ اس شخص کی۔ ساری رات روتے رہنے کے بعد صبح کے قریب اس کی آنکھ لگی تھی تو صبح اپنے مخصوص وقت پر وہ ہڑبڑا کر جاگ گئی تھی۔

''حوی! اٹھو۔'' روانی میں بولتے ہوئے وہ ٹھٹک کر رک گئی۔ گزرے سات دنوں کی طرح اسے خود کو یاد دلانا پڑا کہ وہ کمرے میں تنہا ہے۔

''تمہیں اپنی زندگی میں کوئی کمی محسوس نہیں ہو رہی؟ میری طرح کون تمہارا خیال رکھتا ہوگا، کون صبح میں فریش جوس لا کر دیتا ہوگا، رات میں کون تمہارے لئے دودھ کا گلاس لاتا ہوگا۔'' وہ ایک بار پھر زار و قطار رونے لگی تھی۔

☆☆☆

دن پر دن گزر رہے تھے، اسے اپنے اپارٹمنٹ سے باہر نکلے، باہر کی دنیا میں گئے پورے بیس دن ہو چکے تھے۔ بیس دنوں سے وہ اپنے اپارٹمنٹ میں قید کسی مردے کی سی زندگی جی رہی تھی۔ اس کے آفس سے اس کی غیر حاضری کے اگلے ہی روز فون آیا تھا۔

اس نے اپنی کسی نجی مصروفیت کا کہہ کر آفس سے چھٹی کر لی تھی۔ اس نے کبھی اتنی لمبی تو کیا، محض ایک دن کی چھٹی بھی کبھی نہیں کی تھی۔

انیس دن اس نے یونہی مُردوں کی سی حالت میں گزارے مگر بیسویں دن اسے دودھ اور چینی کے بعد پتی بھی ختم ہونے کا احساس ہوا تو وہ چونکی۔ فرج میں رکھا دودھ اور خشک دودھ کئی روز ہوئے کب کے ختم ہو چکے تھے، وہ کتنے دنوں سے بغیر دودھ اور بغیر شکر کے چائے پی رہی تھی۔ وہ ابھی زندہ ہے، اسے خود اپنے آپ کو یاد دلانا پڑا، نہ یہ اپارٹمنٹ اس کی قبر تھا اور نہ وہ اس میں بسی مردہ۔ وہ زندہ تھی، ابھی اس مہینے کے بارہ دن باقی تھے اور اس کے پاس صرف تین ہزار روپے تھے۔ کہ اس کی پوری کی پوری تنخواہ گھر کے اخراجات میں خرچ ہو جایا کرتی تھی۔ بچت تو حمیر رضا کی تنخواہ کی کرتے تھے وہ لوگ۔ تین ہزار روپے، اس کی کل کائنات اس کا کوئی بینک بیلنس نہیں تھا۔ اس کا اپنا اکیلی کا کوئی بینک اکاؤنٹ نہیں تھا۔

تین ہزار روپے کا کل اثاثہ رکھتے ہوئے وہ اپارٹمنٹ میں بند اور کتنے دن رہ سکتی تھی؟ اسے پیٹ بھرنے کو اناج بھی چاہئے تھا، تن ڈھانپنے کو کپڑا بھی چاہئے تھا اور سر چھپانے کو چھت بھی چاہئے تھی، اسے یہ سب کچھ چاہئے تھا، اس لئے کہ وہ زندہ تھی اور یہ سب حاصل کرنے کے لئے اسے دوبارہ دنیا سے اپنا رشتہ جوڑنا تھا۔

اکیسویں روز صبح وہ اپنے آفس جانے کے لئے تیار ہو رہی تھی۔ اس نے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر کتنے دنوں بعد خود کو دیکھا۔ اس کی حالت واقعی کسی مردہ جیسی ہی لگ رہی تھی۔ اندر دھنسی ہوئی چمک اور زندگی سے عاری آنکھیں، آنکھوں کے نیچے گہرے حلقے، پیلا ہلدی جیسا چہرہ، ایسے جیسے ابھی ابھی کسی سنگین بیماری سے اٹھی ہو۔ وہ کبھی آفس جانے کے لئے اتنے اہتمام سے تیار نہیں ہوتی تھی، جتنی آج ہو رہی تھی۔

بہت فریش اور چاق و چوبند اگر وہ سب کو نہ بھی لگے تو کم از کم ایسی کمزور اور مرجھائی ہوئی بھی نظر نہ آئے کہ کوئی اس بارے میں کچھ پوچھے۔ وہ چلا گیا تھا تو کیا ہوا، اسے واپس تو اس کے پاس آنا تھا اور وہ اس کی واپسی سے پہلے کا یہ سارا وقت اس طرح گزارنا چاہتی تھی کہ اس کے کسی بھی جاننے والے کو کچھ پتا نہ چل سکے۔ کچھ دنوں میں وہ



واپس آ جائے گا مگر پھر کلثوم اور فائز جیسے اس کے مخلص دوست حمیر کو کبھی بھی ویسی عزت نہیں دیں گے، پھر بے کار میں کیوں انسان اپنی گھریلو باتیں کسی کو بتائے اور جگ ہنسائی کروائے۔

وہ آفس آ گئی تھی۔ اپنی ظاہری حالت کو قیمتی لباس، بہترین میک اپ اور دلآویز مسکراہٹ کے پردے میں چھپا لیا تھا مگر اندر کی دنیا کا کیا کرتی؟ اس سے کوئی کام نہیں ہو رہا تھا۔ اس کے سامنے رخشی بیٹھی تھی اور وہ ہمدانی گروپ کی جانب سے وقت پر پیمنٹ نہ ہونے کے حوالے سے لیٹر ڈکٹیٹ کروا رہی تھی۔

''میں خوش نہیں تھا ماہا! میں تمہارے ساتھ خوش نہیں تھا۔''

''تم میرے لئے بہت قیمتی ہو۔ I LOVE YOU SO MUCH''

''جی میم!'' رخشی subject لکھ چکنے کے بعد اگلے جملوں کی منتظر تھی۔ وہ چونک کر سیدھی ہوئی۔ جو رقم ہمدانی گروپ کے ذمہ واجب الادا تھی، اس نے اس پر توجہ مرکوز رکھنے کے لئے سامنے رکھے کاغذوں پر نگاہیں جمائیں۔

''تم میری منزل نہیں۔ میری منزل سدرہ آفاق ہے۔ اسے رخشی بھی نظر آ رہی تھی اور اس کی منتظر نگاہیں بھی، مگر اسے بولنا کیا ہے، یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

''ہیلو لوگو۔'' فائز حسب عادت دروازے پر سے تیز آواز میں بولتا اندر آ گیا، ہاتھ میں یو ایس بی لئے ہوئے۔ میں تمہارا پرنٹر استعمال کر سکتا ہوں؟ میرا پرنٹر اس وقت روٹھی محبوبہ کی طرح اینٹھا ہوا ہے۔''

''اوہ شیور''۔ اس کے چونچال موڈ کے جواب میں وہ جبراً مسکرائی اور پھر دوبارہ رخشی اور اپنے سامنے رکھے کاغذوں کو دیکھتے ہوئے اسے خط ڈکٹیٹ کروانے لگی۔

اسے اپنے سامنے لکھے لفظوں کو پڑھنے کے باوجود بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

''جی میم! آگے۔''

''میں شادی کر رہا ہوں ماہا! تم میری منزل نہیں، تم میرے لئے بہت قیمتی ہو۔ میں تمہارے ساتھ خوش نہیں تھا۔ تم میری زندگی کا سب سے خوبصورت احساس ہو۔''

''آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی میم!'' رخشی متفکر نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

''ہاں۔ نہیں میری طبیعت بالکل ٹھیک ہے۔ اصل میں کل ساری رات لائٹ نہیں تھی۔ نیند ڈسٹرب رہی ہے، اس لئے اب بے تحاشا تھکن کا احساس ہو رہا ہے۔'' وہ اسے جواب دیتے ہوئے مسکرائی۔

''آپ تھوڑا ریسٹ کر لیں۔ میں لنچ کے بعد آ جاؤں گی۔ ڈکٹیشن لینے۔''

''نہیں۔ اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ آئی ایم فائن۔ کراچی میں رہنا ہے تو بجلی غائب اور پانی غائب والے مسائل تو بھگتنے ہی پڑیں گے۔'' وہ ہنستے ہوئے بولی۔ کی بورڈ پر ہاتھ چلاتے ہوئے فائز گردن ترچھی کر کے تھوڑی تھوڑی دیر بعد اسے گہری نگاہوں سے دیکھتا جا رہا تھا۔

''اچھا پھر میں آپ کے لئے ایک کپ چائے لے آتی ہوں۔'' رخشی اٹھ گئی فائز اب بالکل سیدھا کھڑا بغور اسے دیکھے چلا جا رہا تھا۔

''کیا بات ہے۔ تم مجھے ایسے کیوں دیکھ رہے ہو؟ میرے کیا سینگ نکل آئے ہیں۔'' اس کی خاموشی اور ان

نگاہوں کی گہرائی سے بچنے کی خاطر غیر سنجیدگی سے ہنستے ہوئے پوچھنے لگی۔

"تم آج خوبصورت بہت لگ رہی ہو، اسی لئے۔"

"سدھر جاؤ ورنہ زارا سے واقعی کسی دن پٹو گے۔" اس کی کچھ کھوجتی، متجسس سی نگاہیں اور گہرا لہجہ اسے بری طرح ڈسٹرب کر رہا تھا۔ فائز جیسے ہی اس کے کیبن سے نکلا اس نے سکون کا سانس لیا۔

☆☆☆

اسے آفس دوبارہ جوائن کئے اس روز دسواں دن تھا۔ پہلے دن غیر حاضر دماغی اور کچھ الجھے انداز کا مظاہرہ کرنے کے بعد اس نے پھر کسی دن کچھ ایسا نہیں ہونے دیا تھا جو لوگوں کو چونکائے۔ لنچ ٹائم میں حسب معمول وہ ایک فائل دیکھنے کے ساتھ ساتھ سینڈوچ کھانے اور کولڈ ڈرنک کے سِپ لینے میں بھی مصروف تھی۔ اپنے موبائل پر کال آتی دیکھ کر اس نے بے دھیانی کے عالم میں کال ریسیو کر لی۔

"ہیلو، ہیلو ماہا! حمیر بول رہا ہوں۔" سینڈوچ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر فائل پر گر پڑا۔

"حومی"۔ اس کے لبوں سے اتنے دھیمے انداز میں یہ نام نکلا کہ شاید دوسری طرف سنا بھی نہیں جا سکتا۔

"ماہا! میں حمیر بول رہا ہوں۔" کیا ان کا برسوں کا ساتھ اتنا کمزور اور اتنا بے معنی تھا کہ انہیں ایک دوسرے سے اپنا تعارف کروانا پڑے۔

"میں حمیر بول رہا ہوں۔" (میں تمہیں تمہاری آہٹوں سے پہچانتی ہوں۔ یہ تعارفی اور پرتکلف جملے بول کر کیوں مجھے پرایا بنا رہے ہو؟) اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئی تھیں اور حلق میں ایسا پھندا لگا تھا کہ وہ کچھ کہہ ہی نہیں پا رہی تھی۔

"ماہا؟" اس کی خاموشی سے تنگ آ کر اس نے پھر سے اس کا نام لیا۔

"میں پل پل جی رہی ہوں، پل پل مر رہی ہوں۔ تمہارے بغیر کچھ اچھا نہیں لگتا حومی، پلیز! واپس آ جاؤ۔"

"تم کیسے ہو حومی؟" منہ سے آواز نکلنے کی دیر تھی، اس کی آنکھوں میں ٹھہرا پانی قطرہ قطرہ کر کے اس کے چہرے اور گردن کو بھگوتا میز پر گرنے لگا۔

"میں ٹھیک ہوں۔" اس کی آواز بہت ہموار اور نارمل تھی۔

"مجھے تم سے کچھ ضروری باتیں کرنا ہیں۔ اسی کے لئے میں نے فون کیا ہے۔ میرا خیال ہے اس وقت تمہارا لنچ بریک ہوگا، تو جو باتیں میں تم سے کرنا چاہتا ہوں، وہ تمہیں ڈسٹرب کئے بغیر آرام سے کر سکتا ہوں۔" وہ خاموش بیٹھی میز پر تیزی سے گرتے اپنے آنسوؤں کو ایک ٹک دیکھے چلی جا رہی تھی۔

"یہ باتیں میں تم سے اسی روز کرنا چاہتا تھا مگر تب تم اتنی حساس اور اس قدر ایموشنل ہو رہی تھیں کہ ہم دو پڑھے لکھے، میچور افراد کی طرح ان تمام امور پر بات کر ہی نہیں پائے تھے۔ میں اتنے دن قصداً ٹھہرا رہا تا کہ تم اس جذباتی فیز سے باہر نکل آؤ۔ اب ایک مہینہ ہو چکا ہے اور میرا خیال ہے، تم اس جذباتی فیز سے نکل کر ساری صورت حال کو حقیقت پسندی کے ساتھ قبول کر چکی ہو گی تو اب ہمیں تمام تصفیہ طلب امور پر بات کر لینی چاہئے۔" وہ سیدھا کام کی بات کی طرف آتا سنجیدگی و بردباری سے بولا۔ اس کے آنسوؤں کے بہنے کی رفتار میں یک دم ہی شدت آ گئی تھی۔



"میں ڈیوورس اور تمہارے مہر کی بات کر رہا ہوں۔ میں تمہیں ایک لاکھ روپے کا چیک بھجوا دوں یا تم کیش لو گی؟" یہ ایک شوہر کی اپنی بیوی سے نہیں، ایک بینکر کی اپنے کلائنٹ سے بزنس کمیونی کیشن تھی۔

غیر جذباتی اور مدلل۔ وہ جواب میں کچھ بھی نہیں کہہ پائی۔ اس کے آنسو اسے کچھ بولنے ہی نہیں دے رہے تھے۔ وہ صرف یہ کوشش کئے جا رہی تھی کہ اس کی سسکیوں کی آوازیں لائن کے دوسری طرف تک نہ پہنچیں۔

"میں اور سدرہ دس پندرہ دن میں امریکہ جا رہے ہیں، میں وہاں Yale میں ایڈمیشن لے رہا ہوں۔ ڈاکٹریٹ کا ارادہ ہے میرا۔ جانے سے پہلے میں اس معاملے کو نمٹا لینا چاہتا ہوں۔ تم جس طریقے سے کہو گی، میں تمہارا مہر اس طرح ادا کر دوں گا۔ باقی ہمارے اپارٹمنٹ میں جو فرنیچر وغیرہ تھا، وہ سب تم بخوشی فروخت کر سکتی ہو۔ مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں۔" وہ اپنی بات مکمل کر کے اس کے جواب کا انتظار کرنے لگا۔ پورے ایک منٹ تک بھی جب وہ کچھ نہ بولی تو اس نے اسی سنجیدگی و متانت سے اسے مخاطب کیا۔

"میں تمہارے جواب کا انتظار کر رہا ہوں ماہا!" اس نے منہ پر ہاتھ رکھ کر اپنی سسکیوں کو دبانے کی ناکام کوشش کی۔

"مجھے طلاق نہیں چاہئے۔" بہت کوشش کے باوجود بھی وہ بغیر روئے یہ جملہ نہیں بول پائی تھی۔ وہ اب اس سے اپنی سسکیاں چھپانے کی کوشش نہیں کر سکتی تھی۔ وہ اب پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

"لیکن ماہا! یہ صحیح نہیں ہے۔ آخر تمہاری بھی ایک زندگی ہے، تمہیں اپنے مستقبل کے بارے میں سوچنے کا پورا پورا حق ہے۔"

"میں نے کہا نا، مجھے نہیں چاہئے۔" وہ روتے ہوئے چلائی۔

"میں تم سے کیا مانگ رہی ہوں؟ مجھے طلاق دیئے بغیر بھی تو تم سدرہ آفاق کے ساتھ زندگی گزار سکتے ہو۔ میں کبھی بھی تمہارے پاس کوئی حق جتانے نہیں آؤں گی، کچھ مانگنے نہیں آؤں گی۔"

"تم ابھی بھی اس جذباتی کیفیت سے نہیں نکلیں۔" وہ ایک گہری سانس لے کر بولا۔

"او کے، ایز یو وش۔ لیکن جس وقت بھی تم اس جذباتی کیفیت سے باہر نکل آؤ تو مجھ سے فوراً رابطہ کرنا۔ میرے آفس فون کر کے تم احسان یوسف سے میرا امریکہ کا ایڈریس اور فون نمبر لے سکتی ہو۔ اس حماقت سے نکل کر اپنی زندگی کے بارے میں سوچو گی اور کسی اچھے انسان کا ہاتھ تھام لو گی تو مجھے واقعی بہت خوشی ہو گی۔ اچھا میں فون بند کر رہا ہوں۔ اللہ حافظ۔" بہت فیاضی کے ساتھ اسے اس کی زندگی کے بارے میں سوچنے کی دعوت دے کر رابطہ منقطع کر دیا گیا تھا۔ اسے اپنی آنکھوں کے سامنے ہر چیز گردش کرتی گول گول گھومتی نظر آ رہی تھی۔ آنسوؤں کے طوفان سے اس پار ہر چیز دھندلی تھی، ہر منظر غیر واضح اور مبہم تھا۔

"وہ پورا کا پورا میرا ہے۔ اس کی محبت میری ہے، اس کی وفائیں میری ہیں۔ تمہیں کیا معلوم، وہ مجھ سے کتنی بے تحاشا محبت کرتا ہے۔" کلثوم سے کہے اس کے لفظ خود اسی پر ہنس رہے تھے۔ اس کا تمسخر اڑا رہے تھے۔ اب زندگی میں گنوانے کو بچا کیا تھا؟ وہ سب کچھ ہار گئی تھی اور اس کے پاس پیچھے پلٹ کر دیکھنے پر میکے کے نام کا کوئی آسرا نہیں تھا۔

شکر تھا کہ یہ لنچ ٹائم تھا۔ بیشتر افراد لنچ کرنے کے لئے گئے ہوئے تھے اور اس کے کیبن کا دروازہ بھی بند

تھا۔ رسوائی کا خوف تو ابھی بھی تھا نا۔ اپنی ہار وہ لوگوں سے ابھی بھی چھپائے رکھنا چاہتی تھی۔

''مسز حمیر! میٹنگ سے پہلے آپ ذرا یہ فائل اسٹڈی کر لیں۔''

''ابھی تھوڑی دیر پہلے میرا شوہر مجھ سے اپنے نام کا یہ حق بھی واپس لینے کی بات کر رہا تھا۔ بڑی مشکلوں سے یہ ایک حق اپنے پاس رکھ پائی ہوں، باقی تو سب کچھ گنوا دیا۔''

''جی سر! میں اسے دیکھ لوں گی۔'' وہ فائل لے کر فنانس ڈائریکٹر کے آفس سے نکل آئی۔ سامنے سے آتے فائز کو وہ نظر انداز کر کے گزر جانا چاہتی تھی مگر وہ اس کے عین سامنے آ کر رک گیا۔

''بڑی باس کی چمچہ گیری ہو رہی ہے۔ لگتا ہے ماہا احمد علی کا پھر پروموشن ہونے والا ہے۔''

''ماہا حمیر رضا''۔ وہ اس کے ساتھ ساتھ چلتا سر پر ہاتھ مار کر بولا۔

''روانی میں منہ سے نکل گیا۔'' وہ اس کی طرف بغور دیکھ رہا تھا۔ اس کا لہجہ پھر سنجیدہ اور شوخ و شریر تھا مگر نگاہیں حد درجہ سنجیدہ۔ اس کے چہرے پر کچھ ڈھونڈتی، کچھ پڑھتی ہوئی۔

''تمہیں خود تو کوئی کام وام ہے نہیں مگر میں بہت بزی ہوں۔ مجھے ابھی یہ فائل اسٹڈی کرنی ہے۔'' وہ اس سے آگے بڑھ کر تیزی سے اپنے کیبن کی طرف چلی گئی تھی۔

چھٹی تک کا وقت اس نے آفس میں معمول کے انداز میں گزارا تھا۔ وہ اپنے اپارٹمنٹ واپس آ گئی۔ روز کی طرح وہاں خاموشی، تنہائی، اداسی اور ویرانی نے اس کا استقبال کیا۔ یہ ایک مہینہ اس نے امید و بیم کی کیفیت میں گزارا تھا۔ کسی خطرناک و جان لیوا بیماری میں مبتلا اس مریض کی طرح جو ڈاکٹر کے پاس جا کر اپنے سب ٹیسٹ کروا آئے اور پھر رپورٹس کا انتظار اس امید پر کرے کہ شاید ان میں سب کچھ ٹھیک آئے گا۔ اس کے ہاتھ میں بھی آج رپورٹس آ گئی تھیں اور وہ یہ کہہ رہی تھیں کہ اس کی زندگی میں کچھ بھی ٹھیک نہیں ہونے والا۔ وہ اس کے پاس آنے کے بجائے اس سے اور بھی دور جا رہا تھا۔ اب کچھ تو سوچنا تھا، کوئی فیصلہ تو کرنا تھا۔

''کلثوم! میں تم سے ملنا چاہتی ہوں۔ کیا کل کسی وقت تم مجھ سے ملنے میرے اپارٹمنٹ آ سکتی ہو۔'' بیگ میز پر رکھتے ہی اس نے کلثوم کا فون نمبر ملایا اور بہت ہچکچاتے ہوئے یہ بات اس سے کہی۔ کبھی دوستوں کے خلوص کو آزمایا نہیں تھا، اس لئے بری طرح ڈر رہی تھی۔ اس کے لہجے کا غیر معمولی پن کلثوم نے غالباً فوراً بھانپ لیا تھا، اس لئے کیوں، کس لئے، کس وجہ سے، جیسے کسی سوالوں میں الجھے بغیر اپنے آنے کا وقت اس کے ساتھ فوراً طے کر لیا تھا۔

☆☆☆

''نہیں مانی نا میری نصیحت، کہا تھا اس شخص پر یوں اندھا بھروسہ مت کرو۔ رہ گئیں نا اکیلی، خالی ہاتھ و تہی دامن۔'' کلثوم کو یہ بتانے کے بعد کہ حمیر رضا نے کسی اور سے شادی کر لی ہے، وہ اسے چھوڑ کر چلا گیا ہے۔ اس نے ڈرتے ڈرتے اس کی طرف ان نگاہوں سے دیکھا جیسے ابھی وہ لبوں پر طنزیہ مسکراہٹ لا کر اس سے یہی کچھ کہے گی مگر کلثوم کے چہرے پر نہ طنز تھا، نہ ملامت۔ اس کے چہرے پر شاک کی کیفیت تھی، حیرت تھی، دکھ تھا، رنج تھا۔ وہ انتہائی دکھ بھری حیرت سے دم سادھے اسے دیکھے چلی گئی۔

''ماہا! یہ...... یہ کب ہوا؟''



''ایک مہینہ ہو گیا۔'' اس نے ندامت سے سر جھکا کر اسے جواب دیا۔ کلثوم اس کے بیڈ روم میں اس کے پاس بیڈ پر بیٹھی ہوئی تھی۔

''ایک مہینہ؟'' وہ حیرت سے چلائی۔

''ایک مہینہ؟ اور ایک مہینے سے تم یہاں اکیلی رہ رہی ہو۔ ماہا! تم کیا پاگل ہو چکی ہو؟ یہاں لوگ بد شکل اور عمر رسیدہ عورتوں کو نہیں چھوڑتے تو کسی خوبصورت اور تنہا لڑکی کو بخش سکتے ہیں؟ ایک مہینے سے تم یہاں پر تنہا ہو، تم نے اتنا بڑا رسک لیا۔ پاگل لڑکی! اگر کچھ ہو جاتا پھر...... پھر......''

غصے سے اسے جھڑکتے اس نے یوں جھرجھری لی جیسے ایسی بات صرف سوچنے ہی سے اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے ہوں۔

''میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ یہ شخص اتنا گر سکتا ہے۔ تمہاری شادی کے بعد جب بھی تم سے ملتی تھی، مشینی زندگی گزارتے اور گھن چکر بنا دیکھتی، مجھے بہت برا لگتا مگر تب بھی، تب بھی یہ سوچ تو کبھی میرے دل میں آئی بھی نہیں کہ وہ ذلالت کی ایسی انتہا تک پہنچ سکتا ہے۔ اتنا کم ظرف، اتنا کمینہ، تمہاری جیسی اچھی بیوی کی قدر نہیں کی۔ اللہ اس سے ایسا تم پر کیے ہر ظلم کا ایسا حساب لے گا کہ وہ سکون کو ترسے گا، چین کی زندگی کبھی......''

''کلثوم پلیز......'' اسے مزید بددعائیں دینے سے اس نے بے ساختہ روک دیا۔ عجیب سا ڈر لگا تھا، ایک وہمی سی سوچ۔ اگر جو یہ گھڑی قبولیت کی ہوئی پھر......؟

''اللہ! وہ ہمیشہ خوش رہے، ہمیشہ سکھی رہے۔ اسے زندگی میں خوشیاں، کامیابیاں، سکون سب کچھ دینا۔'' اس نے جیسے کلثوم کی بددعاؤں کا اثر زائل کرنے کے لئے جلدی سے دل میں یہ دعا مانگی۔

''پھر کیا کہتا ہے اب وہ ذلیل انسان؟ فوراً طلاق لو اس سے۔ تمہارا مہر کتنا ہے اور مہر کے علاوہ تم اس سے بہت سے اخراجات کی مد میں پیسہ نکلوا سکتی ہو۔ جب تک اس کے ساتھ رہیں، تب تک تو اسے اپنی کمائیوں سے خوب مزے کرائے ہیں۔ اب ذرا اس کمینے کو تھوڑا سا سبق بھی تو سکھایا جانا چاہئے۔ ہم کسی اچھے وکیل سے......'' اس نے کلثوم کی بات کاٹ دی اور اسے یہ بات بتائی کہ حمیر اسے طلاق دینے کے لئے بخوشی آمادہ ہے مگر وہ لینا نہیں چاہتی۔

''ماہا! تم...... تم......'' وہ اسے ایسے دیکھ رہی تھی جیسے اس کے سامنے بیٹھی لڑکی اس کی دوست ماہا احمد علی نہیں بلکہ اپنا ذہنی توازن مکمل طور پر کھوئی ہوئی ایک پاگل عورت تھی۔

''تم ابھی بھی اس کی منتظر ہو؟ وہ واپس آ جائے گا، اس انتظار میں ہو؟ وہ واپس آئے گا تو تم اسے ایک لمحہ کی بھی دیر لگائے بغیر فوراً اپنا لو گی۔ تمہارے دل میں ابھی بھی اس شخص کے لئے جگہ ہے جو تمہیں بیچ راستے میں بے یار و مددگار تنہا چھوڑ گیا؟ ارے کچھ عرصہ جانور کو ساتھ رکھیں تو اس سے بھی انسیت ہو جاتی ہے اور اس نے تو تمہیں جانور جتنی اہمیت بھی نہیں دی۔ تم اس کے لئے، اس کے لئے خود کو برباد کرو گی۔ میں تمہاری جگہ ہوتی اور میرا شوہر ایسا کرتا تو میں......''

''تو تم اس کی زندگی حرام کر دیتیں۔ اسے عدالت کے کٹہرے میں گھسیٹتیں، گالیاں دیتیں، بددعائیں دیتیں، اپنا حق مہر پیسے کے حوالے سے پائی پائی اس سے وصول کرتیں۔'' اس نے کلثوم کی بات کاٹی اور اس سے زیادہ درشت لہجے میں بولی۔

''تم یہ سب کر سکتی ہو کلثوم! اس لئے کہ تمہاری زندگی میں تمہارے شوہر کے علاوہ بھی بہت لوگ ہیں۔ تمہارے پاس ایک پورا خاندان ہے جس میں ایک رشتے کی کمی دوسرے رشتے پوری کر سکتے ہیں مگر میرے پاس وہی ایک شخص ہے، میرا شوہر میرا واحد رشتہ۔ کیا ہوا جو اسے مجھ سے ویسی محبت نہیں جیسی مجھے اس سے ہے۔ محبت کے نہ ہونے سے ہمارا رشتہ ختم تو نہیں ہو گیا۔ جلد یا بدیر اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گا تو وہ واپس آجائے گا۔''

''اور جب وہ واپس آئے گا تو تم صبح کا بھولا شام کو گھر آئے تو پھر بھولا نہیں کہتے کہہ کر اسے پھر سے سر آنکھوں پر بٹھا لوں گی۔ اس اکیسویں صدی کی ایک مثالی پتی ورتا عورت جو شوہر کی محبت میں خوشی خوشی ستی ہو جائے۔ لعنت ہے ماہا احمد علی تمہارے اس پتی ورتا پن پر۔'' کلثوم نے غصے اور جھنجلاہٹ کے ساتھ اسے گھورا۔

''اور فرض کر لو وہ واپس نہیں آیا۔ نہ جلد نہ بدیر، اگر اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا ہی نہیں پھر؟'' کلثوم کا انداز جرح کرنے والا تھا۔

''ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔ وہ واپس آئے گا، وہ واپس آئے گا کلثوم! میری محبت اتنی بے اثر تو نہیں ہو سکتی۔''
اس کی آواز بھرا گئی اور آنکھیں بھیگنا شروع ہو گئیں۔

''وہ اپنی زندگی میں سے مجھے نکال ہی نہیں سکتا۔ کہتا ہے ''ماہا! تمہاری وجہ سے میری زندگی میں ترتیب ہے۔ اگر تم نہ ہو تیں تو پتا نہیں میرا کیا بنتا۔'' کھوئے کھوئے سے لہجے میں وہ حال کا صیغہ استعمال کر کے یوں بول رہی تھی جیسے وہ دو چار روز کے لئے کہیں چلا گیا تھا اور آج کل میں بس واپس آنے ہی والا تھا۔ اس دیوانی لڑکی کی یہ محبت اور یہ یقین کلثوم کی آنکھوں میں آنسو لے آیا تھا۔ اس نے بے اختیار کھینچ کر اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔

''وہ تمہاری محبت کے لائق نہیں ماہا! مت خوار کرو خود کو یوں۔ جو تمہیں بغیر کسی خطا کے بیچ رستے میں چھوڑ گیا، تمہیں بھلا گیا، اسے تم بھی بھول جاؤ۔''

''بھلا دینا اتنا آسان نہیں ہوتا کلثوم! میں نے اس سے محبت کی ہے۔ اپنے دل کی تمام تر شدتوں اور سچائیوں کے ساتھ۔ تمہیں اپنے دل کی بات بتاؤں کلثوم! جس روز وہ واپس آئے گا کہ ''ماہا! میں تمہارے پاس واپس آ گیا۔'' میں واقعی پچھلی ہر بات بھلا کر اس کے ساتھ اپنی زندگی وہیں سے شروع کر دوں گی۔ جہاں پر ہمارا ساتھ چھوٹا تھا۔'' وہ اپنی دوست کے گلے لگ کر بلک بلک کر رو پڑی تھی اور کلثوم عدنان اس کی پشت پر ہولے ہولے ہاتھ پھیرنے کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتی تھی۔

''ماہا! تم آنٹی کے پاس کیوں نہیں گئیں؟ ایک مہینے سے تنہا رہ رہی ہو، کتنا بڑا خطرہ مول لیا، اکیلی رہتی رہیں۔'' بہت دیر بعد جب وہ اپنے جذبات پر قابو کر پائی تو اس بات کی طرف آ گئی جو اس وقت اس کا سب سے بڑا مسئلہ تھا اور جس کی وجہ سے اس نے کلثوم کو بلایا تھا جو اسے کبھی اپنی ماں، سوتیلے باپ اور بھائی بہن کے متعلق سچ نہیں بتا پائی تو اس کے متعلق سچ کیونکر بتا دیتی جس سے اسے واقعی محبت تھی اور وہ جسے وہ لوگوں کی نگاہوں سے گرتا ہوا کبھی دیکھ نہیں سکتی تھی۔ وہ ممی کے گھر کیوں نہیں گئی، اس بات کو سمجھانے کے لئے وہ بہت پیچھے کی باتوں کی طرف نہیں گئی۔ صرف حال کا ایک وہ تازہ واقعہ سنا دیا جو محض آٹھ روز پہلے پیش آیا تھا۔ ہفتے کی رات ممی، عبداللہ کے ساتھ اس کے فلیٹ پر آ گئی تھیں۔ وہ اسے عبداللہ کی جاب کی یاد دہانی کروانے، اس کا سی وی اور ڈاکیومنٹس دینے آئی تھیں اور وہ غیر



متوقع طور پر انہیں دیکھ کر بوکھلا گئی تھی۔ رات کے ساڑھے بارہ بجے حمیر کی غیر موجودگی اور اپارٹمنٹ میں اپنے تنہا ہونے کا جواز پیش کرنے کے لئے کسی جھوٹ کے بجائے بوکھلاہٹ میں اسے انہیں سچ بتانا پڑا تھا اور سچ سنتے ہی وہ گھبرا کر یوں کھڑی ہو گئی تھیں جیسے انہیں کرنٹ لگ گیا ہو۔ ''ماہا کہیں واپس اُن کے گھر نہ آ جائے۔'' اس نے ان کی آنکھوں میں پھیلے اس خوف کو بڑے آرام سے دیکھ لیا تھا۔ تب اس نے خود نہیں سوچا تھا کہ وہ اپنے اپارٹمنٹ کو چھوڑ کر کہیں اور جائے گی مگر آج حمیر کی فون کال کے بعد اسے پتا چل گیا تھا کہ اب اسے یہاں سے جانا ہے۔ وہ صحیح کہتا تھا، اس کی ممی اتنی ظالم نہیں جتنا وہ انہیں سمجھتی تھی۔ بس اتنا ہی تو تھا کہ ان کے گھر میں اس کے لئے جگہ نہ تھی۔ اس میں ظلم تو کہیں بھی نہیں تھا۔

کلثوم کی آنکھوں میں ایک بار پھر اس کے لئے حیرت اور دکھ ایک ساتھ پھیل گئے تھے۔ ماہا احمد علی، حمیر رضا کو اپنا خاندان اور اپنی فیملی کیوں کہتی تھی، اس کی سمجھ میں آ گیا تھا۔ وہ ممی کی محبت، انکل کی شفقت اور مونا اور عبداللہ کی پیار بھری شرارتیں، کالج اور یونیورسٹی میں سنائے اس کے وہ سارے قصے جھوٹے تھے، کلثوم نے اسے کچھ جتایا نہیں تھا۔

☆☆☆

پاگل آنکھوں والی لڑکی!
اتنے مہنگے خواب نہ دیکھو۔
پچھتاؤ گی!!
سوچ کا سارا اجلا کندن
ضبط کی راکھ میں گھل جائے گا
کچے پکے رشتوں کی خوشبو کا ریشم
کھل جائے گا!
تم کیا جانو؟
خواب، سفر کی دھوپ کے تیشے
خواب، ادھوری رات کا دوزخ
خواب، خیالوں کا پچھتاوا
خوابوں کی منزل رسوائی!
خوابوں کا حاصل تنہائی!!
تم کیا جانو؟
مہنگے خواب خریدنا ہوں تو
آنکھیں بیچنا پڑتی ہیں یا
رشتے بھولنا پڑتے ہیں
اندیشوں کی ریت نہ پھانکو
پیاس کی اوٹ سراب نہ دیکھو

اتنے مہنگے خواب نہ دیکھو!!

تھک جاؤ گی!!

بہت مہنگے خواب دیکھ بیٹھی تھی ماہا احمد علی۔ آج اس کے وہ سارے خواب ٹوٹ کر بکھر رہے تھے۔

"دیکھیں، اس باکس میں بہت قیمتی پینٹنگز اور کرسٹل کے گلدان رکھے ہیں، اسے احتیاط سے رکھیے گا۔"

"اس باکس میں بہت نازک کراکری ہے، دیکھیے گا کہیں ٹوٹ نہ جائے۔" وہ اپنی آنکھوں میں آتے آنسوؤں کو بار بار پیچھے دھکیل کر سامان اٹھاتے ہوئے مزدوروں کو احتیاط سے سب کچھ رکھنے کی تاکید کیے جا رہی تھی۔

"یہ بے جان چیزیں نہیں، یہ میرے خواب ہیں۔ انہیں توڑنا مت۔" اس کی آنکھیں ان سے التجا کر رہی تھیں۔

وہ کلثوم کے والدین کے گھر بطور کرایہ دار شفٹ ہو رہی تھی۔ کلثوم کے میکے کے گھر میں اس کے والدین، بھائی، بھابی اور چھوٹی بہن رہتے تھے۔ خاصا بڑا گھر تھا ان کا۔ اس نے کلثوم کے اور اس کی امی کے منہ سے دو تین مرتبہ یہ بات سنی ہوئی تھی کہ ان کی ضرورت کے لئے تو گراؤنڈ فلور ہی بہت ہے۔ فرسٹ فلور پر بنا ایک کمرہ، اٹیچڈ باتھ اور ایک کچن ان کی ضرورت سے زائد ہے۔ خالی پڑے اس کمرے کو اگر وہ کرایہ پر دے دیں تو جگہ استعمال بھی ہونے لگے گی اور کچھ پیسے بھی مل جائیں گے۔ ان کے گھر کا چونکہ گیٹ ایک ہی تھا اور فرسٹ فلور پر جانے کے لئے سیڑھیاں بھی گھر کے اندرونی حصے سے ہی جاتی تھیں، اس لئے وہ کسی قریبی جان پہچان والی چھوٹی سی فیملی کو وہ کمرہ کرایہ پر دینا چاہتے تھے۔

اس نے اس روز کلثوم سے وہ کمرہ کرایہ پر لینے کی بات کی تھی۔ وہ کتنے کرایہ پر کمرہ دینا چاہتے تھے، یہ اس کے علم میں تھا۔ کلثوم کو سب کچھ سچ بتا دینے کے بعد اس نے اس سے وعدہ لیا تھا کہ وہ یہ ساری سچائی کسی اور کو نہیں بتائے گی۔ اپنے شوہر کو بھی نہیں، اپنے والدین کو بھی نہیں۔

پھر ایک جھوٹی کہانی ماہا احمد علی کے پاس تیار تھی۔ اس کا شوہر مزید تعلیم حاصل کرنے امریکہ گیا ہوا ہے۔ اس کے پیچھے گھر میں وہ اکیلی تو نہیں رہ سکتی اور چونکہ اس کا شوہر خوددار اور غیرت مند بہت ہے، اسی لئے اسے اتنے لمبے عرصہ تک اپنی بیوی کا اس کے میکے میں رہنا کسی صورت گوارا نہیں۔ سو اسی خودداری اور غیرت مندی کے سبب وہ ان کے گھر بطور کرایہ دار رہنا چاہتی ہے۔ یوں اس کے شوہر کی خودداری پر کوئی آنچ بھی نہیں آئے گی اور وہ کسی انجان جگہ اور تنہا رہنے جیسی مشکلات کا شکار بھی نہیں ہو گی کہ کلثوم کی فیملی اس کی دیکھ بھال ہے اور اس کے شوہر کو بھی ان پر پورا بھروسہ ہے۔

اپارٹمنٹ سے سامان شفٹ ہوتے وقت کلثوم اس کے ساتھ سارا وقت رہنا چاہتی تھی۔ اپنا محبتوں سے بسایا گھر اجڑتا، بکھرتا اور خالی ہوتا دیکھنا کسی عورت کے لئے سہل نہیں ہوتا، مگر گھر، شوہر، بچے وہ انہیں نظر انداز کر کے پورا دن اس کے ساتھ نہیں رہ سکتی تھی۔ ماہا نے اسے خود واپس جانے کا کہا تھا۔

آہستہ آہستہ وہ گھر خالی ہوتا چلا گیا جس میں دو سال اور آٹھ مہینے پہلے اس نے حمیر رضا کے ساتھ ایک نئی زندگی کی ابتداء کرتے ہوئے قدم رکھا تھا۔ یہاں قدم قدم پر اس کے خواب بکھرے ہوئے تھے۔ آج اس کے خواب اس سے چھن رہے تھے۔ آج اس کا گھر اس سے چھن رہا تھا۔ وہ لمحے وہ یادیں اور وہ سارے خواب، سب رزقِ خاک ہونے جا رہے تھے۔ وہ خالی اپارٹمنٹ میں اکیلی کھڑی تھی۔



اس کی زندگی کا وہ چوتھا گھر اس سے چھن گیا تھا جسے پورے یقین اور اعتماد کے ساتھ اس نے اپنا مان لیا تھا اور اپنا بنا لینے کے بعد اسے بہت پیار سے، دن رات محنت کر کے بنایا تھا۔ ایک گھر، ایک دریچہ، ایک پیار بھری چھاؤں، ان سب کے خواب دیکھتی ماہا احمد علی ایک بار پھر بے گھر ہوئی تھی۔

☆☆☆

ہم اکیلے ہیں، چاہے اس اکیلے پن میں ہمارا اپنا کوئی قصور نہیں پھر بھی معاشرے کے مروجہ اصولوں کے تحت لوگوں کی نگاہوں میں اپنی عزت اور اپنا بھرم قائم رکھنے کے لئے ہمیں اپنا اکیلا پن چھپانا پڑتا ہے۔ وہ بھی لوگوں سے اپنے اکیلے پن کو چھپائے زندگی کو جینے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ ممی کے گھر واپس نہیں گئی اور اپنا رہنے کا کہیں اور انتظام کر لیا تو انہوں نے بھی اس سے کنی کترانا اور نظر انداز کرنا چھوڑ دیا۔ وگرنہ اس سے پہلے عبداللہ کی جاب کے حوالے ہی سے کچھ پوچھنے کے لئے اس نے وہاں صرف فون ہی کیا تو وہ اس کی آواز سنتے ہی پریشان ہو جاتی تھیں۔ وہ ان کے گھر پڑاؤ نہیں ڈالنے والی اور یہ کہ اس نے عبداللہ کو اپنی کمپنی میں جاب بھی دلوا دی ہے، ان دونوں باتوں کے سبب مظہر انکل تک اس سے کافی بہتر انداز میں بات کرنے لگے تھے۔ عبداللہ کی جاب کا ہو جانے کے بعد جب ممی، عبداللہ، مونا اور اس کا شوہر مٹھائی اور کچھ تحفے تحائف لے کر اس سے ملنے گھر پر آئے تو کلثوم کے گھر والوں کی نظروں میں اپنی عزت اور بھرم قائم رہنے کے احساس نے اسے بے حد اطمینان دلایا۔

عبداللہ چونکہ اس کے انڈر میں کام کر رہا تھا، اس لئے وہ خصوصاً اس کے ساتھ بہت اچھا رویہ اختیار رکھنے لگا تھا۔ وقتاً فوقتاً وہ اس سے ملنے آ جاتا۔ اسے کہیں جانا ہوتا تو ساتھ لے جانے کے لئے اپنی خدمات پیش کر دیتا اور وہ قصداً اسے انکار نہ کرتی۔ لوگوں کو جو نظر آ رہا ہوتا ہے، وہ اس پر یقین بھی کر لیتے ہیں۔ صبح سے شام تک آفس اور آفس کے بعد وہ ایک کمرہ۔ اس کی زندگی ان دنوں اس طور گزر رہی تھی۔

☆☆☆

کلثوم کی چھوٹی بہن غزل کی شادی کا سلسلہ تھا۔ آفس کی مصروفیات کے علاوہ اس کے پاس جب بھی وقت ہوتا وہ شادی کی تیاریوں میں ان لوگوں کے ساتھ شریک ہو جاتی ان آٹھ مہینوں میں آنٹی اور انکل نے اسے گھر کا فرد ہی سمجھا تھا۔

خلوص اور محبت اکثر وہاں سے نہیں ملتا جہاں سے ہمیں امید ہوتی ہے اور جہاں سے کبھی امید رکھی ہی نہ ہو۔ کبھی کبھی وہاں سے مل کر انسان کو جینے کی نئی آس دینے لگتا ہے۔ فائز کی یہ سگی پھوپھو کا گھر تھا، سو وہ اکثر یہاں آتا رہتا تھا اور ان دنوں چونکہ شادی کی تیاریوں کا مرحلہ درپیش تھا تو وہ پہلے سے بھی زیادہ یہاں آ رہا تھا۔ آفس میں اب اس سے ملنا اس لئے نہیں ہوتا تھا کہ اپنے پاپا کی ناراضیوں اور خفگیوں پر کان دھرتے بالآخر اس نے ان کی کمپنی جوائن کر لی تھی۔ فائز کی یہ بات اسے اچھی لگتی تھی کہ ایک امیر اور بااثر و بااختیار شخص کا بیٹا ہونے کے باوجود اس میں اپنی امارت پر غرور کے بجائے سادگی تھی۔

یونیورسٹی میں جب کلثوم کے حوالے سے وہ شروع شروع میں اس سے ملی تو اس کی کسی بات سے اسے یہ اندازہ نہ ہو سکا کہ وہ ایک بزنس ٹائیکون کا لاڈلا اور اکلوتا بیٹا ہے۔ تب کلثوم ہی نے ایک بار فائز کے پاپا کی کمپنی اور ان

کے اسٹیٹس کے متعلق بتا کر اسے حیران کر دیا تھا اور تب اس نے یہ سمجھا تھا کہ وہ اپر کلاس سے تعلق رکھنے والا ایک ایسا انسان ہے جسے اپنی دولت، اپنی حیثیت اور اپنے مقام پر قطعاً کوئی غرور یا اکڑ نہیں۔ کلثوم کا گھرانہ ایک کھاتا پیتا خوشحال گھرانہ کہلایا جا سکتا تھا مگر پھر بھی ان کے اور فائز کے گھرانے کے اسٹیٹس میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ اسٹیٹس کے اس فرق کے باوجود بھی وہ اپنی پھوپھو کے گھر خوب آتا۔ نہ صرف وہ بلکہ اس کے مما، پاپا اور چھوٹی بہن آمنہ بھی آنٹی، انکل کے ہاں ہر خوشی کے موقع پر پوری خوشی کے ساتھ شرکت کے لئے موجود ہوا کرتے۔

اس روز بھی ایسا ہی ایک دن تھا جب شام کے وقت فائز ان لوگوں کو شاپنگ کرانے لے کر آیا ہوا تھا۔ غزل کو ماہا کی پسند پر بہت بھروسہ تھا، اس لئے وہ اپنی زیادہ تر شاپنگ اسی کے مشورے سے کرنا چاہتی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ بھابی بھی ان لوگوں کے ساتھ موجود تھیں۔ وہ لوگ خریداری کر رہی تھیں اور فائز گاڑی میں بیٹھ کر ان کی شاپنگ ختم ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ شاپنگ ان کی تقریباً ساری ہو چکی تھی۔

”آپ لوگ جا کر دکان سے کپڑے لے آئیں، مجھے ذرا یہاں ایک شاپ پر کچھ کام ہے۔ آپ لوگ فارغ ہو کر گاڑی کے پاس چلے جائیے گا، میں بھی وہیں آ جاؤں گی۔“ اس نے ان دونوں سے کہا اور پھر جیسے ہی وہ دونوں آگے بڑھیں، وہ بچوں کی اس دکان میں آ گئی جہاں نیو بورن بے بیز کے کپڑوں سے لے کر دیگر تمام سامان تک کی وسیع اور امپورٹڈ رینج موجود تھی۔ وہ بھابی کو ان کے پہلے بچے کی پیدائش پر کچھ اچھا سا تحفہ دینا چاہ رہی تھی۔ اس طرح کی دکانوں کو دیکھ کر جس طرح کی حسرت اور ادھورا پن اس کے اندر ہمیشہ پھیل جایا کرتا تھا۔ آج بھی پھیل گیا تھا۔

کاش..... کاش وہ بھی..... شیشے کا دروازہ کھول کر وہ اندر داخل ہوئی اور ہمیشہ کی طرح اپنے اندر حسرتیں اور اداسیاں پھیلتی دیکھیں۔ سامنے وہ جو بہت چھوٹا سا پنک فراک ہینگر میں لٹک رہا تھا اور اس کے ساتھ جو پنک ہیٹ اور چھوٹے چھوٹے سے پنک جوتے بھی نظر آ رہے تھے، وہ انہیں دیکھ کر رک گئی اور ادھر جو کاؤنٹر کے سامنے کھڑی لڑکی جو شاید اپنے شوہر کے ساتھ تھی جس طرح مدر کیئر اور دیگر مختلف برانڈز کی چیزیں دیکھ دیکھ کر ریجیکٹ کئے جا رہی تھی، اپنے ہونے والے بچے کے لئے اچھی سے اچھی چیز خریدنے کی چاہ میں۔ شاید وہ بھی ایسا ہی کرتی، نجانے کتنی بار اس نے بڑی امیدوں کے ساتھ وہ منظر تصور کی آنکھ سے دیکھا تھا جب وہ ماں بننے والی ہوگی۔ جب وہ اپنے ہونے والے بچے کی حمیر کے ساتھ مل کر شاپنگ کرے گی۔ اسے بچوں کی کتنی خواہش ہے یہ بات حمیر اچھی طرح جانتا تھا۔

”ہم اپنی بیٹی کا نام امل رکھیں گے۔“ ایک بار باتوں کے دوران اس نے حمیر سے کہا تھا۔

”نہیں بھئی، بیٹی مجھے نہیں چاہئے۔ پال پوس کر بڑا کرو، پڑھاؤ، لکھاؤ اور پھر کسی اور کو دے دو۔ مجھے بیٹا چاہئے اور اپنے بیٹے کا نام ہم روجان رکھیں گے۔“ اس کے کانوں میں اس رات کی ان دونوں کی وہ آوازیں یوں گونج رہی تھیں جیسے کل رات ہی انہوں نے آپس میں باتیں کی ہوں اور پھر بے ساختہ ہی پنک فراک کو اس کی تمام تر خوبصورتی کے باوجود اس نے نظر انداز کیا اور Baby Girls والے سیکشن سے Baby Boys والے حصے کی طرف آ گئی۔

”حمیر! یہ بلینکٹ دیکھو، کیسا لگ رہا ہے؟“ وہ اس آواز پر نہیں اس نام پر چونکی تھی۔ دنیا میں حمیر نام کے لاکھوں لوگ ہوں گے پھر بھی یہ نام ہر بار دل کے تاروں کو ہلا کر رکھ دیا کرتا تھا، وہ بے ساختہ پوری کی پوری گھومی تا کہ اس آواز اور اس کے مخاطب دونوں کو دیکھ سکے اور دیکھنے پر جو اسے نظر آیا، اس کی وہ ہرگز ہرگز توقع نہیں رکھتی تھی۔ وہ



دونوں اس سے چند قدم کی دوری پر کاؤنٹر کے سامنے کھڑے تھے۔ وہ دونوں اس کے بالکل سامنے تھے مگر اپنی خریداری اور گفتگو میں اتنے مشغول کہ انہیں سر اٹھا کر ادھر ادھر دیکھنے کی فرصت نہیں تھی۔

اسے کھڑے ہو کر کسی حساب کتاب کی ضرورت نہیں تھی، اس نے جن مہینوں کے لاتعداد دنوں اور راتوں کو کانٹوں پر گزارا تھا، وہ ان کی تعداد بغیر گنے بتا سکتی تھی۔ بتا سکتی تھی کہ اس لڑکی سے اس کے شوہر کی شادی کو آٹھ مہینے اور ستائیس دن ہو چکے ہیں اور وہ کتنے مہینوں کی پریگننٹ تھی، یہ اس کی حالت دیکھ کر ہی پتا چل رہا تھا۔ وہ دو سال اور سات مہینوں تک جس دن کے انتظار میں پل پل تڑپی، اس دن کا اس دوسری لڑکی کو چند مہینے بھی انتظار نہیں کرنا پڑا۔ یہ تھا ماہا احمد علی اور سدرہ آفاق کی اوقات کا فرق۔ اس شخص کی نگاہوں میں ان کے مقام اور ان کی حیثیت کا فرق۔ اس شخص کی نظروں میں اس کی کیا حیثیت ہے، یہ جاننے میں اتنی دیر لگائی؟ اسے اس کے پاس کبھی واپس نہیں آنا، یہ جاننے میں اتنی دیر لگائی؟

”وہ اپنی زندگی میں سے مجھے نکال ہی نہیں سکتا۔ میرے بغیر تو اس کی صبح نہیں ہو سکتی۔“ اس کے بغیر اس کی صبح، دوپہر، شام اور رات سب ہو رہی تھیں اور بہت خوب ہو رہی تھیں۔ اسے اپنی زندگی سے نکال کر وہ بہت خوش، بہت مطمئن اور بہت آسودہ تھا۔ اس کی زندگی میں خوشگوار تبدیلیاں آ رہی تھیں۔ وہ باپ بننے والا تھا اور اس کے بچے کی ماں ماہا احمد علی نہیں، ایک دوسری عورت تھی۔

اسے ماں بننے کے حق سے محروم رکھ کر جس سے اسے محروم رکھنے کا کسی کو بھی کوئی حق نہیں تھا، وہی حق اس شخص نے ایک دوسری عورت کو اتنی آسانی سے دے دیا تھا۔

وہ خود کو اس کی شریک حیات کہتی تھی۔ غلط، بالکل غلط۔ وہ فقط اس کی شریک اپارٹمنٹ تھی۔ جیسی زندگی وہ جینا چاہتا تھا، اسے گزارنے میں اس کی مددگار و معاون۔ اپنا اپنا کماؤ، اپنا اپنا کھاؤ۔ ہاں واقعی وہ امریکن اسٹائل ہی کی تو زندگی تھی۔ کوئی کسی پر بوجھ نہیں، اپارٹمنٹ کا کرایہ اور بلز میں پے کروں گا تو باقی کھانا پینا، رہنا سہنا، گھر کی زیبائش و آرائش اور دیگر تمام اخراجات تمہارے ذمہ۔ تب ہی جب وہ اپنی کمائی کے پیسوں سے اس کی شیونگ کا سامان اور دوسری چیزیں لے آتی وہ بھولے سے اس کا شکریہ ادا نہیں کرتا تھا۔ وہ اس کا احسان مند کیوں ہوتا وہ اس کے اپارٹمنٹ میں رہتی تھی۔ اس کا فون، بجلی اور گیس استعمال کرتی تھی جس کا بل وہ ادا کرتا تھا۔

ڈاکٹر اعجاز ارشد کے آفس میں ملی اس لڑکی سے اس کے دل نے نہیں، دماغ نے شادی کا فیصلہ کیا تھا۔ ایک ذہین اور قابل لڑکی جو عنقریب ایم بی اے کر لینے والی تھی اور جو اپنے لباس اور اپنے ہر انداز سے کسی مڈل کلاس گھرانے کی نظر آ رہی تھی۔ اپنے اعلیٰ تعلیم اور فارن بینک میں ملازمت کے باوجود اس کے پاس کوئی مضبوط فیملی بیک گراؤنڈ نہیں تھا اور اس کمزور فیملی بیک گراؤنڈ کے ساتھ اونچے گھرانے کی کوئی لڑکی اسے ملنے کے آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔ تب یہ نہیں معلوم تھا کہ کسی مضبوط فیملی بیک گراؤنڈ کے بغیر بھی ایک روز اسے سدرہ آفاق جیسی بڑے باپ کی بیٹی مل سکتی ہے۔ تب کے حالات کے لحاظ سے ماہا احمد علی ایک بہترین چوائس تھی۔ جیسا لائف اسٹائل اسے پسند تھا، فارن بینک میں جاب اور بہت اچھی سیلری کے باوجود وہ تن تنہا اسے افورڈ نہیں کر سکتا۔

کیا قسمت تھی اس شخص کی۔ وہ لوگوں کو چیزوں کی طرح استعمال کرتا تھا، ان لوگوں کو بھی جو کسی نہ کسی

حوالے سے اس سے محبت کرتے تھے اس سے بہت پیار کرنے والا اس کا بڑا بھائی جیسے غلام عباس، اس کا برے دنوں کا بہت مخلص دوست۔ جب تک بھائی کی ضرورت تھی اسے استعمال کرتا رہا۔ جب تک دوست کی ضرورت تھی اسے استعمال کرتا رہا اور جب ضرورت پوری ہوگئی تو اپنی زندگی سے نکال کر باہر پھینک دیا اور بالکل اسی طرح ماہا احمد علی کے ساتھ ہوا تھا۔

سدرہ آفاق مل گئی تو اسے بالکل اسی طرح دھتکار دیا گیا جیسے اپنے بھائی اور دوست کو دھتکارا تھا اور جیسے نجانے کتنے اور سادہ لوگوں کو دھتکارا ہوگا۔ دو سال اور سات مہینوں کے ساتھ میں اس نے ایک دن بھی ماہا احمد علی کو خود پر بوجھ نہیں بننے دیا۔ اپارٹمنٹ کا کرایہ اور گیس، بجلی وفون کے بلز پے کرنے کے علاوہ اس کی باقی ساری کمائی کہاں جاتی ہے، ماہا کو کبھی نہیں بتایا گیا۔

قسمت ہے نا اس شخص کی کہ وہ اپنے مقاصد کے حصول کے لئے لوگوں کو استعمال کر رہا ہوتا ہے اور وہ خوشی خوشی خود کو استعمال کروانے کے ساتھ اس سے محبت بھی کئے جاتے ہیں۔

''وہ واپس آئے گا کلثوم! میری محبت اتنی بے اثر تو نہیں ہوسکتی۔'' اس کی سمجھ میں نہیں آیا، وہ اپنی خوش فہمیوں پر ہنسے یا روئے۔ اتنا یقین اس شخص کے بارے میں جسے نہ اس سے محبت تھی، نہ انسیت۔ یہاں تک کہ ہمدردی بھی نہیں۔ اس کی محبت بے اثر بھی تھی، بے تاثیر بھی۔ بے فیض بھی اور لاحاصل بھی۔ وہ ایک پتھر کی محبت میں مبتلا تھی جس میں دل اور جذبات نام کی کوئی موجود ہی نہیں تھی۔

اسے حمیر رضا سے زیادہ خود اپنے آپ سے نفرت ہوئی۔ وہ اس شخص کی محبت میں پاگل، دیوانی اور اندھی ہو چکی تھی۔ اس شخص کو جو انسانیت کی سطح سے اتنا نیچے گرا ہوا ہے جو اتنا خود غرض اور اس حد تک کمینہ ہے، اس کی؟

''کلثوم! تم جس شخص کو برا کہتی ہو، وہ تمہاری سوچ سے بھی زیادہ پست، گھٹیا اور نیچ ہے۔'' اس نے دیکھا وہ اپنا والٹ نکال کر اس میں سے ہزار ہزار کے کئی نوٹ دھڑ دھڑ نکال کر اس لمبی چوڑی خریداری کے بل کی پے منٹ کر رہا تھا جو بڑے باپ کی اس بیٹی کو اس نے کروائی تھی۔ یہ حمیر رضا کی ایک انوسٹمنٹ تھی نا۔

سیلز مین سے کچھ بات کرتے کرتے سدرہ آفاق کی نظر اس پر پڑی تو وہ اپنے شوہر سے آہستہ آواز میں کچھ بولی۔ شاید یہ کہ ''وہ دیکھو سامنے کھڑی لڑکی کتنے غور غور سے آنکھیں پھاڑ کر ہم دونوں کو دیکھ رہی ہے۔'' سدرہ کی بات پر دھیان دیتے حمیر نے والٹ جیب میں واپس رکھتے ہوئے سر اٹھا کر سامنے دیکھا اور ماہا نے دیکھا کہ وہ اسے دیکھ کر ساکت رہ گیا ہے۔ کچھ الجھن، کچھ ناگواری، کچھ بیزاری یہ تمام تاثرات بیک وقت اس کے چہرے پر پھیلے تھے۔ اسے یقیناً اس سے یہ خطرہ لاحق ہوا تھا کہ وہ اپنی عادت کے مطابق رونا دھونا مچا کر پھر اس کے پیروں میں گرنے کی کوشش کرے گی۔

''حمی! تم مجھے چھوڑ کر کیوں چلے گئے۔ پلیز واپس آجاؤ۔'' جیسی کچھ التجائیں اس کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کرے گی۔

حمیر رضا کی آنکھوں میں ''کہیں کوئی تماشا نہ ہو جائے'' کا خوف دیکھ کر اس کا واقعی جی چاہا کہ وہ یہاں اسی دکان میں ایک سین کری ایٹ کرے مگر کیا کرتی کہ ماہا احمد علی تماشے کر لینے والی لڑکی تھی نہیں۔ اگر واقعی ایسی ہوتی تو



اس کے منہ پر کھینچ کر دو تین طمانچے مارتی جس نے اس کی محبت، اس کے خلوص، اس کی سادگی اور اس کی وفاؤں کا مذاق اڑایا۔ کاش وہ کوئی تماشا کر پاتی۔

''تم یہاں کھڑی ہو؟'' اور وہاں بھابی اور غزل مجھ سے آکر پوچھ رہی ہیں کہ ماہا کہاں ہے۔'' اس نے اپنے پیچھے فائز کی آواز سنی۔ وہ اسے دیکھ کر دور سے ہی بولتے ہوئے اس کے قریب آگئی۔ اپنے چہرے کے تاثرات کو ہر ممکن حد تک نارمل رکھنے کی کوشش کرتے وہ اس کی طرف مڑی۔

''میں بس یہاں سے نکل ہی رہی تھی۔ چلو۔'' فائز نے اس کی بات پر توجہ نہیں دی تھی۔ اس کی نگاہیں سامنے کھڑے اس خوبصورت سے جوڑے پر تھیں جو خوشی سے سرشار اپنے پہلے پہلے بچے کی شاپنگ کر کے ابھی فارغ ہوئے ہی تھے۔

''ہائے فائز!'' سدرہ آفاق نے وہیں سے مسکرا کر فائز کو ہیلو کہا تو وہ فوراً ہی چند قدموں کا فاصلہ عبور کر کے ان دونوں کے قریب پہنچ گیا۔

''ہیلو سدرہ! کیسی ہو؟''

''بالکل ٹھیک۔'' پھر اسے حمیر سے ملوانے لگی۔

''میرے مسبینڈ حمیر رضا۔''

''تمہیں تعارف کروانے کی ضرورت نہیں، میں انہیں بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔'' فائز کے مسکراتے اور خوش اخلاقی سے بھرپور لہجے میں چھپی طنزیہ کاٹ اتنی واضح تھی کہ سدرہ آفاق نے چونک کر اسے دیکھا جبکہ حمیر نے جز بز ہوتے اپنی ناگواری کو بمشکل خوش اخلاقی کے پردے میں چھپایا۔ وہ فائز کو ماہا کے دوست کی حیثیت سے شاید ہی پہچانتا ہو کہ دوستی کے معاملے میں اسے ماہا کے معیار سے شدید اختلاف رہا کرتا تھا۔ وہ اسٹیٹس دیکھے بغیر ٹٹ پونجیوں کو دوست بنا لیتی تھی۔

تب وہ اس بات کو سمجھی نہیں تھی۔ اگر سمجھتی تو حمیر رضا کو فائز کے ذکر کے دوران یہ ضرور بتاتی کہ فائز عبید ایک بزنس ٹائیکون کا اکلوتا بیٹا ہے پھر وہ اس کے دوست سے یقیناً فوراً ملنے کے لئے تیار ہو جاتا۔ اس وقت اسے ماہا کے ساتھ دیکھ کر ظاہر ہے۔ اس نے یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ اس کا کوئی قریبی دوست ہے۔

''میرا مطلب ہے، تمہاری شادی پر میں حمیر صاحب سے مل چکا ہوں۔'' فائز نے مسکراتے ہوئے اپنے جملے کی وضاحت کی۔ وہ ابھی بھی طنزیہ نگاہوں ہی سے مسکراتے ہوئے حمیر کو دیکھ رہا تھا۔

''ارے میں نے آپ دونوں کو اپنی دوست ماہا حمیر رضا سے تو ملوایا نہیں۔'' اس نے ماہا حمیر رضا کہتے ہوئے ایک ایک لفظ بہت چبا چبا کر ادا کیا۔

''بہت چڑتی ہے۔ اگر کبھی اسے اس کے شادی سے پہلے والے نام ماہا احمد علی سے بلاؤں۔'' وہ حمیر کی ناگواری اور کوفت اور سدرہ کی حیرت و اچنبھے کو انجوائے کرتے ہوئے مسکرایا اور پھر گردن گھما کر وہاں دیکھا جہاں وہ کھڑی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ ان دونوں نے بھی وہیں دیکھا تھا۔ وہ جگہ خالی تھی۔ ان کی باہم گفتگو کے دوران ہی وہ وہاں سے نکل کر جا چکی تھی۔

''لو ماہا تو چلی بھی گئی۔ چلو خیر، کوئی بات نہیں پھر کبھی آپ دونوں کو اس سے ملواؤں گا...... بہت اچھی لڑکی ہے، بس ایک ہی خرابی ہے اس میں۔ اسے لوگوں کی پہچان نہیں۔ سب کو اپنے جیسا سچا اور مخلص سمجھتی ہے۔'' حمیر کے چہرے سے اب رسمی سی مسکراہٹ بھی مکمل طور پر رخصت ہو چکی تھی۔ وہ اب واضح برہمی اور غصے سے فائز کو دیکھ رہا تھا۔

جبکہ سدرہ سب کچھ سمجھ لینے کے بعد اس بگڑتی صورتحال کو اپنے قابو میں کرنے اور فائز عبید کی مسلسل چلتی منہ پھٹ زبان کو خاموش کرانے کی کوشش کر رہی تھی مگر فائز عبید اس کی کوششوں سے نہیں، اپنی مرضی سے خاموش ہوا تھا۔ اسے جو کہنا تھا وہ کہہ چکا تھا، اسی لئے سدرہ سے خدا حافظ کہتے ہوئے اس نے حمیر کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

''امید ہے آپ کو مجھ سے مل کر خوشی ہوئی ہوگی۔'' حمیر نے بحالت مجبوری اس سے ہاتھ ملایا تھا۔

وہ اپنی گاڑی کے پاس پہنچا تو وہاں ماہا، بھابی اور غزل کے ساتھ ہنسنے اور باتیں کرنے میں مصروف تھی۔ اس کی مسکراہٹ دیکھ کر کوئی کہہ ہی نہیں سکتا تھا کہ ابھی کچھ دیر پہلے وہ کن لوگوں سے ملی ہے، اس کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ اپنی دوست کے اس دکھ پر بے انتہا دکھ محسوس کرنے کے باوجود اسے اس پر نئے سرے سے شدید غصہ آیا۔ وہ دوستوں کے خلوص کو پہچانتی ہے، اسے جانتی اور مانتی بھی ہے مگر پھر بھی وہ اپنے دکھ کسی اور سے تو کیا دوستوں سے بھی شیئر کرنا گوارا نہیں کرتی۔

''فائز تم......'' گھر پہنچنے کے بعد وہ قصداً گاڑی سے سب سے آخر میں اتری اور جیسے ہی غزل اور بھابی گیٹ میں گھسیں، اس نے فائز کو مخاطب کیا۔

''بے فکر رہو، میں یہ بات کسی کو نہیں بتاؤں گا۔'' فائز نے چڑ جانے والے انداز میں اس کی بات کاٹ دی۔

''نہیں، میں یہ نہیں کہہ رہی۔''

''پھر یہ پوچھنا چاہتی ہو گی کہ مجھے یہ سب کب سے معلوم ہے اور میں سدرہ کو کیسے جانتا ہوں۔ میں اسے بچپن سے جانتا ہوں۔ میں نے اور اس نے امریکہ میں ایک ہی اسکول میں پڑھا ہے، اس کی ممی کی میری مما کے ساتھ دوستی ہے اور یہ کہ میں نے اس کی شادی میں شرکت بھی کی تھی اور دولہا کی حیثیت ...... حمیر رضا کو دیکھ کر میں ساکت رہ گیا تھا۔ تب تمہاری آفس سے غیر حاضری کی وجہ میری سمجھ میں آئی تھی۔ میں اسی رات کلثوم کے گھر گیا، یہ سوچ کر کہ شاید وہ یہ سب کچھ پہلے سے جانتی ہوگی مگر اسے تو کچھ بھی معلوم نہیں تھا پھر میں نے بھی اسے کچھ نہیں بتایا اور خاموشی سے وہاں سے آ گیا۔ تم نے نہ کلثوم کو بھروسے کے قابل سمجھا نہ مجھے۔ تم آفس سے طویل چھٹی لے کر گھر پر بند تھیں، میرا کتنی بار دل چاہا کہ میں کلثوم کو ساتھ لے کر تمہارے پاس آؤں۔ ہم دونوں مل کر تمہارا دکھ شیئر کریں۔ لیکن اگر میں ایسا کرتا تو تمہیں تو یہی لگتا کہ تمہارے دوست تمہارا غم بانٹنے نہیں بلکہ مزا لینے آئے ہیں۔ جب تم ایسا سمجھتی تھیں تو بس میں خاموش ہو گیا۔ حالانکہ کتنی بار میرا دل چاہا کہ تم سے کہوں، ایک بار اپنے دوستوں کے پاس بیٹھ کر آنسو بہا لو اور خبردار پھر کبھی مت رونا۔ اس شخص کے لئے ہرگز نہیں۔'' وہ شخص تو نہیں ہاں اپنے دوست کا خلوص ضرور اس کی آنکھوں میں آنسو لے آیا تھا۔

''فائز، آئی ایم سوری اگر میں نے تمہیں ہرٹ کیا۔ مجھے تم پر اور کلثوم پر، اپنے دوستوں پر پورا بھروسہ ہے اور میں یہ بات بہت اچھی طرح جان گئی ہوں کہ اگر خونی و شرعی رشتوں کے حوالے سے میں محروم رکھی گئی ہوں تو مجھے



اتنے مخلص دوست دے کر کاتب تقدیر نے ان ساری محرومیوں کا ازالہ بھی کر دیا ہے۔'' اس پل اس نے فائز سے اپنے آنسو نہیں چھپائے تھے۔

☆☆☆

پھر اس رات جب وہ سونے لیٹی تو ہر رات کی طرح اپنے قریب ایک وجود کی کمی محسوس نہیں کی، اپنے گرد ان بانہوں کا سہارا نہیں تلاشا۔ نہ ہر رات کی طرح کروٹیں بدل بدل کر خود ہی روئی اور خود ہی خاموش ہوئی نہ اس کی تصویر کو اپنے پہلو میں رکھا نہ اس سے باتیں کیں نہ یہ کہا کہ جب مجھے تمہارے بغیر نیند نہیں آتی تو تمہیں میرے بغیر کیسے آتی ہوگی؟ اس کی آنکھیں پانیوں سے بھری تھیں مگر اس شخص کی محبت میں نہیں، اپنی تذلیل، اپنی ذلت اور اپنی بے عزتی کے احساس پر، اپنے جذبوں کے بے توقیر ہونے پر نو مہینے جس انتظار میں اس نے پل پل جیتے اور مرتے گزارے وہ انتظار آج سے ختم ہوا۔ اس نے اس کی وہ تصویر جو وہ ہر وقت اپنے پاس رکھتی تھی پرزے پرزے کر ڈالی۔

''جیسے تم نے مجھے اپنی زندگی سے کٹ کیا، ایسے ہی آج میں بھی تمہیں کر رہی ہوں۔ آج سے تم میرے لئے مر چکے حمیر رضا! میں تم سے نفرت کرتی ہوں۔ شدید نفرت اور میری یہ نفرت مرتے دم تک قائم رہے گی۔ میں تمہیں کوئی بددعا نہیں دے رہی، ہاں، مگر میں تمہیں کبھی معاف بھی نہیں کروں گی۔ قیامت تک نہیں، روز حشر تک نہیں۔''

وہی ماہا احمد علی تھی، وہی اس کی زندگی، وہی اس کے روز و شب، وہی اس کا آفس اور وہی اس کا ایک کمرے پر مشتمل گھر اور تنہا زندگی۔ فرق تھا تو یہ کہ اب اسے کسی کا انتظار نہیں تھا۔ اب اس کی کوئی صبح اس سوچ سے شروع نہیں ہوتی تھی کہ شاید آج وہ واپس آ جائے اور نہ کوئی رات یہ سوچتے کہ کیا پتا آنے والی اگلی شب وہ اس کے پاس ہو۔ زندگی کے دن، رات اور اس کے معمولات سب ویسے ہی تھے تبدیلی صرف اس کی سوچوں میں آئی تھی اب وہ اپنے اندر مر جانے والی زندگی کو پھر سے زندہ کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ زندگی کو جینا چاہتی تھی وہ اپنی جاب میں اتنی بے تحاشا محنت کرنے لگی تھی کہ اس کے کولیگز اس کے نہ تھکنے پر حیران رہ جایا کرتے تھے۔ اپنی پروفیشنل قابلیت میں اضافے کے لئے وہ شہر کے بہترین انسٹی ٹیوٹس کے ایوننگ پروگرامز میں انٹرنیشنل بزنس ایڈمنسٹریشن، فنانشل پروگرامنگ اینڈ پالیسیز، ہیومن ریسورس مینجمنٹ وغیرہ سے متعلق اسپیشلائزڈ اور پروفیشنل کورسز کئے جا رہی تھی۔ وہ کورسز جہاں اس کی قابلیت کو بڑھا رہے تھے، وہیں اس کا اعتماد بحال کرنے کا کام بھی کر رہے تھے اور اسے رات گئے تک خود کو مصروف رکھنے کا موقع بھی فراہم کر رہے تھے۔ اب شام میں آفس سے فارغ ہونے کے بعد بھی وہ فارغ نہیں ہوتی تھی۔ اپنے کورسز اٹینڈ کرنے جا رہی ہے، لائبریری میں بیٹھ کر پڑھ رہی ہے اور رات میں اپنے کمرے میں بہت دیر تک جاگ کر کتابوں اور انٹرنیٹ کا سہارا لے کر وہ سب سمجھنے کی کوشش کر رہی ہے۔ جو لیکچر کے دوران سمجھ میں نہیں آتا تھا۔

اب وہ پہلے کی طرح اندھا دھند پیسے نہیں خرچ کرتی تھی۔ بلکہ بہت سوچ سمجھ کر باقاعدہ پلاننگ کر کے اپنی تنخواہ خرچ کرتی۔ ایک بار ٹھوکر کھائی تھی، ایک بار غلطی کی تھی، بار بار تو اسے نہیں دہرا سکتی تھی۔ اب اس کے دو مختلف بینکس میں الگ الگ اکاؤنٹس تھے۔ اپنی بہت شاندار سی سیلری کا وہ صرف اتنا حصہ استعمال کرتی جتنا اسے اپنے پروفیشنل کورسز کرنے اور ان کورسز سے متعلق مہنگی کتابیں خریدنے کے لئے درکار ہوتا۔ ہاں ایک اضافی خرچا اس نے لیپ ٹاپ خریدنے کا ضرور کیا تھا کہ وہ گھر پر پڑھنے اور کام کرنے کے لئے اسے لازمی چاہئے تھا۔

اس کے پچھلے پروموشن کو دو سال ہی ہوئے تھے اور وہ دوبارہ ترقی پا گئی تھی۔ اس کی محنت، اس کی لگن اور پروفیشنل قابلیت میں ہوتا مسلسل اضافہ، یہ سب اس کی سفارشیں تھیں۔ وہ میرٹ پر منتخب ہوئی ہے، یہ احساس اس کی کھوئی خود اعتمادی کو واپس لا رہا تھا۔ اگر کسی ایک انسان نے اسے رد کر دیا تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ بالکل بے کار، غیر اہم اور بے قیمت ہو گئی ہے۔ وہ خود کو خود اپنی ہی نظروں میں سرخرو کرنے کے جتن کر رہی تھی۔

☆☆☆

اس کے پروموشن پر فائز اور کلثوم خاص طور پر اس کے پیچھے لگ گئے تھے کہ وہ اس خوشی میں سب کو ٹریٹ دے۔ فائز نے خود ہی پکنک کا پروگرام ترتیب دے ڈالا، جس میں لنچ سمیت دیگر تمام خرچہ ماہا کے ذمہ تھا۔ یوں ان سب نے آنے والا ویک اینڈ فارم ہاؤس پر ہلا گلا کرتے گزارا۔ انکل، آنٹی، بھیا بھابی وغیرہ تو سب تھے ہی، ساتھ ہی کلثوم اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ اور غزل بھی اپنے شوہر اور بیٹی کے ساتھ پکنک پر موجود تھی۔

فائز کے ساتھ اس نے زارا اور فائز کی بہن آمنہ کو بھی انوائٹ کیا تھا۔ فائز کی ایک مہینے بعد زارا سے شادی ہونے والی تھی۔ وہ جتنا ہر دل عزیز تھا تو سب ہی اس کی شادی کے لئے بے انتہا پرجوش تھے۔ کلثوم، غزل اور بھابی کی طرح وہ بھی اس کی شادی میں پہننے کے لئے تین چار جوڑے بنا چکی تھی اور اب زارا کو دینے کے لئے ایک شاندار ساتحفہ بھی خرید چکی تھی پکنک والے دن فائز اور آمنہ کے ساتھ زارا کو نہ دیکھ کر اس نے ہی سب سے پہلے زارا کی غیر موجودگی کی بابت دریافت کیا تھا۔

''سوری ماہا! میں تمہارا انویٹیشن اسے دے نہیں پایا۔ اصل میں وہ کل یا شاید پرسوں کی فلائٹ سے نیویارک جا رہی ہے تو ظاہر ہے اپنی تیاریوں میں مصروف ہوگی۔'' فائز نے مسکراتے ہوئے اس کے استفسار کا جواب دیا۔

''نیویارک؟ لیکن ابھی چھ مہینے پہلے ہی تو وہ امریکہ سے لوٹی ہے پھر اتنی جلدی دوبارہ؟''

''تو کیا چھ مہینے بعد دوبارہ جانے پر پابندی لگ جاتی ہے؟'' وہ اس کی حیرت پر مسکرایا۔ وہ گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا۔ ابھی وہ لوگ راستے میں تھے۔ فائز کا جواب سنتے اس کی آمنہ کے چہرے پر نظر پڑی تو اسے وہاں کچھ غیر معمولی سا تاثر نظر آیا یوں جیسے یہ ذکر اسے ناخوش اور دکھی کر رہا ہو، جبکہ فائز بالکل نارمل اور مطمئن تھا۔

''بھئی، وہ امریکہ جا رہی ہے، ہمیشہ کے لئے وہاں سیٹل ہونے کے لئے۔ وہ کہتی ہے کہ وہ وہیں پیدا ہوئی، پلی بڑھی اور وہیں تعلیم حاصل کی ہے تو اسے پاکستان میں نہیں وہیں پر ہی رہنا ہے۔ اگر پچھلے چند سال اس نے پاکستان میں گزار لئے، یہاں پر میڈیسن پڑھ لی تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ اپنی ساری زندگی یہیں گزارنا چاہتی ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ میں شادی کے بعد اس کے ساتھ امریکہ میں سیٹل ہو جاؤں اور تمہیں تو پتا ہی ہے یار! میرا پاکستان اور اپنے گھر والوں کو چھوڑ کر کسی اور ملک میں سیٹل ہونے کا کبھی بھی ارادہ نہیں تھا۔ چاہے وہ میری جنم بھومی امریکہ ہی کیوں نہ ہو۔ سو میں نے اس کے ساتھ امریکہ میں سیٹل ہونے سے انکار کر دیا۔ بس اس بات پر ہمارا کمپرومائز نہ ہو سکا اور آفیشلی تو نہیں البتہ ان آفیشلی ہماری منگنی ٹوٹ گئی۔

''آفیشلی تب کہلائے گی جب وہ امریکہ فلائی کر جائے گی۔ ابھی تو میں کسی الیہ فلم کے دکھیارے ہیرو کی طرح سیڈ سانگز سنتا اس انتظار میں ہوں کہ شاید وہ لاسٹ مومنٹس، میں اپنا فیصلہ بدل دے اور یہیں رک جائے۔'' ہلکے



پھلکے موڈ میں مسکراتے ہوئے فائز نے ایک ایسی بات ان سب کو بتائی جسے سن کر ماہا کے ساتھ ساتھ انکل اور کلثوم بھی ہکا بکا رہ گئے۔ وہ زارا علیم سے بے تحاشہ محبت کرتا تھا۔

اور اس کی محبت گاڑی میں موجود کسی بھی فرد سے چھپی ہوئی نہیں تھی۔ سب ایسی شاک کی کیفیت میں آئے تھے کہ فارم ہاؤس تک پہنچنے تک سب بالکل خاموش اور گم صم سے بیٹھے رہے۔ فائز اور زارا کی ایک دوسرے سے والہانہ محبت، پھر اس محبت کے نتیجے میں دوران تعلیم ہی ہو جانے والی ان کی منگنی جو اتنے برسوں تک قائم رہنے کے بعد عین اس وقت ٹوٹ گئی جب ان کی شادی کی تیاریاں تکمیل کے آخری مراحل میں تھیں۔

''تم تو ایسے چپ ہو گئی ہو، جیسے میں نے تمہیں کسی کے مرنے کی خبر سنائی ہے۔'' وہ وہاں آنے کے بعد بھی بالکل خاموش تھی جبکہ باقی سب نے اپنے موڈز ٹھیک کر لئے تھے۔

''فائز! تم اسے روک کیوں نہیں رہے؟ اتنی سی بات پر اتنا بڑا فیصلہ؟''

وہ درختوں کے سائے میں ایک طرف تنہا اور خاموش کھڑی تھی۔ فائز بھی اس کے پاس وہیں آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔

''جنہیں جانا ہوتا ہے، وہ روکنے سے رک جاتے ہیں ماہا؟'' اس کا سوالیہ انداز ایسا تھا جیسے کہنا چاہتا ہو۔

''تم تو یہ بات مت کہو۔ تم اچھی طرح جانتی ہو کہ جانے والے روکنے سے رکتے نہیں۔ کیا تم روک پائی تھیں اسے؟ نہیں نا؟ میں بھی نہیں روک پا رہا۔''

''فائز۔'' وہ دکھ بھری نگاہوں سے اپنے دوست کو دیکھ رہی تھی جس کی آنکھوں میں ٹھہرا درد، مسکراہٹ کے پیچھے بھی اسے صاف دکھ رہا تھا۔

''اسے لگتا ہے مجھے اس سے کبھی محبت تھی ہی نہیں۔ اگر میں اس سے محبت کرتا تو اتنی سی بات کو ایشو نہ بناتا، اس کے ساتھ جانے سے انکار نہ کرتا۔ محبت میں شرائط نہیں رکھی جاتیں ماہا! مگر اس نے رکھیں۔ اگر میرے ساتھ چلو گے تو تم سے شادی کروں گی ورنہ نہیں۔ میں اسے غلط سمجھنے کے باوجود اس کی بے جا ضد مان جاتا۔ صرف اس کی محبت کی خاطر اس کے ساتھ امریکہ سیٹل ہونے کے لئے تیار ہو جاتا۔ مگر میں اپنے پاپا کا اکلوتا بیٹا ہوں، میرے علاوہ ان کے اور بیٹے نہیں، جو ان کا بزنس سنبھال سکیں۔

میرے مما، پاپا کو میری ضرورت ہے اور میں انہیں چھوڑ کر کہیں اور جا بسوں؟ نہیں ماہا! میں ایسا نہیں کر سکتا۔ حالانکہ پاپا کہتے ہیں وہ مینیج کر لیں گے، میں زارا کے ساتھ چلا جاؤں۔ شادی کے بعد امریکہ سیٹل ہونے جیسی کوئی بات ہمارے درمیان کبھی نہیں ہوئی تھی اس نے اپنی یہ خواہش میرے سامنے رکھی اور میرے انکار پر اپنی اس خواہش کو اپنی شرط اور اپنی ضد بنا لیا ایسا تو نہیں کہ میں اسے اس کی فیملی سے دور رہنے کو کہہ رہا ہوں، اس کے والدین یہیں کراچی میں ہیں اور نہ ہی ہماری منگنی ایسی کسی شرط کے ساتھ ہوئی تھی جو یہ کہا جائے کہ میں اپنے وعدے سے مکر رہا ہوں۔

اس نے مجھے کل تک کا ٹائم دیا ہے اگر میں جانے کی حامی بھر لوں تو وہ رک جائے گی اور پھر ایک مہینے بعد شادی کر کے اور مزید پندرہ بیس روز کراچی میں قیام کر کے ہم دونوں ساتھ امریکہ چلے جائیں گے۔ اور اگر نہیں تو کل وہ اکیلی یہاں سے چلی جائے گی۔'' وہ اب بہت سنجیدگی سے اسے ساری بات بتا رہا تھا۔ اس نے اپنے چہرے پر سے مسکراہٹ کا پردہ ہٹا دیا تھا اسے فائز کے چہرے پر دکھ اور کرب واضح دکھائی دے رہے تھے۔

"اس نے مجھے بتایا ہے کہ اسے مجھ سے پہلے بھی کافی شکایتیں تھیں مگر چونکہ وہ مجھ سے محبت کرتی ہے۔ اس لئے قصداً انہیں نظرانداز کرنے کی کوشش کرتی تھی۔ وہ اس کے کچھ پوچھے بغیر اسے ساری بات بتاتا چلا گیا تھا۔

"مجھے تمہیں یہ بات بتاتے ذرا سی بھی انسلٹ فیل نہیں ہوئی ماہا کہ میری منگیتر میں شادی سے ایک مہینے پہلے مجھے چھوڑ کر چلی جانے والی ہے۔ اس لئے کہ میں جانتا ہوں، یہ تمہارے لئے کوئی چٹخارے دار قصہ نہیں بلکہ دل کو دکھا دینے والی ایک خبر ہے۔"

وہ اسے اس کی کس کوتاہی اور کس غلطی کا احساس دلانا چاہ رہا تھا، وہ جانتی تھی اور بے ساختہ ہی ندامت سے اس کی آنکھیں جھک گئی تھیں۔ اس بات کے بعد پھر پکنک کے دوران کسی وقت بھی زارا علیم کا ذکر نہیں ہوا تھا۔ لنچ کے بعد سب نے اسے گفٹس، کارڈز اور پھول دے کر حیران کر دیا تھا۔ کلثوم نے فائز نے، آنٹی، انکل نے، بھیا بھابی نے، غزل نے سب نے گفٹس یہ بتا رہے تھے کہ بڑی سوچ بچار اور غور و فکر کے بعد خریدے گئے ہیں کہ ان میں ہر چیز سو فیصد اس کی پسند کی تھی۔

اتنا بے تحاشا پیار اور خلوص اس کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو لے آیا تھا اور ساتھ ہی اس کے دل کو ندامت سے بھی دوچار کر گیا تھا۔ اتنی محبتیں اس کے گرد ہیں اور وہ پھر بھی ناشکرے پن کا مظاہرہ کرتی ہے۔ رات کی تنہائیوں میں چپکے چپکے یہ سوچ کر آنسو بہاتی ہے کہ اس کا کوئی گھر نہیں، اس کا کوئی اپنا نہیں۔ اس کا کوئی رشتہ نہیں۔ یہ سب لوگ، یہ سب اس کے اپنے ہی تو ہیں۔ کوئی رشتہ نہ ہوتے ہوئے بھی اس کا ان سب کے ساتھ خلوص اور محبت کا رشتہ ہے۔

☆☆☆

وقت کا کام گزرنا ہے، سو وہ گزر رہا تھا۔ بڑی سبک رفتاری کے ساتھ ہاں مگر سبک رفتاری سے گزرتا یہ وقت بے مقصد اور بے مصرف نہیں گزرا تھا۔ وہ اس کے دامن میں بہت سی کامیابیاں اور کامرانیاں بھی ڈال کر گیا تھا۔

ایک لڑکی ہونے کی وجہ سے اسے بہت سی جگہوں پر مشکلات کا سامنا بھی کرنا پڑتا تھا۔ اگر اس کی ترقی پر خوش ہونے والے بہت تھے تو حسد کرنے والوں کی بھی کوئی کمی نہیں تھی۔

وہ اب اپنی گاڑی رکھتی تھی اور اسے خود ڈرائیو بھی کرتی تھی۔ ہاں گھر اس کا ابھی بھی وہی ایک کمرہ تھا۔ کسی اچھے سے علاقے کے اچھے سے اپارٹمنٹ میں رہنا وہ بڑی آسانی سے افورڈ کر سکتی تھی مگر اس کی تنہائی، اس کی عمر اور اس کی خوبصورتی یہ سب اسے ایسا کرنے نہیں دیتی تھیں۔ کلثوم کے میکے میں ایک کمرے کے گھر میں کرایہ دار کی حیثیت سے رہنا چاہے اس کی پوسٹ کے مطابق نہیں تھا مگر اس ایک کمرے کے مکان میں وہ محفوظ تو تھی۔ باہر قدم قدم پر بھیڑیے تھے اور وہ تنہا۔ اس کا تحفظ کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ اسے خود اپنی عزت اور آبرو کی حفاظت کرنی تھی۔

☆☆☆

ہاشم امتیاز کی بیٹی کی شادی تھی۔ اپنے آفس کے ایک معمولی سے چپڑاسی کی بیٹی کی شادی میں جانے کی کس کے پاس فرصت تھی۔ کسی سینئر ایگزیکٹو، کسی ڈائریکٹر یا CEO کی بیٹی کی شادی ہوتی تو ساری مصروفیات پل بھر میں غائب ہو جاتیں۔

تحفے سے زیادہ سب کی شرکت ہاشم صاحب کے لئے اہمیت رکھتی تھی مگر وہ اپنے کولیگز کو چلنے کے لئے مجبور تو



نہیں کر سکتی تھی۔ اپنی گاڑی کی موجودگی کے باوجود وہ شادی میں رات کے وقت اکیلے جانے، آنے کا رسک تو ہرگز نہیں لے سکتی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ انکل یا آنٹی میں سے کسی سے اپنے ساتھ چلنے کا کہے۔ مگر اس کے ان سے بات کرنے سے پہلے ہی فائز کا اس کے پاس فون آ گیا۔ وہ شادی میں جا رہا تھا اور اس سے یہی پوچھ رہا تھا کہ اگر اس کا جانے کا ارادہ ہے تو وہ اسے اپنے ساتھ لے جائے گا۔

فائز کے فون نے اس کا مسئلہ حل کیا تو وہ جلدی جلدی جانے کی تیاری کرنے لگی۔ فائز کو ان کی کمپنی کو چھوڑے اور اپنے پاپا کے آفس کو جوائن کئے کافی طویل عرصہ ہو گیا تھا مگر یقیناً اس نے ان تمام عرصہ میں ہاشم صاحب کے ساتھ رابطہ رکھا تھا تب ہی تو وہ اسے انوائٹ کرنا نہیں بھولے تھے۔

فائز عبید کا دل کتنا خوبصورت ہے۔ اسے زارا کی بدقسمتی پر نئے سرے سے افسوس ہوا۔

وہ دونوں شادی میں پہنچے تو حسب توقع ہاشم صاحب کا چہرہ انہیں دیکھ کر کھل اٹھا۔ انہوں نے ان دونوں کا والہانہ استقبال کیا۔ وہ ان کے آنے پر بے پناہ خوش تھے اور ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ انہیں کہاں بٹھائیں اور کس طرح ان کی خاطر کریں۔ فائز نے ان کی بوکھلاہٹ کم کرنے کی کوشش کی اور ان سے یہ کہا کہ جہاں باقی سب مہمانوں کو بٹھانے کا انتظام کیا گیا ہے، یہ دونوں بھی وہیں بیٹھیں گے۔

ان دونوں کے بہت شدت سے منع کرنے کے باوجود بھی ہاشم صاحب نے کھانے کے وقت ان دونوں کے لئے اپنے گھر کے ڈرائنگ روم میں کھانا لگوا دیا تھا۔ کسی امتیازی سلوک کو پسند نہ کرنے کے باوجود وہ دونوں ان کے اصرار کو رد کر کے ان کا دل توڑ نہیں سکے تھے۔ کھانا بہت سادہ سا تھا۔ ایک معمولی سا چپڑاسی جسے اپنی محنت کی جائز کمائی میں سات بیٹیوں اور دو بیٹوں کو تعلیم بھی دلوانی ہو اور پھر ان کی شادیاں بھی کرنی ہوں، بیٹی کی اس سے بہتر شادی نہیں کر سکتا تھا۔

بظاہر غیر سنجیدہ اور لاپروا سا نظر آنے والا یہ انسان اندر سے کتنا حساس تھا۔ دوسروں کے احساسات کی اسے کس قدر پروا رہتی تھی۔ وہ فائز کے اخلاص کو بہت قدر کی نگاہ سے دیکھ رہی تھی۔ واپسی میں وہ دونوں یوں بہت خوش تھے کہ آج انہوں نے اپنی مصروفیات میں سے چند گھنٹے نکال کر ایک انسان کو خوشی دی تھی۔

"فائز! تمہیں پتا ہے اللہ نے تمہیں بہت پیارا دل دیا ہے۔ محبت اور خلوص سے بھرا ہوا۔" گاڑی مین روڈ پر ڈالتا فائز اس تعریفی جملے پر ہنس پڑا۔

"تمہیں یہ بات آج پتا چلی ہے؟"

"نہیں، پہلے سے پتا ہے۔ تم سے آج کہہ رہی ہوں۔"

"پیارا سا، محبت اور خلوص سے بھرا دل تو اللہ نے تمہیں بھی دیا ہے۔ ہم ایک جیسے ہیں تب ہی تو ہم دوست ہیں۔ وہ کیا کہا جاتا ہے کہ انسان جیسا خود ہوتا ہے ویسے ہی اس کے دوست ہوتے ہیں۔" وہ فائز کی جوابی تعریف پر جو کہ کافی سنجیدگی سے کی گئی تھی، بے ساختہ مسکرائی۔

"ویسے ماہا! جو تمہیں میری خوبی نظر آ رہی ہے وہی کسی کو میری سب سے بڑی خامی نظر آئی تھی۔"

"میں زارا علیم کو اس دنیا کی سب سے بدنصیب لڑکی سمجھتی ہوں۔ اسے تم جیسے اچھے انسان کا زندگی بھر کا

ساتھ مل رہا تھا اور وہ۔" وہ بولتے بولتے ایک دم ہی خاموش ہوئی۔

"جیسے تم زارا کو بدنصیب کہہ رہی ہو۔ ایسے ہی میں ضمیر رضا کو کہتا ہوں۔ ہم دونوں کا مسئلہ یہ ہے کہ ہم نے اپنی زندگی کا ساتھی بنانے کے لئے غلط انسانوں کا انتخاب کیا تھا۔" فائز نے سنجیدہ لہجے میں تبصرہ کیا اور اس نام کو سن کر ایک پل میں ہی اس کا خوشگوار موڈ رخصت ہوگیا۔ وہ لب بھینچے فائز کو دیکھ رہی تھی۔

"ماہا تمہیں نہیں لگتا، ہم دونوں نے غلط لوگوں کو چنا۔ وہ دو لوگ ہمارے لئے درست انتخاب نہیں تھے جن سے ہم دونوں نے بہت محبت کی، جن سے ہم دونوں نے بہت سی امیدیں وابستہ کیں۔ میری ہم سفر ماہا احمد علی جیسی کوئی نازک اور حساس سا دل رکھنے والی لڑکی ہونی چاہئے تھی اور تمہارا فائز عبید جیسا کوئی......"

"فائز! یہ کیا بے کار کی باتیں شروع کر دیں تم نے۔ چلو کسی اور ٹاپک پر بات کرتے ہیں۔" اس نے بے ساختہ کچھ گھبرا کر اس کی بات کاٹ دی تھی۔ وہ پتا نہیں گفتگو کو کس طرف لے جانے لگا تھا۔

"کسی اور ٹاپک پر نہیں۔ میں آج تم سے اسی ٹاپک پر بات کرنا چاہتا ہوں اور میں بہت دنوں سے تم سے اس موضوع پر بات کرنا چاہ رہا ہوں۔ بس صرف یہ سوچ کر پریشان تھا کہ بات کس طرح کروں۔ تمہاری ناراضی سے ڈر بھی تو لگتا ہے۔"

مناسب رفتار سے گاڑی ڈرائیو کرتے وہ ایک نظر اس پر ڈال کر بولا۔

"جن کی زندگیوں میں اب ہماری کوئی اہمیت نہیں، جو ہمیں بھلا کر اپنی اپنی دنیاؤں میں مگن ہیں، ہم کب تک ان کے چلے جانے کا سوگ مناتے رہیں گے؟ مجھے حیرت ہوتی ہے، تم اتنے سالوں میں اس سوگ اور جوگ سے گھبرائیں نہیں۔ میں تو دو سالوں میں ہی اکتا گیا ہوں۔ بلکہ اب سوچوں تو یہ سوچ کر خود پر غصہ آتا ہے کہ میں نے اپنی زندگی کے دو قیمتی سال اس کے لئے گنوا دیئے جس کے لئے میں کوئی اہمیت رکھتا ہی نہیں۔ جسے اس بات سے کوئی سروکار نہیں کہ فائز عبید پچھلے پورے دو سالوں سے تنہا اور خاموش زندگی گزار رہا ہے۔ زارا کو امریکہ گئے دو سال ہو گئے، وہ وہاں خوش باش، مگن اپنی شادی شدہ زندگی گزار رہی ہے اور میں یہاں ناکام عاشقوں کی طرح اس کی یاد میں آہیں بھر رہا ہوں؟ میری زندگی اتنی فالتو اور بے مقصد تو نہیں کہ میں ایک بے حس لڑکی کے پیچھے اسے برباد کر دوں۔"

وہ کچھ غصے سے یوں بولا جیسے اپنی زندگی کے دو سال ضائع ہو جانے پر خود سے برہم ہو۔

"تم شادی کر لو فائز! دنیا میں اچھی لڑکیوں کی کوئی کمی نہیں۔" وہ قصداً غیر معمولی سنجیدگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولی، اس سنجیدگی میں یہ تنبیہ چھپی ہوئی تھی کہ اس کی چند لمحے کی ادھوری بات اسے پسند نہیں آئی ہے۔

"تمہارے مشورے سے پہلے ہی میں شادی کا فیصلہ کر چکا ہوں اور میرے اردگرد موجود لڑکیوں میں اچھی لڑکی صرف ایک ہی ہے اور وہ تم ہو ماہا۔"

اپنی بات مکمل کر کے وہ اب براہ راست اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ نجانے یہ سوچ اس کے ذہن میں کب آئی تھی اور کیوں؟ ان کے درمیان ایسا رشتہ تو کبھی نہیں رہا تھا۔

"تم کب تک اس کم ظرف اور گھٹیا شخص کے پیچھے اپنی زندگی برباد کرو گی ماہا؟ ایسی تنہا اور اداس زندگی؟ زندگی کی سب خوشیوں پر تمہارا پورا حق ہے۔ کیا تمہیں ابھی بھی اس کا انتظار ہے؟"



"نہ مجھے اس کا انتظار ہے اور نہ میری زندگی میں اس کے لئے کوئی جگہ ہے میں اس سے شدید نفرت کرتی ہوں۔ میں اپنی زندگی سے خوش ہوں۔ میں اپنی زندگی میں اب کسی بھی طرح کی کوئی تبدیلی نہیں چاہتی۔ تم بہت اچھے ہو فائز! تمہارا نصیب یہ نہیں کہ تم ایک شادی شدہ لڑکی سے شادی کرو۔ تمہیں تو کوئی بہت پیاری سی، محبتوں سے بھرپور لڑکی ملنی چاہئے۔ چاہے وہ شخص اس قابل تھا یا نہیں مگر میں نے اس سے محبت کی تھی، اپنے دل کی تمام تر سچائیوں کے ساتھ، اب میں کسی دوسرے شخص کو کیا دے سکتی ہوں؟"

اس نے بھی جواباً سیدھا فائز کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سنجیدہ اور دوٹوک لہجے میں کہا۔

"محبت تو میں بھی کر چکا ہوں زارا کے ساتھ، تو کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ اب میں اس محبت کی یاد میں اپنی زندگی گزار دوں؟ ماہا! جیسا تمہیں لگتا ہے ایسا ہی میں بھی محسوس کرتا ہوں، یہی کہ اب میں کسی سے محبت نہیں کر سکتا۔ مگر میں ایک نئی زندگی کی شروعات تو کر سکتا ہوں، اس کے ساتھ جسے میں بہت اچھی طرح جانتا ہوں، جو میری دوست ہے، جو بالکل میرے جیسی ہے۔ ہمارا دکھ ایک جیسا ہے ماہا! ہم ایک دوسرے کو دھوکہ دیئے بغیر، جھوٹ بولے بغیر ایک نئی زندگی کا آغاز اس امید پر کر سکتے ہیں کہ وقت گزرنے کے ساتھ جب ہمارے زخم بھرتے جائیں گے تو ہماری دوستی محبت میں خود بخود ہی بدل جائے گی۔" وہ اپنے مزاج کے برخلاف انتہا سے زیادہ سنجیدہ تھا۔

"میں تمہاری طرح نہیں سوچتی فائز! مجھے اب شادی کے نام سے بھی نفرت ہے۔ میں تمہارے، خلوص کی قدر کرتی ہوں۔ مگر آئم سوری جو تم چاہتے ہو، وہ میرے لئے بالکل ناممکن ہے۔" اس کا انکار دوٹوک اور قطعیت بھرا تھا، فائز یک لخت ہی خاموش ہو گیا تھا۔ باقی کا راستہ ان دونوں نے خاموشی سے کاٹا تھا۔ فائز نے گاڑی گھر کے گیٹ کے سامنے لا کر روکی تو وہ دروازہ کھول کر فوراً گاڑی سے اتر گئی۔

"فائز! تم میرے انکار کا برا مت ماننا پلیز۔" دروازہ واپس بند کر کے وہ کھڑکی میں جھک کر اس سے بولی۔

"میں نے تمہارے انکار کا برا نہیں مانا ہے، ہاں مگر میں نے اسے قبول بھی نہیں کیا ہے۔ اتنے بڑے فیصلے لمحے بھر میں نہیں ہوتے ماہا! جب میں زارا علیم جیسی خودغرض لڑکی کے لئے اپنی زندگی کے دو سال گنوا سکتا ہوں تو جسے میں بہت اچھا سمجھتا ہوں اور جو واقعی بہت اچھی ہے، اس کا جواب بدلنے کا انتظار کیوں نہیں کر سکتا؟ ماہا! تم اس بات پر دوبارہ سوچنا ہر مرد خودغرض اور کم ظرف نہیں ہوتا۔ ہر مرد ضمیر رضا نہیں ہوتا۔" اسے جواب میں کچھ کہنے کا موقع دیئے بغیر وہ گاڑی اسٹارٹ کر کے ایک دم ہی وہاں سے چلا گیا تھا اور وہ تھکے تھکے قدموں سے چلتی اندر آ گئی تھی۔

اس نے سوچا کہ وہ دوبارہ فائز سے اس موضوع پر بات کرے گی مگر جتنا وہ بات کرنے کے لئے اسے اس موضوع کی طرف لانا چاہتی اتنا ہی وہ بات کو ادھر ادھر گھما کر اسے ٹال جاتا۔ فائز نے دوبارہ اسے اس موضوع پر آنے نہیں دیا تھا۔ فائز کا اس کے ساتھ دوستانہ انداز کسی تبدیلی کے بغیر ویسا ہی تھا۔ وہ اس کے ساتھ بالکل پہلے کی طرح ملتا اور باتیں کرتا یوں جیسے آٹھ ماہ قبل اس نے شادی کا پرپوزل ماہا کے سامنے رکھا ہی نہیں تھا۔

☆☆☆

وہ اپنی روزمرہ استعمال کی اشیاء جس سٹور سے پہلے خریدا کرتی تھی ابھی بھی وہیں سے خریدتی تھی۔ حالانکہ اب ڈیفنس میں اس کا گھر نہیں تھا جو وہ سٹور اس کے گھر سے قریب پڑتا ہو۔ بس اسی جگہ سے خریداری کرنے کی عادت

سی ہوگئی تھی۔ اس لئے کبھی وہ آفس سے واپسی میں اور کبھی چھٹی والے دن وہاں آجاتی تھی۔ اپنی ضرورت کی اشیاء اٹھا اٹھا کر وہ تیزی سے اپنی ٹرالی میں رکھتے جا رہی تھی۔ وہ کارن فلیکس کا ڈبا اور دوسری دو تین چیزیں لے کر ٹرالی میں ڈالنے کے لئے مڑی ہی تھی کہ سامنے سے اندھا دھند بھاگ کر آتی ایک چھوٹی سی بچی اس سے ٹکرائی۔

ماہا اس چیز کے لئے قطعاً تیار نہیں تھی۔ اسی لئے اپنے ہاتھ میں موجود اشیاء کو کوشش کے باوجود سنبھال نہ پائی۔ اگر ایک طرف اس کا سامان گرا تھا تو دوسری طرف وہ بچی بھی بہت زور سے منہ کے بل چکنے ٹائلز والے فرش پر گر پڑی تھی۔

''اوہ مائی گاڈ۔'' وہ اپنے سامان کو چھوڑ چھاڑ بے ساختہ گھٹنوں کے بل نیچے بیٹھی اور اس بچی کو اٹھایا۔ اس کے گرنے کی آواز اتنی زوردار آئی تھی تو چوٹ بھی کافی زور سے ہی لگی ہوگی۔

''کہاں چوٹ لگی ہے بیٹا؟'' وہ آنکھوں میں ڈھیر سارے آنسو لئے ماہا کو دیکھ رہی تھی اور ماہا تیزی سے اس پر نظریں دوڑاتے یہ دیکھ رہی تھی کہ کہیں خون تو نہیں نکل رہا۔

''اس طرح سے بھاگو گی تو چوٹ تو لگے گی۔ ویسے بہادر بچے اتنی چوٹ پر روتے تو نہیں۔'' اس کے آنسو صاف کرتے ہوئے اس نے اس کے گال پر پیار کیا۔ بچی نے اس بار خاصی دلچسپی اور توجہ سے اس کی طرف دیکھا تھا۔ گلابی ہونٹوں' سرخ گالوں اور دونوں گالوں پر خوب گہرے گہرے ڈمپلز رکھنے والی وہ بے تحاشا خوب صورت اور صحت مند بچی تھی جو شاید چار' پانچ سال کی ہوگی۔ ماہا کو وہ بہت کیوٹ لگی۔ چہرے پر شرارت کے ساتھ ڈھیر ساری معصومیت لئے ہوئے۔ اس نے سرخ کلر کا سلیولیس فراک پہنا ہوا تھا اور بالوں کی سیدھی مانگ نکال کر بالکل سامنے کی طرف چھوٹے چھوٹے پیارے سے ہیئر کلپ کلپس لگائے ہوئے تھے۔

''یہ اسٹرابیری کیا اصلی ہے؟'' اس نے شرارت سے اس کے ہیئر کلپ کی طرف اشارہ کیا۔ بچی نے اس کی کم عقلی پر افسوس کرنے والے انداز میں زور زور سے نفی میں سر ہلا دیا۔

''جی نہیں۔''

''چاکلیٹ کھاؤ گی؟''

''جی۔''

''پہلے اپنا نام بتاؤ اور یہ بھی کہ کس اسکول میں پڑھتی ہو' پھر چاکلیٹ ملے گی۔'' اسے اس بچی سے باتیں کرنے میں مزا آرہا تھا۔ ''اہل۔'' اس نے اپنی باریک سی آواز میں اسے اپنا نام اور اپنے اسکول کا نام بتا دیا۔ وہ انگریزی بول رہی تھی۔ اسے شاید اردو سمجھنی تو آتی تھی مگر بولنی نہیں۔

وہ اٹھ کر کھڑی ہوئی اور پھر اپنی ٹرالی میں سے دو چاکلیٹ نکال کر اس کے ہاتھ میں پکڑائیں جو وہ بھابھی کے بیٹے کے لئے ہر بار خرید کر لے جاتی تھی۔

''اہل! تمہارا نام بھی بہت پیارا ہے اور تم بھی بہت بہت پیاری ہو۔'' اس نے اس کے گالوں کو ہولے سے چھوا۔ وہ اپنے دونوں ہاتھوں میں ایک ایک چاکلیٹ پکڑے بہت خوش کھڑی تھی۔

''تھینک یو آنٹی۔''

''یو آر ویلکم بیٹا'' وہ اس کے مہذب کے مظاہرے پر مسکرائی۔



''ارے یہ کیا گرا ہے؟'' ایک دم ہی اس کی نگاہ بچی کے پیروں کے پاس پڑی سونے کی چین پر پڑی۔ اس کے کہنے پر بچی نے بھی فوراً اسی طرف دیکھا۔

''آنٹی! یہ میری ہے۔'' ماہا اتنی دیر میں زمین پر سے چین اٹھا چکی تھی۔ زمین پر گرنے سے چین میں پڑا لاکٹ کھل گیا تھا اور اس میں لگی دو تصویریں فوراً ہی اس کی نگاہوں کے سامنے آگئی تھیں۔

''یہ میرے ماما، پاپا ہیں۔'' بڑی خوشی کے ساتھ کچھ فخریہ سے انداز میں اس نے ماہا کو بتایا اور ماہا ان تصویروں کو دیکھ کر اپنی خوش مزاجی لمحہ بھر میں بھول چکی تھی۔ اس کے چہرے پر سے مسکراہٹ غائب ہو چکی تھی۔ سنجیدہ اور کرخت چہرے کے ساتھ اس نے اہل حمیر رضا کے ہاتھ میں اس کی چین دے دی۔

''اہل بے بی! کہاں چلی گئی تھیں تم؟ میں سب جگہ تمہیں ڈھونڈ رہی تھی۔'' وہ فلپینو عورت شاید اس کی گورنس تھی یا میڈ جو گھبرائے ہوئے انداز میں وہ بھاگتی ہوئی بچی کے قریب آئی تھی۔ بچی کے مل جانے کے باوجود اس کے چہرے کی بوکھلاہٹ اور پریشانی غائب نہیں ہو پائی تھی۔

''میں ان آنٹی سے باتیں کر رہی تھی۔'' ماہا نے نہ پھر اہل حمیر رضا کی طرف دیکھا اور نہ اس فلپینو عورت کی طرف۔ وہ فوراً اپنی ٹرالی کی طرف بڑھی اور پھر بغیر مڑے تیزی سے اپنی ٹرالی کاؤنٹر کی طرف لے گئی۔ اہل حمیر رضا زور سے آواز دے کر اس سے کچھ کہہ رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ اس کے پاس آئے وہ یہاں سے چلی جانا چاہتی تھی۔ بل پے کر کے وہ تیزی سے اسٹور سے نکل آئی۔

گاڑی ڈرائیو کرتے اس کی آنکھوں کے سامنے بار بار وہ دو تصویریں آرہی تھیں اور ساتھ ہی اہل حمیر رضا کا من موہنا اور معصوم چہرہ۔ اسٹیئرنگ پر اس کے ہاتھوں کا دباؤ بڑھ رہا تھا اور ایکسلیٹر پر پاؤں کا۔ اندر سے اٹھتی نفرت کی شدید لہر اسے بے قابو کر رہی تھی۔ اپنی نامرادیاں' اپنی محرومیاں اور اپنی خالی گود اس کے دکھوں اور اس کی نفرتوں کو بڑھا رہی تھی پھر نفرت کا یہ احساس خود اپنے آپ پر غصے میں بدلنے لگا۔

اس شخص کی محبت میں اندھی ہو کر اس نے اس کی ایک ناجائز بات کیوں مانی؟ ماں بننے کا اس کا فطری حق جو دنیا کا کوئی مہذب معاشرہ اور انسان اس سے نہیں چھین سکتا تھا' اس شخص نے چھینے رکھا اور وہ اس کی محبت میں پاگل ہو کر اپنی خواہش کے برخلاف اس کا من مانا فیصلہ قبول کیے گئی۔ ذرا ہمت کر کے اس فیصلے کے خلاف چل گئی ہوتی، زیادہ سے زیادہ کیا ہوتا' وہ اسے چھوڑ دیتا؟ چھوڑ تو اس نے اُسے تب بھی دیا تھا جب اُس نے اُس کی ہر بات مانی تھی۔ آج اسے ماما کہنے والا ایک وجود تو ہوتا۔ اگر اس کی اپنی بیٹی ہوتی تو کتنی بڑی ہوتی۔ وہ ماہ سال کا حساب لگانے لگی۔ وہ اسکول جاتی ہوتی۔ پھر زندگی میں کرنے کو کتنا کچھ ہوا کرتا۔

''ماما! مجھے پینسل اور ربڑ چاہیے۔''

''ماما! مجھے سائنس کا اسائنمنٹ ملا ہے پلیز' میری ہیلپ کر دیں۔''

''ماما! میں اسپورٹس ڈے میں چلی جاؤں؟''

''ماما! میری فرینڈ کے پاس اتنا پیارا ڈول ہاؤس ہے' آپ مجھے بھی ویسا ڈول ہاؤس لا کر دیں ناں۔'' اس نے اپنی برابر والی خالی سیٹ کی طرف دیکھا۔ وہ یہاں بیٹھتی اور پھر آج وہ بھابھی کے بچوں سے بھی پہلے اسے چاکلیٹس

اور آئس کریم دلوا رہی ہوتی اور اب وہ اس کے برابر اس سیٹ پر اپنا سارا فرمائشی سامان اپنی گود میں لئے بہت خوش اور مگن بیٹھی اس سے باتیں کر رہی ہوتی۔ اس کی آنکھوں سے دو آنسو بڑی خاموشی سے گرے اور اس کے دوپٹے میں جذب ہو گئے۔

☆☆☆

اہل حمیر رضا سے ملنا ایسا واقعہ نہیں تھا' جسے وہ بہت آسانی سے بھول جاتی۔ اپنے سارے دکھ اپنی ساری محرومیاں اسے نئے سرے سے یاد آ گئی تھیں، وہ اس واقعہ کو کسی اور سے تو کیا کلثوم اور فائز تک سے ڈسکس نہیں کر سکی تھی۔ وہ ان دونوں میں سے کسی کو بھی نہیں بتا پائی تھی کہ وہ اہل حمیر رضا سے ملی ہے' بالکل اتفاقاً اور اس اتفاق نے اسے کتنے بہت سارے دنوں تک ڈسٹرب کیے رکھا ہے۔ نجانے وہ اپنے دل کی باتیں اپنے دوستوں سے کسی جھجک کے بغیر کب کہہ سکنے کے قابل ہو پائے گی؟

☆☆☆

اس واقعہ کو ایک ڈیڑھ مہینہ گزر چکا تھا جب اس روز صبح وہ اپنے آفس میں بیٹھی کام کر رہی تھی۔ صبح کے ساڑھے نو بج رہے تھے اور وہ اپنے سامنے رکھے چند کاغذات پر دستخط کرنے میں مصروف تھی۔ اسی وقت اس کی سکیریٹری نے انٹرکام پر اس سے رابطہ کیا۔

''میم! کوئی حمیر رضا صاحب آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔'' اس کی انگلیوں نے دستخط کرتے کرتے پین کو اتنی سختی سے دبایا کہ اس کی نب ٹوٹ گئی۔ وہ یہاں کیوں آیا ہے؟ وہ اس سے کیوں ملنا چاہتا ہے؟ اتنے برسوں سے وہ جس شخص کے نام تک سے نفرت کرتی آ رہی تھی تو اس کی شکل دیکھنا کیسے گوارا کرتی؟ بہت مشکلوں سے اس نے اپنے غصے اور اپنے لہجے کی کڑواہٹ کو ایک پروفیشنل سی ٹون کے پیچھے چھپایا اور اپنی سیکریٹری سے سنجیدگی کے ساتھ استفسار کیا۔

''کس سلسلے میں ملنا چاہتے ہیں' آپ نے پوچھا نہیں؟''

''میم! وہ کہہ رہے ہیں' انہیں آپ سے کچھ پرسنل نوعیت کا کام ہے۔'' اس کی سیکریٹری جواباً شائستگی سے بولی۔

''ان سے کہیں' ابھی میں بہت بزی ہوں۔ وہ انتظار کریں۔'' اپنا پروفیشنل لہجہ برقرار رکھتے ہوئے اس نے بات ختم کی۔

''پرسنل نوعیت کا کام؟'' نفرت سے سوچتے اس نے زیرلب دہرایا۔ ہاں ایک پرسنل نوعیت کا معاملہ ان کے درمیان طے ہونا ابھی باقی تھا نا۔

Some unfinished business ایک کاغذی کارروائی' اس نام نہاد رشتے کو ختم کرنے کے لئے تین الفاظ کی ادائیگی۔ مگر اس کام کے لئے بھی وہ براہ راست اس شخص سے کوئی رابطہ نہیں چاہتی تھی اب وہ' وہ ماہا احمد علی نہیں رہی تھی جو اپنے آفس میں صرف اس شخص کی فون پر آواز سن کر ہی زار و قطار رو پڑی تھی۔ پانچ سال پہلے کی ماہا احمد علی اور آج کی ماہا احمد علی میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ اسی لئے وہ پرسکون سے انداز میں اپنا کام نمٹاتی رہی۔ لنچ ٹائم شروع ہوا تو اس نے انٹرکام پر اپنی سیکریٹری سے کہا۔

''جو صاحب مجھ سے ملنے آئے تھے' وہ اگر ابھی بھی موجود ہیں تو انہیں اندر بھیج دیجئے۔''



''یس میم۔'' اس نے اپنے سامنے رکھی فائل بند کر دی اور کمرے کا دروازہ کھلنے کا انتظار کرنے لگی۔ چند سیکنڈز میں ہی دروازہ کھلا اور اس شخص نے اندر قدم رکھا جسے وہ مرتے دم تک بھی دوبارہ کبھی دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔ سر اٹھا کر پُراعتماد قدموں سے چلتا انتہائی قیمتی اور بہترین تراش خراش والے سیاہ رنگ کے سوٹ میں وہ کسی سینئر بزنس ایگزیکٹو کی طرح نظر آ رہا تھا وہ خود سے ملنے کے لئے آنے والے بزنس ایسوسی ایٹ کی طرف پیشہ ورانہ انداز میں دیکھ رہی تھی۔

''کیسی ہو ماہا؟'' وہ اس کی میز کے سامنے آ کر رک گیا تھا۔

''آپ مجھ سے کس سلسلے میں ملنے آئے ہیں مسٹر حمیر رضا؟'' ماہا نے اس کے سوال کا جواب دینا ضروری نہیں سمجھا تھا۔

''یقیناً'' آپ مجھ سے Divorce (طلاق) کی بات کرنے آئے ہیں۔ اگر یہی بات ہے تو میں سمجھتی ہوں' بہتر یہی رہے گا کہ آپ یہ کام اپنے وکیل کے ذریعے کروایئے۔ ہم دونوں ہی اپنی اپنی زندگیوں میں اتنے مصروف ہیں کہ ہمارے پاس اس طرح کے فضول معاملات میں الجھنے کا بالکل وقت نہیں۔ آپ اپنے وکیل کے ذریعے مجھے پیپرز بھجوا دیجئے۔ It so simple

ماہا! تم پلیز اس لہجے میں مجھ سے بات مت کرو۔ میں کسی ڈیوورس (طلاق) کے لئے تم سے بات کرنے نہیں آیا ہوں۔''

وہ اس کی میز کے سامنے رکھی کرسی پر بیٹھتے ہوئے آہستگی سے بولا۔

''ایکسکیوزمی مسٹر رضا! میں نے آپ سے بیٹھنے کے لئے ہرگز نہیں کہا۔'' اسے ٹوکتے وقت بھی اس کا لہجہ ہنوز پروفیشنل اور مہذب رہا۔

''میں بہت بزی ہوں۔ یہ میرا لنچ ٹائم ہے اور اس کے بعد مجھے ایک میٹنگ میں جانا ہے' لہٰذا آپ کو جو کچھ بھی کہنا ہے' وہ مختصر لفظوں میں جلدی کہہ دیجئے۔'' وہ جواب میں کچھ کہنے کے بجائے ایک ٹک اس کی سمت دیکھے جا رہا تھا۔ کئی منٹ بعد وہ اس کی طرف دیکھ کر دھیمے لہجے میں بولا۔

''ماہا! میں، میں جانتا ہوں، میں نے تمہارے ساتھ بہت زیادتی کی ہے۔ میں تم سے شرمندہ ہوں۔ میں تمہیں اپنے ساتھ لے جانے آیا ہوں۔ جو کچھ ہوا' اسے بھلا کر ہم پھر سے ایک ساتھ اپنی زندگی شروع کر سکتے ہیں ماہا!''

''مسٹر رضا! فرسٹ نیم ٹرمز First Name Terms تو ہمارے درمیان کب کے ختم ہو چکے۔ میں آپ کے ساتھ روڈ ہونا نہیں چاہتی لیکن یہ بے تکلفی سے ماہا کہنا۔ آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے' میں کیا کہنا چاہتی ہوں'' وہ ہولے سے مسکرائی۔

''ماہا! تم مجھے جو کچھ بھی کہو' تمہیں حق ہے کہنے کا۔ میں نے واقعی تمہارے ساتھ اچھا نہیں کیا ہے لیکن میرا یقین کرو ماہا! تم سے دور جا کر میں ایک دن بھی خوش نہیں رہا۔ میری زندگی میں واپس آ جاؤ ماہا پلیز۔ تمہارے بغیر میری زندگی بہت اداس ہے' بہت ویران ہے۔'' وہ اس کی طرف دیکھ کر بہت ٹھہر ٹھہر کر آہستگی سے بولا اور وہ جواباً قہقہہ لگا کر یوں ہنسنے لگی جیسے حمیر رضا نے اسے کوئی بہت دلچسپ لطیفہ سنایا ہو۔

''آج آپ ایموشنل اور کا احساس ہو رہے ہیں مسٹر رضا! جبکہ آپ نے نوٹ کیا ہو گا کہ میں اپنی حماقتوں

سے نکل کر آپ کے ساتھ ایک پڑھی لکھی' ماڈرن اور میچیور عورت کی طرح لوجیکل وے (منطقی انداز) میں بات کرنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ ان جذباتی باتوں میں کچھ نہیں رکھا مسٹر رضا! آپ جو کہنے آئے ہیں وہ کہیے۔ مثلاً مہر کے بارے میں۔ اب دیکھیے' آپ تو مجھے خیرات کے طور پر فرنیچر بخش گئے تھے۔ مگر کیا کروں۔ آپ کی کبھی ایک پیسے کی بھی مقروض نہیں رہی ہوں تو یہ احسان کیسے قبول کر لیتی۔'' میں نے سارا فرنیچر پچاس ہزار میں فروخت کیا تھا۔

حساب کچھ یوں بنتا ہے مسٹر رضا کے پچاس ہزار میں سے آٹھ ہزار میں اپنے جہیز کے فرنیچر کے نکال لوں تو بیالیس ہزار آپ کے میرے حصے میں آئے۔ یعنی میرے مہر کے ایک لاکھ روپوں میں سے بیالیس ہزار نکال چکنے کے بعد اب آپ مجھے مہر کے اٹھاون ہزار مزید دیں گے۔'' اس کی مسکراہٹ استہزاء اور طنزیہ اور کاٹ دار تھا۔

''ماہا! میرے ساتھ اس طرح بی ہیو مت کرو۔ میں سچے دل اور پورے خلوص کے ساتھ تمہارے پاس واپس آیا ہوں پلیز پرانی سب باتوں کو بھلا کر مجھے ایک موقع اور دو۔ میں اپنی سب غلطیوں کا ازالہ کروں گا۔'' وہ ایک بار پھر بہت زور سے کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

''آپ کو ایک بات بتاؤں مسٹر رضا! پلیز' برا مت مانیے گا یہ دل' جذبات اور خلوص ٹائپ کے الفاظ آپ کو بالکل سوٹ نہیں کر رہے ان فیکٹ آپ کے منہ سے نکلنے کے بعد یہ الفاظ بہت کڑوے اور بدصورت لگ رہے ہیں۔'' وہ اس پر سے نظریں ہٹا کر اپنی ٹیبل پر کچھ ڈھونڈنے لگی تھی۔

''اینی وے، میں چلتی ہوں۔ آپ کے پاس کرنے کے لئے کوئی خاص بات تو ہے نہیں اور مجھے میٹنگ میں جانے کے لئے دیر ہو رہی ہے'' وہ اپنا موبائل اور سن گلاسز میز پر سے اٹھاتے ہوئے کرسی پر سے کھڑی ہو گئی پھر اپنا پرس کندھے پر ڈالتے ہوئے اسی پروفیشنل سے انداز میں بولی۔

''آپ نے بات کرنی ہو تو پلیز اپنے وکیل کے ذریعے مجھ سے رابطہ کیجئے گا۔''

☆☆☆

وہ کمرے سے نکل کر جا چکی تھی اور وہ بے بسی سے اسے جاتا دیکھتا رہا تھا۔

''آج سولہ فروری ہے یہ بات میں نہیں بھولا اور تم بھول گئیں؟ تمہیں کیا لگتا ہے میں سولہ فروری کے دن تم سے طلاق کی بات کرنے آیا ہوں؟'' اس نے کرسی کی پشت سے اپنا سر ٹکا کر بہت کرب سے آنکھیں بند کر لی تھیں جب وہ ساتھ تھی تو یہ دن کبھی یاد نہیں رہتا تھا اور جب وہ ساتھ نہ رہی تو یہ دن ہر سال خود اپنے آپ کو یاد کروایا کرتا تھا۔ شاید اس لئے کہ اب وہ یاد دلانے والی ساتھ نہیں رہی تھی۔

''میں تمہارے ساتھ اسی طرح اپنی شادی کی پچیسویں' چالیسویں بلکہ پچاسویں سالگرہ بھی منانا چاہتی ہوں۔ یونہی تم بھول جاؤ اور یونہی میں تمہیں یاد دلاؤں۔'' میں اب یہ دن کبھی نہیں بھولتا۔ تمہارے یاد دلائے بغیر میں اس دن کو یاد رکھتا ہوں۔ تم چاہتی تھیں سال بھر میں یہ ایک دن ہم دنیا کے سب کاموں سے بے نیاز ہو کر محبتوں کا اظہار کرتے بتائیں۔ میں چاہتا ہوں۔ ہم اپنی زندگی کا آنے والا ہر دن اور ہر لمحہ ایک دوسرے کے ہو کر محبتوں کے ساتھ بتائیں۔''

پر آج وہ لڑکی اتنی دور اس قدر اجنبی لگ رہی تھی۔ اس کے لہجے میں طنز اور آنکھوں میں نفرت تھی۔ جن آنکھوں



میں اپنے لئے سدا محبت اور والہانہ چاہت دیکھی تھی' آج ان میں جھانکتی نفرت اسے اندر تک ہلا گئی تھی۔

☆☆☆

''مجھ سے ناراض ہو کر سو گئے تو تمہیں نیند آ جائے گی؟''

یہ اس کی امریکہ میں پہلی رات تھی اور آفاق جمال شاندار پینٹ ہاؤس جو انہوں نے شادی کے بعد اسے اور سدرہ کو رہنے کے لئے دیا تھا اور اس پینٹ ہاؤس کے اس پرتعیش اور قیمتی ساز و سامان سے آراستہ کمرے میں وہ نرم اور آرام دہ بیڈ پر لیٹا تھا جب دھیمے سروں میں کسی نے اس کے کانوں میں سرگوشی کی۔ وہ سویا ہوا نہیں تھا' صرف آنکھیں بند کی ہوئی تھیں۔ دراصل اسے نیند آ نہیں رہی تھی۔ شاید جگہ کی تبدیلی کی وجہ سے اس نے فوراً اپنی آنکھیں کھولیں اور اپنے برابر میں موجود جویریہ پر نظر ڈالی۔ اس کے پہلو میں وہ لڑکی سو رہی تھی جسے بہت خوشی سے یہ حق اس نے خود دیا تھا۔ بے خبر سوئی سدرہ پر اس نے اپنی نگاہیں جما دیں اور پھر آہستہ آہستہ اس کی شکل بدلنے لگی۔ اس چہرے میں اب ایک دوسری شکل نظر آنے لگی تھی۔ بے ساختہ اس نے اس کے گرد ہاتھ رکھ کر اسے خود سے قریب کیا۔ رات کے اس اندھیرے میں کسی کو کیا پتا چلے گا کہ وہ اپنی سوئی ہوئی بیوی میں کسے دیکھ رہا ہے۔ احساسات اور جذبات کو ذرہ برابر بھی اہمیت دینے والے شخص نے خود کو اطمینان دلایا۔

''ہاں دو سالوں اور سات مہینوں کا ساتھ ہے۔ اس سارے عرصہ کی تمام راتیں اس نے اس لڑکی کے ساتھ بتائی ہیں' ابھی اسے زندگی سے نکلے عرصہ کتنا ہوا ہے؟ فقط اڑھائی مہینے' اڑھائی سالوں کے ساتھ کو بھلانے کے لئے اڑھائی مہینے تو بہت کم ہیں۔ فطری بات ہے۔ شروع شروع میں وہ یاد بھی آئے گی' بہت سی باتوں کے ساتھ اس کا خیال بھی آئے گا۔ پھر وقت کے ساتھ وہ ماضی کی وہ یاد بن جائے گی جسے یاد کرنے کا اسے کبھی دھیان بھی نہیں آئے گا۔ سدرہ کے سیاہ خم دار بال اسے یک دم ہی براؤن اور سلکی لگنے لگے تھے۔ اس نے اس کے بالوں پر اپنے لب رکھ دیئے اور اس کے بالوں میں سے آتی ایک پیاری سی' سونفٹ سی مانوس خوشبو کو کچھ حیرت کے ساتھ اپنے قریب بکھرتا محسوس کرنے لگا۔ کتنی حیرت کی بات تھی کہ سدرہ بھی وہی شیمپو استعمال کرتی تھی جو وہ استعمال کرتی تھی۔ اگلی صبح جب وہ باتھ روم میں نہانے گھسا تو اپنی رات کی کیفیت کو پوری طرح بھول نہیں سکا تھا' اسی لئے اس نے پہلی مرتبہ سدرہ کے شیمپو اور کنڈیشنر کو دھیان سے دیکھا۔ وہ' وہ شیمپو نہیں تھا۔ لیکن کیا پتا اس کی خوشبو بھی اس شیمپو جیسی ہی ہو۔

وہ باتھ روم میں کھڑا ایک بچکانہ اور احمقانہ حرکت کر رہا تھا مگر وہاں اسے یہ سب کرتا دیکھنے والا کون تھا؟ اس نے شیمپو کی بوتل اٹھا کر اس کا ڈھکن کھولا۔ وہ ایک بالکل ہی مختلف خوشبو تھی۔ اپنی حماقتوں پر خود کو سرزنش کرتا وہ باتھ روم سے نکل آیا تھا۔ امریکہ میں اس کی شاندار زندگی کا آغاز تھا۔ وہ سدرہ کے ساتھ بہت خوش تھا' اس کے توسط سے تو یہ پینٹ ہاؤس یہ پرتعیش زندگی' یہ اونچے طبقے تک رسائی سب کچھ ملا تھا۔ کبھی سوچا بھی نہیں تھا اس نے کہ وہ اس مہنگے ترین علاقے میں ایک پینٹ ہاؤس میں رہ سکے گا؟

☆☆☆

اس صبح اسے اٹھنے میں کچھ دیر ہو گئی تھی۔ باتھ روم میں شیو بناتے اس نے زور زور سے آواز لگائی۔

''ماہا! میری بلیو شرٹ اور گرے پینٹ نکال دینا'' کہتے ہوئے اسے خود احساس نہیں ہوا کہ اس نے ایک

غلط نام لے دیا ہے۔ وہ جلدی جلدی نہا کر باہر نکلا' اس یقین کے ساتھ کہ اسے اپنے کپڑے تیار رکھے ملیں گے۔ مگر وہاں پر ایسا کچھ نہیں تھا۔ جھنجھلائے ہوئے انداز میں منہ ہی میں کچھ بڑبڑاتا وہ کمرے سے نکلا تو ڈائننگ روم میں ٹیبل کے آگے بیٹھی سدرہ نظر آئی۔ یونیورسٹی جانے کے لئے مکمل تیار وہ نیوز پیپر دیکھ رہی تھی۔ پاکستان سے ان دونوں کے ساتھ آفاق جمال نے اپنی ایک پرانی ملازمہ بھی بھیج دی تھی اور اس وقت وہی ملازمہ ناشتے کے لوازمات میز پر رکھ رہی تھی۔

''تم ابھی تک تیار نہیں ہوئے حمیر؟'' اس نے اخبار سے نظر ہٹا کر اسے دیکھا۔

''ہاں ہو رہا ہوں''۔ وہ کھوئے کھوئے سے لہجے میں بولا۔

''جلدی کرو۔ ورنہ دیر ہو جائے گی۔'' وہ اپنی پلیٹ میں آملیٹ ڈالنے لگی۔ وہ اسی کھوئے کھوئے سے انداز میں واپس اپنے کمرے میں آ گیا۔ کچھ دیر وہ عجیب سی کیفیات کا شکار رہا۔ مگر پھر جلدی جلدی تیار ہوتے وہ اس وقتی کیفیت سے نکل کر ایک مرتبہ پھر اس زندگی کو انجوائے کرنے لگا جس کے اس نے ہمیشہ خواب دیکھے تھے۔

☆☆☆

''ماہا! میری بلیک ٹائی نہیں مل رہی۔'' بہت جھنجھلائے ہوئے لہجے میں وہ زور سے بولا۔ وہ الماری کے سامنے کھڑا ہر طرف ہاتھ مار رہا تھا۔ سدرہ ڈریسنگ ٹیبل کے آگے کھڑی میک اپ کر رہی تھی۔ اس کے منہ سے یہ جملہ نکلنے کی دیر تھی، اس نے ہاتھ میں پکڑا مسکارا اٹھا کر بہت غصے سے ڈریسنگ ٹیبل پر پھینکا۔ وہ اس دھماکے پر بے ساختہ ہی گھوما اور اس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی اسے فوراً یہ احساس ہوا کہ ابھی ابھی اس کے منہ سے ایک غلط نام نکل گیا تھا۔

وہ فوراً سدرہ کے قریب آ گیا اور اس سے روانی میں منہ سے نکلے اس نام کے لئے معذرت کی۔ وہ اس وقت سدرہ کے ساتھ ایک بہت اہم ڈنر میں جا رہا تھا۔ کافی دیر کی منت ساجت کے بعد کہیں جا کر سدرہ کا موڈ ٹھیک ہوا۔ مگر یہ صرف اس ایک روز کی بات نہیں تھی۔ ہر روز دن بھر میں نجانے کتنی بار۔

''ماہا! میرے جوتے۔''

''ماہا! میری شرٹ۔''

''ماہا! میری ٹائی۔''

''ماہا! میری فائل۔''

''ماہا! میری شیونگ کریم ختم ہو گئی۔'' اب اس کی شیونگ کریم، آفٹر شیو، شیمپو، صابن، ٹوتھ پیسٹ ختم ہوتے تو جب تک وہ وہاں دوسرے لا کر نہیں رکھ دیتا۔ وہ خالی ٹیوبز اور بوتلز خالی ہی رہتیں۔ پہلے تو جیسے جادو کے زور سے خالی ہونے کے بعد وہ خود بخود ایک جانی پہچانی آواز اس کے کانوں میں گونجنے لگتی۔

''آج تم دیر تک جاگ کر کوئی کام نہیں کرنے والے ہو۔ یہ کام کبھی ختم نہیں ہو گا۔ ہاں اس کے چکر میں تمہاری صحت ضرور خراب ہو جائے گی۔'' اس کے چھوٹے چھوٹے کام کب ہو جایا کرتے تھے، کبھی پتا ہی نہیں چلتا تھا ہاں اب جب وہ سب خود کرنے پڑ رہے تھے تو پتا چل رہا تھا کہ انہیں کون کیا کرتا تھا۔ ایک تھکا دینے والا مصروف دن گزار کر وہ رات میں بہت تھکا ہارا اور نڈھال، بہت دیر سے گھر لوٹتا اور بستر پر پاؤں لٹکا کر جوتوں سمیت ہی لیٹ جاتا تو وہ نرم و ملائم ہاتھ ان جوتوں اور موزوں کو اتارنے آگے نہیں بڑھتے، اس کے پیروں کو ہلکے ہلکے سے دبا کر اس کی



تھکن کو اتارنے کی کوشش نہ کرتے۔ اب نہ صبح اسے اپنی ٹائی کی ناٹ بندھی ملتی تھی اور نہ دیر ہو جانے پر کوئی اس کے پیچھے بھاگ کر اسے اپنے ہاتھوں سے ناشتہ کرواتا تھا اور نہ گھر سے نکلتے وقت کوئی اسے گاڑی احتیاط سے چلانے کی تاکید کرتا تھا۔

''تم مجھ پر کیا منتر پڑھ کر پھونکتی ہو؟'' وہ آفس یا کہیں بھی جانے کے لئے نکل رہا ہوتا وہ اس کے پیچھے دروازے تک آ کر باتیں کرنے اور خدا حافظ کہنے کے دوران منہ ہی منہ میں کچھ پڑھ کر اپنی طرف سے بڑی راز داری اور چالاکی سے اسے معلوم نہ ہو سکے، کچھ پھونکا کرتی تھی۔ کچھ دن اس چیز کو دیکھتے رہنے کے بعد ایک روز اس نے دروازے پر ہی اسے کھینچ کر اپنے قریب کرتے ایسے پوچھا جیسے اس کی چوری پکڑی ہو۔

''یہ کہ میرے شوہر صاحب گھر سے جا کر کسی خوب صورت سے خوب صورت لڑکی کو بھی نظر اٹھا کر نہ دیکھیں۔ ان کے دل، دماغ اور ان کی نگاہوں میں صرف میں رہوں، صرف میرا چہرہ رہے۔''

وہ جواباً شرارتی لہجے میں بولی اور وہ جانتا تھا کہ وہ اس کی سلامتی اور خیریت کے ساتھ گھر واپسی کے لئے اس پر کچھ پڑھ کر دم کرتی ہے۔ ان چیزوں میں اس نے کبھی یقین نہیں کیا تھا لیکن اس نے ماہا کو ایسا کرنے سے کبھی روکا بھی نہیں تھا۔

کوئی کام کرتے کرتے اسے سدرہ سے کوئی بات کرنا ہوتی تو بے خیالی میں منہ سے سدرہ کے بجائے ماہا نکل جاتا۔ سدرہ کے چہرے پر فوراً غصے سے بھرپور تاثر پھیل جاتا پھر ایک بار وہ اس کی ان حرکتوں پر اس سے ٹھیک ٹھاک لڑ پڑی۔ اس نے کہا کہ اس کی مڈل کلاس بیوی جو اس کے کپڑے دھوتی تھی، استری کرتی تھی، جوتے پالش کرتی تھی، اس کے لئے کھانے پکاتی اور پھر اسے خود اپنے ہاتھوں سے کھلاتی بھی تھی، اگر وہ سدرہ آفاق سے یہ توقع رکھتا ہے کہ وہ ایسی مڈل کلاس حرکتیں کرے گی تو یہ اس کی بھول ہے۔ گھر میں ملازمہ موجود ہے، وہ اس سے اپنے کام کروائے اور جو کام ملازمہ کے کرنے کے نہیں تو وہ زحمت کر کے انہیں خود ہی سرانجام دے۔ وہ سدرہ کو ناراض نہیں کر سکتا تھا۔

وہ امیر ماں باپ کی اکلوتی اور لاڈلی بیٹی تھی۔ ظاہر ہے، وہ اس کے پیچھے پیچھے پھر کر مڈل کلاس بیویوں جیسے کام نہیں کر سکتی تھی۔ جب ہر کام اور ہر ضرورت وقت پر پوری ہوتے ہوتے یک دم ہونا بند ہو جائے تو جس کی وجہ سے وہ کام وقت پر ہو رہے تھے، اس کا یاد آ جانا تو ایک لازمی اور فطری بات ہے۔ ماہا کے اتنی کثرت سے یاد آنے میں اس کے سوا اور کچھ نہ تھا کہ اب چونکہ اسے اپنے چھوٹے چھوٹے کام پہلے کی طرح کئے ہوئے نہیں ملتے ہیں۔ سو ان کاموں کے نہ ہونے کی وجہ سے وہ یاد آ جاتی ہے۔

اس نے خود کو بہت آسانی سے یقین دلایا کہ اپنے چھوٹے چھوٹے کام وقت پر نہ ہونے کی وجہ سے اسے یہ ٹینشن ہے اور اس میں ایسا کچھ نہیں کہ وہ ماہا کو اپنی زندگی میں مس کر رہا ہے۔ اسے ماہا یاد نہیں آتی۔ اس کے ذریعے انجام پانے والے اپنے کام یاد آتے ہیں۔

☆☆☆

وہ اپنے خوابوں کے حصول کی جانب کس کامیابی سے رواں دواں تھا۔ ایک ہی جست میں وہ کہاں سے کہاں پہنچ چکا تھا۔ دنیا کے بڑے بڑے ممالک کے سینئر بینکرز، سفارت کار، بہت سے ملٹی نیشنل کمپنیز کے سینئر عہدیدار،

بڑے بڑے بزنس مین، اونچی پوسٹوں والے امریکی سرکاری ملازمین، وہ آفاق جمال کے توسط سے، ان کے ذریعے سے ان لوگوں سے مل رہا تھا جن سے ملنا کبھی اس کے خواب و خیال میں بھی نہ تھا۔ کیا اس آدمی کے کانٹیکٹس تھے۔ کہاں کہاں پر اس کی دوستیاں اور تعلقات تھے۔ واشنگٹن میں بعض ایسی مستقل سیاسی اور سماجی شخصیات تک سے ان کی سلام دعا تھی، جو وہاں کی سیاسی اور سماجی زندگی میں کافی اثر رکھتی تھیں۔

وہ اپنی زندگی کا ایک بھی پل ضائع کئے بغیر ان تمام چیزوں کو اپنے حق میں استعمال کر رہا تھا۔ وہ مصروف تھا، بے انتہا مصروف۔ آفاق جمال کے ذریعے حاصل ہونے والے تعلقات کو اپنے حق میں استعمال کرنے میں، اس کے پاس فرصت کا ایک لمحہ بھی نہیں تھا۔ زندگی میں پیچھے وہ کیا کیا کچھ چھوڑ کر آیا تھا۔ زندگی میں پیچھے مڑ کر وہ لوگ دیکھتے ہیں، جنہیں آگے بڑھنے کی جستجو اور جنون نہیں ہوتا۔ اسے پیچھے نہیں، آگے دیکھنا ہے، بہت آگے۔ اتنا آگے جہاں تک خود اس کے اپنے خوابوں کی بھی رسائی نہ ہو۔

آسمان تک اونچا اڑنے کے، بلندیوں کی انتہاؤں تک پہنچنے کے گولز اور ٹارگٹس اس نے خود اپنے لئے کب سیٹ کئے تھے؟ دس سال کی عمر میں۔ ایک دس سال کا بچہ اور ایسی جنونی سوچ؟ ہاں اس نے اس ذلت سے بھری رات میں ایسا ہی سب کچھ سوچا تھا۔

وہ ایک مڈل کلاس فیملی سے تعلق رکھتا تھا اور اس کے والدین کا اس کے بچپن میں انتقال ہو گیا تھا۔ وہ اپنے سب جاننے والوں کو یہی بتایا کرتا تھا۔ جو ذرا قریبی واقف کار اور دوست تھے، انہیں ذرا سی تفصیل کے ساتھ یہ کہ اس کے والد ایک معمولی ملازم تھے اور اس نے اپنا بچپن بڑی غربت اور تنگ دستی میں گزارا ہے۔

ماہا تک کو اس نے اپنی فیملی اور اپنے بچپن کے بارے میں سب کچھ سچ نہیں بتایا تھا۔ سچ یہ تھا کہ اس کا باپ کپڑے کی ایک مل میں چپڑاسی تھا۔ جس گھر میں وہ پیدا ہوا، وہ ٹوٹا پھوٹا ایک کمرے کا مکان، گھر کہلائے جانے کے ہرگز لائق نہیں تھا۔ شکستہ حال اور خستہ، ایک کمرے کا مکان جو ہر موسم میں اذیت دیتا تھا۔ بارشوں میں اس کی بوسیدہ چھت ایسے ٹپکتی کہ کمرے میں سوکھی کوئی چیز باقی نہیں رہ پاتی۔ ان کے بستر تک پورے کے پورے پانی سے بھیگ جاتے۔

اس نے اپنی ماں کو اپنی پیدائش کے وقت سے ہی بیمار دیکھا تھا۔ اس کے باپ کو اپنی بیوی سے ہر سال بچے پیدا کروانے کا شوق جو تھا۔ جن زندگیوں کو وہ دنیا میں لے آیا تھا، انہیں ڈھنگ کی رہائش، روٹی اور لباس کچھ بھی نہیں دے سکتا تھا مگر اپنے کنبے میں اضافہ سے وہ پھر بھی باز نہ آتا تھا۔

جواد رضا اس سے سولہ سال بڑا تھا اور اس کے اور جواد رضا کے بیچ میں ہر سال اس کے زندہ اور مردہ بھائی بہن پیدا ہوتے رہے تھے۔

سرکاری اسکول میں اس کا داخلہ بھی اس کا سولہ سال بڑا بھائی جواد رضا کروا کر آیا تھا۔ جواد کو پڑھنے کا شوق تھا مگر وہ پانچویں جماعت تک ہی پڑھ کر گھر کے حالات کو دیکھتے ہوئے اپنی تعلیم کو خیر باد کہہ کر باپ والی مل میں ملازمت اختیار کر گیا تھا۔ ماں باپ کی بہ نسبت جواد، حمیر کا زیادہ خیال رکھ لیا کرتا تھا۔ حمیر کو اپنے اس گھر سے، اس ماحول سے، اس زندگی سے ہر چیز سے نفرت محسوس ہوتی تھی۔ وہ اپنا پھٹا پرانا بستہ لٹکا کر پیوند لگا یونیفارم پہنے اپنے گھٹیا سے سرکاری اسکول جا رہا ہوتا تو راستے میں پڑنے والے اس بڑے سے انگلش میڈیم اسکول کو حسرت سے دیکھتا۔ صبح



کے وقت وہاں ایک سے بڑھ کر ایک قیمتی گاڑیاں آ کر رک رہی ہوتیں اور ان میں سے صاف ستھرا، نیا یونیفارم پہنے خوش و خرم بچے اتر اتر کر اسکول کے گیٹ میں داخل ہو رہے ہوتے۔ یہ فرق کیوں تھا، اس کی سمجھ میں نہ آتا۔ وہ بچے ڈرائیورز کے ساتھ یا اپنے باپوں کے ساتھ قیمتی گاڑی میں بیٹھ کر اس بڑے سے شاندار اسکول میں آتے اور وہ بھوکے پیٹ، پھٹا پرانا یونیفارم پہنے، پیدل اس سرکاری اسکول میں جاتے، جہاں کی ہر چیز سے غربت برستی تھی، جہاں کی ہر چیز اسے زہر لگتی تھی۔ اپنے گھر سے، اپنے اسکول سے، اپنی اس غربت بھری زندگی سے اسے نفرت تھی مگر یہ نفرت اس رات سے پہلے تک اتنی شدید نہیں تھی۔ اس میں ایسا جنون اور ایسا باغیانہ پن نہیں تھا۔

اوائل جنوری کی وہ رات بہت سرد تھی۔ بارش بھی بہت زوردار اور گرج چمک کے ساتھ ہو رہی تھی۔ اس کی ماں بہت سخت بیمار تھی۔ وہ ایک اور بچے کو جنم دینے والی تھی۔ اس کی حالت اتنی خراب ہو گئی تھی کہ اسے ہسپتال میں داخل کرائے بغیر کوئی چارہ نہیں تھا۔ اس کا باپ سرکاری ہسپتال میں بڑی مشکلوں سے اسے داخل کروا پایا تھا۔ ہسپتال والوں نے ہزار منتوں کے بعد اسے داخل کر لیا تو اب اس کے باپ کے پاس بیوی کے علاج کے لئے بالکل بھی پیسے نہیں تھے۔ اس کی ماں مرنے کو پڑی تھی۔ اس کا فوری طور پر آپریشن کیا جانا بہت ضروری تھا اور اس کے باپ کے پاس کوئی پیسہ نہیں تھا۔

حمیر کو اس کا باپ اپنے ساتھ لے کر اپنے مالکوں کے گھروں پر پیسے مانگنے جا رہا تھا۔ گھروں پر قیمتی نائٹ ڈریس اور گاؤن میں ملبوس منہ میں سگار دبائے صاحبوں نے آ کر بات کرنا پسند بھی کیا تو صرف اس کے باپ کو ذلیل کرنے اور دھتکارنے کے لئے۔ ”میں کہاں سے دوں پیسے، میرے پاس کوئی خزانے ہیں۔ تمہاری تو روز کی یہی کہانی ہے۔“

”صاحب! میں جلدی لوٹا دوں گا، میری بیوی مر جائے گی، میرے بچے بے آسرا ہو جائیں گے صاحب! رحم کریں۔“ اس نے صاحب سے اپنے پاس کھڑے دس سال کے بیٹے کی طرف اشارہ کر کے رحم کی بھیک مانگی۔

”اتنے بچے پیدا کیوں کرواتے ہو؟ جیب میں ٹکا نہیں اور بچے پیدا کروانے کا شوق ہے۔“ صاحب نے اس کے باپ کو حقارت سے دھتکار دیا تھا۔

اپنی کم سنی کے باوجود اسے یہ سمجھ میں آ رہا تھا کہ اس کے باپ نے اسے اپنے ساتھ کیوں رکھا ہوا ہے۔ بارش اور سخت ترین سردی میں کسی بھی طرح کے گرم کپڑوں کے بغیر ایک دس سال کا معصوم سا بچہ جسے اس حال میں دیکھ کر لوگوں کے دل پسیج جائیں گے، ان کے دلوں میں ہمدردی اور رحم کے جذبات جاگ جائیں گے۔

پھر اس کا باپ ہر طرف سے مایوس ہو کر اپنے سب سے صاحب کے محل جیسے بنگلے پر آ گیا۔ کیا پتا کہ صاحب کا خیال بھی اس محل جتنا ہی بڑا ہو۔ وہ وہاں پہنچے تو چوکیدار نے ان سے ”صاحب سو چکے ہیں“ کہہ دیا۔ بہت مایوس اس کا باپ اسے لے کر وہاں سے جیسے ہی ذرا سا پیچھے ہٹا۔ اس نے اس محل نما بنگلے کا آہنی گیٹ کھلتا اور اس میں سے ایک بہت ہی قیمتی گاڑی باہر نکلتی دیکھی۔

”صاحب!“ اس کا باپ زور سے چلایا۔ اس گاڑی میں صاحب اپنی بیگم اور دو بچوں کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ ان سب کی تیاریاں بتا رہی تھیں کہ وہ کسی شادی بیاہ کی تقریب میں جا رہے ہیں۔ اس کا باپ اندھا دھند اس گاڑی کی طرف بھاگا۔

''یو باسٹرڈ، اندھے ہو گیا، دکھائی نہیں دیتا۔'' گاڑی کو بریک لگاتے صاحب نے دو چار موٹی موٹی گالیاں اس کے باپ کو دیں۔ گاڑی کی ٹکر لگنے سے وہ لڑکھڑا کر زمین پر اوندھے منہ گر گیا تھا۔

''صاحب! میری بیوی بہت بیمار ہے، صاحب! مجھے تھوڑے سے پیسے چاہئیں۔ میں جلدی واپس کر دوں گا۔ اپنے بچوں کے سر کا صدقہ سمجھ کر ہی مجھے بھیک دے دیں صاحب! میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔'' وہ زمین پر سے بڑی مشکلوں سے کھڑے ہوتے ہوئے رو رو کر فریاد کرنے والے انداز میں بولا۔

جبکہ صاحب کی گاڑی، اس کی آہیں اور فریاد سنے بغیر ہی دوبارہ اسٹارٹ ہو چکی تھی۔ بے بسی سے روتا اور صاحب کو پکارتا اس کا باپ اپنے جسم سے بہتے خون اور چوٹ کے سبب دوبارہ زمین پر گر چکا تھا۔ حمیر نے ایک نظر اپنے باپ کو دیکھا پھر اس نے اس محل کی طرف دیکھا۔ اس کا لان، اس کی دیواریں، اس کا گیٹ، اس کے پورچ میں کھڑی تین شاندار گاڑیوں کی طرف دیکھا جو تینوں بالکل نئے ماڈل کی تھیں اور چوتھی گاڑی جو سب سے قیمتی تھی، وہ، وہ بھی جسے وہ آدمی ابھی ابھی اس پورچ سے نکال کر لے جا چکا تھا جسے اس کا باپ صاحب کہہ کر مخاطب کر رہا تھا۔ اندھیرے میں بھی اس نے اس امیر کبیر شخص کی رعونت بھرے مغرور چہرے کو بغور دیکھا تھا۔ اس نے جو قیمتی سوٹ پہن رکھا تھا اسے بھی، زیورات اور قیمتی لباس میں سجی سنوری اس کی بیوی کو بھی اور پچھلی نشست پر بیٹھے اس کے دونوں بیٹوں کو بھی جو اسی کے جتنی عمر کے لگ رہے تھے۔

اس نے ان کی آپس میں وہ سرگوشیاں بھی دیکھی تھیں جو وہ اسے اور اس کے باپ کو دیکھ کر تمسخرانہ انداز میں کر رہے تھے۔ جب اس کا باپ ٹھوکر کھا کر زمین پر گرا تب اس نے اپنے باپ سے زیادہ غور سے ان دونوں لڑکوں کو قہقہے لگاتے دیکھا تھا۔

قیمتی لباس پہنے وہ دونوں لڑکے حمیر پر ہنس رہے تھے، اس کے باپ پر ہنس رہے تھے۔ اس نے اپنی جگہ جگہ سے پھٹی قمیض کی طرف دیکھا۔ لنڈا بازار سے خریدی ہوئی سستی سی پینٹ کی طرف دیکھا اور اپنی گھٹیا سی چپلوں کی طرف دیکھا جن پر موچی سے اتنی بار سلائی کروائی جا چکی تھی کہ اب گنتی کرنا بھی مشکل تھا۔ اس رات اس سڑک پر کھڑے ہو کر اس کا دل چاہا زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائے۔ فقیروں کی طرح اس کا باپ اسے گھر گھر بھیک مانگنے لے جا رہا تھا۔ اس کے واسطے دے کر، اس کی معصوم شکل دکھلا کر لوگوں سے خیرات مانگ رہا تھا۔ اس پل چوٹ کھا کر زمین پر بے سدھ گرے اور روتے ہوئے اپنے باپ سے اسے نفرت محسوس ہوئی، شدید نفرت، بے انتہا نفرت۔ باپ کے جسم سے بہتا خون دیکھ کر بھی اسے اس پر ترس نہ آیا۔

عجیب باغیانہ اور جنونی خیالات اس کے دل میں آ رہے تھے۔ جو آدمی ابھی اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ انہیں دھتکارتا یہاں سے گیا ہے، وہ اس سے اس کی ہر چیز چھین لے۔ اس کی گاڑیاں، گھر، فیکٹریاں، ملیں، ساری دولت، وہ اس سے سب کچھ چھین لے۔ زمین پر گرے اپنے باپ کو اٹھانے وہ آگے نہیں بڑھا۔ اس نے سہارا دینے کو اپنے باپ کے سامنے اپنا بازو نہیں بڑھایا۔ اس نے اسے زمین پر پڑا رہنے دیا۔

وہ سوچ رہا تھا، وہ گاڑی میں بیٹھ کر ابھی یہاں سے گیا ہے تو کیا وہ آسمان سے اترا تھا، نہیں۔ اس کے پاس دولت اس لئے تھی کیونکہ اس نے اس کے حصول کے لئے کوششیں کی تھیں، محنت کی تھی۔ اس نے رضا عرفان کی



طرح تقدیر پر شاکر ہو کر صاحب لوگوں کے لئے چائے بنانے اور فائلیں ادھر سے ادھر لے جانے میں اپنی زندگی نہیں گنوائی تھی۔ اگر وہ ذلیل کیا جا رہا تھا تو خود اپنی وجہ سے۔ اس کے پاس دولت ہوتی، رتبہ ہوتا تو لوگ اسے انسانوں کی طرح ٹریٹ کرتے، جانوروں کی طرح نہیں۔

صبح کے قریب کہیں جا کر اس کی ماں مر پائی تھی۔ ساری رات تڑپتے بڑی مشکلوں سے صبح سویرے اس کا دم نکلا تھا۔ پتا نہیں اس کا باپ اور بڑا بھائی اس موت پر رو کیوں رہے تھے۔ کم از کم اس کی آنکھوں سے تو ایک آنسو بھی نہیں نکلا تھا۔ وہ سب جانتے تھے، وہ مر رہی ہے، وہ مرنے والی ہے۔ اگر ان میں اس کے لئے کچھ کر سکنے کی ہمت ہوتی تو وہ اسے بچا نہ لیتے۔ بے بسی سے روتے بلکتے اپنے باپ سے اسے ایسی شدید نفرت ہو رہی تھی کہ وہ لفظوں میں اس کا اظہار کر ہی نہیں سکتا تھا۔

اب اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ بہت تیز دوڑے گا۔ اتنا تیز کہ اس کی رفتار تک پہنچنا کسی دوسرے انسان کے بس کی بات نہ رہے۔ وہ رضا عرفان کا بیٹا ضرور ہے، وہ جواد رضا کا بھائی ضرور ہے مگر وہ ان جیسا نہیں۔ وہ دنیا سے اپنے لئے سب کچھ حاصل کرے گا، چاہے جس طرح بھی۔

رضا عرفان ٹی بی کا شکار ہو کر دو سال بعد مر گیا۔ اسے اس کے مرنے پر کوئی غم نہیں ہوا تھا۔ ہاں اپنی ماں کے مرنے کا غم ضرور چند سالوں تک اس کے ساتھ رہا مگر پھر اس نے خود کو یہ کہہ کر اس غم کو دل سے دور کیا کہ جلد یا بدیر اس کمزور اور بیمار عورت نے آخر کار مرنا تو اسی اذیت اور کسمپرسی کے ساتھ تھا ہی۔ بھوک، غربت، بیماری اور ہر سال دائیوں کے ہاتھوں پیدا ہونے والے بچے۔ رضا عرفان جیسے شوہر کی اس مجبور بیوی کا انجام بالآخر یہی ہونا تھا۔

وہ تعلیم حاصل کرتا رہا۔ وہ اپنی زندگی کو سنوارنے کی جدوجہد کرتا۔ جواد رضا اس سے محبت کرتا تھا۔ اس کے تعلیمی اخراجات کے لئے وہ اسے پیسے دیا کرتا۔ اس کی بیوی کو دیور کا وجود گھر میں کھٹکتا تھا مگر وہ اپنے سے سولہ سال چھوٹے بھائی کو اپنے بیٹے کی طرح سمجھتا تھا۔ حمیر خود چھوٹی موٹی نوکریاں کر کے اپنے تعلیمی اخراجات پورے کرنے کی کوشش کرتا تھا مگر سچ یہ تھا کہ جواد کے دیئے پیسوں کے بغیر وہ اکیلا اپنا خرچ خود نہیں اٹھا سکتا تھا۔ جواد اس کی تعلیم سے بہت خوش ہوتا تھا۔ وہ خود نہیں پڑھ سکا، کم از کم اس کا چھوٹا بھائی تو اعلیٰ تعلیم حاصل کر لے۔ جواد رضا کے معاشی حالات کوئی بہت قابل رشک نہیں تھے۔ وہ رضا عرفان سے بہتر زندگی گزار رہا تھا۔ اس کے بچے تعلیم بھی حاصل کر رہے تھے اور انہیں تینوں وقت کھانا بھی ملتا تھا۔ چاہے روکھا، سوکھا اور عام سا کھانا ہی مگر وہ جواد اور حمیر کی طرح بھوکے پیٹ نہیں سوتے تھے۔

اسے پھر بھی اپنے بھائی پر ترس آتا تھا۔ کتنے مزے سے خوشی خوشی وہ یہ پیسے جوڑ جوڑ کر خرچ کرنے والی غربت بھری زندگی جی رہا تھا؟ رضا عرفان کی طرح کنوئیں کا مینڈک۔ ایک روز دنیا اسے بھی روندتی آگے بڑھ جائے گی۔ اس دنیا میں صرف اس کی عزت ہے جس کے پاس دولت ہے، حیثیت ہے، دولت سے سکھ، چین، آسائش یہاں تک کہ رشتے ناطے بھی خریدے جا سکتے ہیں اور دولت نہ ہونے پر گنوائے بھی جا سکتے ہیں۔

اس کی بھابی کو بھی اس کی ماں کی طرح بچوں کی فوج اکٹھی کرنے کا شوق تھا۔ ہر ڈھائی سال بعد آنے والے ان نمونوں سے وہ بیزار تھا۔ اسے اس چھوٹے سے ڈربہ نما گھر میں ڈھنگ سے پڑھنے کی جگہ تک نہیں ملتی تھی پھر اپنے اس مسئلے کا حل اس نے غلام عباس سے دوستی کر کے نکالا۔ یہ اس کی زندگی کا پہلا موقع تھا جب اس نے کسی کو اپنے

فائدے کے لئے استعمال کیا تھا۔ ان میں سے کوئی اس کے معیار کے مطابق نہیں تھا مگر غلام عباس سے اسے دوستی کرنی پڑی۔ اس میں اس کا اپنا مفاد پوشیدہ تھا۔ غلام عباس کے باپ کی پرانی کتابوں کی دکان تھی۔ لوگ وہاں سیکنڈ ہینڈ کتابیں خریدنے آتے تھے۔ حمیر کے لئے وہ جگہ یوں تھی جیسے وہ کسی شاندار لائبریری میں مفت پڑھنے کے لئے جاتا ہو۔ بغیر کسی خرچ کے وہاں اسے وقت بہت سی اچھی اور ایسی کتابوں سے استفادہ کا موقع ملتا تھا، جنہیں سیکنڈ ہینڈ خریدنا بھی اس کی استطاعت سے باہر تھا۔ وہاں اچھی اچھی کتابوں کا مطالعہ کر کے ہی اس نے اپنی انگریزی کو بہتر کیا تھا۔ بہتر کتابوں کے ذریعے اپنے مختلف مضامین کے نوٹس خود بناتا کہ اپنے سرکاری اسکول کے اساتذہ کے دیئے نوٹس کبھی اس کے معیار پر پورے نہیں اترتے تھے۔ اکثر وہ ضد کر کے غلام عباس کو رات کو دکان پر ہی رکنے پر مجبور کر دیتا۔ غلام عباس اپنے اور اس کے لئے گھر سے کھانا لے آتا اور پھر کھانا کھا کر دکان بند کر کے زمین پر لیٹ کر سو جاتا اور حمیر ساری ساری رات جاگ کر پڑھتا رہتا۔

وہ میٹرک میں تھا جب اس نے ایک فاسٹ فوڈ ریسٹورنٹ میں نوکری کر لی۔ وہاں کے مالک ایک انگریزی میاں بیوی تھے۔ وہ ریسٹورنٹ ایک مہنگے ترین علاقے میں تھا۔ وہاں آنے والے تمام افراد اونچے طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ اس نے وہاں بے مقصد نوکری نہیں کی تھی۔ وہ جانتا تھا وہاں کس کلاس کے افراد آتے ہیں۔ اس کا مشاہدہ غیر معمولی طور پر تیز تھا اور وہاں آنے والے ہر شاندار مرد کے اٹھنے بیٹھنے اور کھانے پینے کے انداز کو پوری طرح اپنی نظروں میں رکھتا تھا۔ جو مرد اسے بہت اچھا لگ رہا ہے، اس نے لباس کیسا پہنا ہے، وہ بول کس طرح رہا ہے، وہ بیٹھ کس طرح رہا ہے، وہ عورتوں سے کس انداز میں گفتگو کر رہا ہے۔ وہ ان تمام مینرز کو سیکھنے کی کوشش کر رہا تھا جو اسے آنے چاہئے تھے۔ اپنی لکھنے، پڑھنے میں اچھی انگریزی کو وہ اپنے انگریز مالکوں اور وہاں آنے والے غیر ملکی افراد کے ذریعے بولنے میں بھی اچھا بنا رہا تھا۔

وہاں صرف ایک سال کام کرنے ہی سے اس نے اپنی انگریزی کو ایسا بنا لیا تھا جیسے کسی کانوینٹ کا پڑھا ہوا ہو۔

میٹرک میں اس نے بورڈ میں پوزیشن لی تھی اور شہر کے سب سے بہترین کالج میں میرٹ پر اس کا داخلہ ہوا تھا۔ اب وہ اس پسماندہ اور گھٹیا سرکاری اسکول کی فضا سے نکل آیا تھا۔ اب اس کے اساتذہ بھی اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے اور اس بہترین کالج میں آنے والے تمام لڑکے بھی اچھے اچھے گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے۔

بزنس ایڈمنسٹریشن کیا بلا ہے اور آئی بی اے کس چڑیا کا نام ہے، یہ جواد رضا نہیں جانتا تھا پھر بھی اسے اتنا ضرور سمجھ میں آ گیا تھا کہ اس کا بھائی کسی بہت اچھی جگہ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہا ہے مگر اس اعلیٰ تعلیم کے حصول کے ساتھ ہی حمیر نے بھائی کے اس گھر کو چھوڑنے کی بھی بات کی، اس سے وہ بوکھلا گیا۔ اپنا گھر ہوتے چھوٹا بھائی کہیں اور کیوں جا کر رہے۔ اس نے حمیر کو روکنے کی بہت کوشش کی مگر اسے رکنا تھا ہی نہیں۔

اسے قائل کرتے اس کی آنکھوں میں آنسو تک آ گئے مگر وہ آنسو اس کے دل پر اثر نہ کر سکے۔ اپنی ذات کے لئے تھوڑا سا خود غرض اگر انسان ہو جائے تو اس میں کوئی برائی نہیں پھر یہ بھی تھا کہ جواد رضا اگر اس سے محبت کرتا تھا یا بڑے بھائی ہونے کی حیثیت سے اس نے اسکول کے دنوں میں اسے مالی تعاون فراہم کیا تھا تو اپنی مرضی سے۔ حمیر نے خود تو کبھی اس کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلایا تھا۔ ہاں جب وہ اسے اس کے اخراجات کے لئے رقم دیتا تو کبھی لینے



سے انکار نہیں کیا تھا۔ غلام عباس کو میٹرک کے بعد اور جواد رضا کو انٹر کے بعد اس نے اپنی زندگی سے باہر کر دیا تھا۔

وہ اپنے پانچ دوستوں کے ساتھ ایک کمرے کا فلیٹ شیئر کرنے لگا۔ اس کے پاس ذہانت تھی، صلاحیتیں تھیں، قابلیت تھی اور زندگی میں بہت کچھ کر دکھانے کا عزم۔ آئی بی اے میں اس کے ساتھ پڑھنے والوں کی اکثریت اونچے طبقے سے تعلق رکھتی تھی۔ جو چند مڈل کلاس کے سٹوڈنٹس وہاں تھے بھی تو ان سے دوستی اور راہ و رسم اس نے کبھی نہیں بڑھائی۔ اس کے تمام دوست امیر گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ خود اپنا فیملی بیک گراؤنڈ کسی کو نہیں بتاتا تھا، سوائے اس کے کہ اس کے پیرنٹس کی ڈیتھ ہو چکی ہے اور وہ اپنے بھائی بھابھی کے ساتھ رہنے کے بجائے دوستوں کے ساتھ فلیٹ شیئر کرتا ہے۔ ایم بی اے کر لینا اس کے خوابوں کی زندگی کی طرف لے جانے کے لئے اٹھا تھا۔

اس کا ایم بی اے ہو گیا' فارن بینک میں جاب مل گئی۔ ایک کمرشل ایریا میں ایک کمرے کے فلیٹ سے نکل کر وہ ایک بہتر رہائشی علاقے میں دو کمروں کے فلیٹ میں منتقل ہو گیا جسے وہ کسی کے ساتھ شیئر نہیں کرتا تھا۔ پچھلے فلیٹ سے چاہے وہ بہت اچھا تھا مگر پھر بھی وہ فلیٹ اور وہ علاقہ اس کے معیار کے مطابق ہرگز نہیں تھا مگر مشکل یہ تھی کہ اس سے بہتر علاقے میں اپارٹمنٹ فی الحال وہ افورڈ نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے کیریئر کی ابتدا تھی۔ ایک دم سب کچھ کیسے آ جاتا! کتنے مہینوں تک بچت کر کر کے اپنی جمع کی ہوئی ساری رقم خرچ کرنے کے بعد تو کہیں جا کر وہ ایک گاڑی خرید پایا تھا۔

اپنی جاب کی ابتدا ہی میں وہ وہاں اپنی قابلیت کو بڑی آسانی سے تسلیم کروا چکا تھا مگر اس کے باوجود بھی ابھی زندگی اس جگہ نہیں پہنچی تھی' جہاں وہ اسے دیکھنا چاہتا تھا پھر اسے وہ ملی۔ ماہا احمد علی..... خوبصورت ایسی کہ اس پر سے نگاہیں ہٹانے کو جی نہ چاہے اور ذہین ایسی کہ اس کی گفتگو خاموشی سے سنے بغیر رہا نہ جائے۔ وہ خوبصورتی اور ذہانت کا بڑا حسین امتزاج تھی۔ فورتھ سمسٹر کی اسٹوڈنٹس جو عنقریب ایم بی اے کر کے آئی بی اے سے پاس آؤٹ کرنے والی تھی۔

اس لڑکی کا پروفیشنل کیریئر کتنا شاندار ہو گا' اور اس سے پہلی ملاقات میں اس کی ذہانت اور قابلیت کو جانچنے کے بعد بہت اچھی طرح اندازہ لگا سکتا تھا۔ اس کے اندازے کم ہی غلط ثابت ہوتے تھے اور ماہا احمد علی اس کے اندازوں کے حساب سے ایک ذہین' قابل' اچھی عادات اور اچھے مزاج کی حامل لڑکی تھی۔ اسے ماہا احمد علی سے اس پہلی ملاقات میں ہی محبت ہو گئی تھی۔ کس قسم کی محبت؟ بڑی Caleulated سی....." تمام فائدے نقصان سوچنے سمجھنے اور اچھائیاں برائیاں جانچ لینے کے بعد ہونے والی محبت۔

وہ چاہتا تھا کہ وہ جس سے شادی کرے' وہ اس کی طرح اعلیٰ تعلیم یافتہ اور شاندار کیریئر رکھنے والی لڑکی ہو تا کہ دونوں مل کر ویسی زندگی گزار سکیں جیسی زندگی وہ گزارنا چاہتا تھا۔ ایک ایسی لڑکی جو اس قابل ہو کہ اس کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلے اور زندگی کو خوبصورت ترین بنانے میں اس کے شانہ بشانہ کام کرے مگر وہ یہ بھی جانتا تھا کہ ایک کمزور فیملی بیک گراؤنڈ کے ساتھ کسی اچھی فیملی کی اعلیٰ تعلیم یافتہ لڑکی کا مل جانا خاصا مشکل کام تھا۔

ماہا گو کہ اپنے لباس سے مڈل کلاس گھرانے کی فرد نظر آ رہی تھی مگر پھر بھی وہ یہ سوچ کر ڈر رہا تھا کہ کہیں اس کے گھر والے اس رشتے سے انکار نہ کر دیں۔ کوئی یونہی تو اسے اٹھا کر اپنی بیٹی نہیں دے دے گا۔ اس کے بارے میں پوری چھان بین کی جائے گی۔ غربت بھرے ماحول میں پلا ایک چپڑاسی کا بیٹا اور ایک جاہل' گنوار اور غریب شخص بھائی۔ دوستی کی بات دوسری ہے مگر شادی بیاہ کے معاملات میں لوگ حسب نسب اور خاندان کو کس قدر اہمیت دیتے

ہیں' وہ اچھی طرح جانتا تھا مگر وہ لڑکی تو جیسے ملی ہی اسے اس کے مسائل کے حل کے لئے تھی۔ اس کی ماں کو بیٹی کا بوجھ اتار کر پھینکنے کی اتنی جلدی تھی کہ اس نے رسمی کارروائی کے طور پر بھی حمیر کے بارے میں کچھ جاننے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس کی ماہا کے ساتھ شادی طے ہوگئی۔ یعنی اب وہ لڑکی اس کی زندگی میں آنے' والی تھی جسے اس کے ساتھ مل کر معاشی میدان میں سرگرم عمل ہونا تھا اور زندگی کو خوب صورت بنانے میں اس کی مدد کرنا تھی۔

اس نے تاریخ طے ہوتے ہی پہلی فرصت میں اس مہنگے علاقے میں کرائے کا اپارٹمنٹ لے لیا' جہاں رہنا اس کا دیرینہ خواب تھا۔

وہ ماہا کو بیاہ کر اپنے ساتھ آیا' وہ اس کے ساتھ پر بہت خوش تھا۔ اس کا ساتھ اسے اس کے خوابوں سے نزدیک جو کر رہا تھا لیکن وہ ماہا احمد علی' وہ تو بالکل پاگل تھی۔ وہ کہہ رہی تھی کہ وہ جاب نہیں کرے گی۔ وہ گھر پر بیٹھ کر اس کی خدمتیں کرے گی۔ اس کے منہ سے جب سے انکار سن کر وہ بوکھلا گیا۔ اس نے ایک ایم بی اے کی ہوئی لڑکی سے کیا اس لئے شادی کی تھی کہ وہ گھر بیٹھ کر مزے سے اس کی کمائی اڑائے، اس کے دیئے پیسوں پر انحصار کرے، اس کی کمائی سے گھر کے سارے اخراجات چلا کر خود کو ایک سگھڑ اور مشرقی بیوی سمجھے۔ وہ ماہا احمد علی کو اپنے لئے ایک بوجھ بنا کر نہیں بلکہ مل جل کر بوجھ اٹھانے والی بنا کر لایا تھا اور وہ اس پر بوجھ بننے کی بات کر رہی تھی۔ شکر تھا کہ وہ اسے جاب کے لئے قائل کر سکا، ورنہ اس کے انکار نے تو اس کے اوسان ہی خطا کر دیئے تھے۔ جس جگہ پر رہتا وہ اکیلا افورڈ نہیں کر سکتا تھا، وہاں ماہا کے تعاون سے آرام سے رہنے لگا۔ اس نے ماہا کو بٹھا کر کبھی اخراجات کس طرح بانٹتے ہیں، نہیں سمجھایا تھا مگر وہ واقعی ذہین لڑکی تھی۔ اس کے سمجھائے بغیر سمجھ گئی تھی کہ اسے کن کن چیزوں کا خرچا اپنے ذمہ لینا ہے۔ پورے انصاف اور عدل سے وہ دونوں مل کر اپنے گھر کا خرچا چلا رہے تھے۔ وہ ماہا کے ساتھ بہت خوش تھا۔ وہ بالکل ویسی بیوی تھی جیسی بیوی اسے چاہیے تھی اور وہ محبت اس سے اتنی والہانہ کرتی تھی کہ بعض دفعہ وہ اس کی محبت کی شدت پر حیران سا رہ جاتا تھا۔ وہ یہ بات بغیر کسی اختلاف کے تسلیم کرتا تھا کہ ان میں اگر کبھی کوئی لڑائی جھگڑا اور تکرار نہیں ہوتی تو صرف ماہا کی وجہ سے۔ وہ اس کی کسی بات سے اختلاف کرتی ہی نہیں تھی۔

کبھی وہ احسان مندی اور ممنونیت کا شکار ہوتا اور کبھی نہیں بھی ہوتا۔ یہی حال اس وقت ہوتا جب وہ اس کی خدمت کرتی، اس کے سارے کام بڑی لگن سے انجام دیتی۔ شادی کے ابتدائی دنوں سے ہی اس نے خود ہی حمیر کے سارے کام سارے کام اپنے ذمہ لے لئے تھے اور وہ اس سے اپنے کام کروانے کا آہستہ آہستہ عادی بھی ہوگیا تھا۔ وہ صرف معاشی میدان میں اس کی ہم قدم نہ تھی۔ گھریلو امور کی انجام دہی کے لحاظ سے بھی وہ ایک بہترین بیوی ثابت ہوئی تھی۔

کبھی وہ اس کی خدمتوں سے بہت متاثر ہوتا اور کبھی یہ سوچ کر بے نیاز ہو جاتا کہ ماہا کی اتنی خدمت اور اتنی محبت کا سبب یہ ہے کہ وہ بے آسرا اور لاوارث ہے۔ حمیر کے سوا اس کا اور کوئی آسرا نہیں۔ ایک کمینی سی سوچ اس کے اندر ابھرتی، اسے ماہا کا ممنون اور اس سے متاثر ہونے سے روک دیتی۔ یہ خدمتیں اور یہ محبتیں نظریہ ضرورت کے تحت ہیں۔ عدم تحفظ کا شکار، لاوارث اور تنہا لڑکی۔ اگر اس سے محبت نہیں جتائے گی تو آخر جائے گی کہاں؟ جو ایک رشتہ اسے حمیر کی صورت ملا ہے، تحفظ فراہم کرنے کو۔ ظاہر ہے اسے وہ کسی بھی قیمت پر کھونا نہیں چاہتی بھی۔



کبھی اگر اسے معمولی بخار یا نزلہ کھانسی ہی ہو جاتا تو وہ اس کی تیمارداری اور خدمت میں دن، رات ایک کر دیتی۔ اسے ہر پل اس کی صحت کی فکر رہتی۔ اسے لگتا کہ کام کی دھن میں وہ اپنی صحت سے غفلت برتتا ہے۔ یہ احساس دل میں رکھنے کے باوجود کہ وہ اس سے اتنی محبت اس لئے جتاتی ہے کہ اس کے سوا اس کا دنیا میں اور کوئی نہیں، اسے پھر بھی اس کی محبت اور والہانہ پن اچھا لگتا تھا۔ حمیر رضا کے فیصلے کبھی غلط ثابت نہیں ہوتے۔ لوگوں کے متعلق اس کی ابتدائی رائے ہمیشہ سو فیصد درست ثابت ہوتی تھی۔ ماہا اس کا بہترین انتخاب تھی۔

وہ اس کے ایک یا دو بچوں کی ماں بھی بن جاتی اور آئندہ پندرہ یا بیس سالوں بعد وہ دونوں مل کر اپنا وہ خوابوں کا گھر بھی بنا لیتے جس کے ان دونوں نے مل کر ہی خواب دیکھے تھے مگر ان تمام ممکنات کی راہ میں سدرہ آفاق آگئی۔ وہ حمیر سے پہلی ملاقات کے ابتدائی گھنٹوں میں ہی اس کی محبت میں مبتلا ہوگئی تھی اور حمیر اس کے باپ کے اسٹیٹس اور اثر و رسوخ کی محبت میں، ہر گزرتے دن کے ساتھ وہ اس کے قریب آتی جا رہی تھی اور وہ اسے خود سے دور کرنے کے قریب آتی جا رہی تھی اور وہ اسے خود سے دور کرنے کے بجائے مزید قریب آنے کا موقع دے رہا تھا۔ اس دوستی اور اس تعلق کی پہل اگر سدرہ کی جانب سے ہوئی تھی تو اس میں مزید بے تکلفی اور قربت پیدا کرنے میں اس کی کوششوں کا بھی پورا پورا دخل تھا۔ وہ ایسا کیوں کر رہا ہے۔ اس کے اپنے اندر جنگ سی چھڑ جاتی۔ وہ اس لڑکی کو خود سے دور کیوں نہیں کر دیتا، اسے صاف صاف یہ کیوں نہیں جتا دیتا کہ وہ ایک خوشگوار شادی شدہ زندگی گزار رہا ہے، خوشگوار زندگی؟

کہاں ہے زندگی خوشگوار، یہ خوشگوار زندگی ہے کہ وہ ایک دو کمروں کے پارٹمنٹ میں کرایہ پر رہتا ہے؟ اپنی من پسند گاڑی خریدنا ہنوز اس کی استطاعت سے باہر ہے؟ یا یہ خوشگوار زندگی ہے کہ جس گھر کا اس نے دس سال کی عمر میں خواب دیکھا تھا، وہ اسے آئندہ بیس سالوں بعد ڈھلتی عمر میں نصیب ہوگا؟ اس کی تنخواہ جو ماہا سمیت بہت سے لوگوں کو قابل رشک لگتی ہے، اس کی اپنی نگاہوں میں تو وہ کبھی سرے سے جچی ہی نہیں۔ بس ایک مجبوری کا سودا ہے۔

حمیر رضا جسے اللہ نے ایسا ذہن اور ایسی قابلیت دی ہے کہ وہ ایک دن میں لاکھوں بلکہ کروڑوں روپے کما سکتا ہے۔ پورے ایک ماہ دن رات محنت کر کے بھی لاکھ روپیہ نہیں کما پاتا۔ وہ ایک لڑکی سدرہ آفاق اگر اس کی زندگی میں شامل ہو جائے تو وہ کہاں سے کہاں جا پہنچے گا۔ سدرہ کی پیش قدمیوں کا اگر وہ والہانہ انداز میں پرتپاک خیر مقدم کر رہا تھا تو گھر ماہا کی محبتیں اور خدمتیں اسے الجھا رہی تھیں۔

ان دنوں اس کی خدمتوں پر خوش ہونے اور فخر محسوس کرنے کے بجائے وہ الجھنے لگا تھا پھر یہ الجھن اس کے رویوں سے بھی جھلکنے لگی۔ وہ اسے کیا کہہ کر چھوڑے؟ وہ اس کے ساتھ اتنی اچھی ہے وہ اس سے لڑ کر، اسے اس کی کوئی برائی بتا کر بھی نہیں چھوڑ سکتا۔ لیکن وہ ماہا کی ان اچھائیوں کا کیا کرے کہ یہ اچھائیاں اسے وہ زندگی نہیں دے سکتیں، جیسی زندگی وہ جینا چاہتا ہے۔

سدرہ سے شادی کر لی تو ماہا کا کیا ہوگا؟ وہ تو بالکل اکیلی ہو جائے گی۔ اس کے سوا تو اس کا کوئی بھی نہیں ہے۔ تو کیا وہ صرف اس لئے اپنے خوابوں کی زندگی سے منہ پھیر لے کہ اس زندگی کی طرف بڑھنے سے ماہا اکیلی رہ جائے گی۔ "یہ موقع ہاتھ سے نکل گیا تو پھر بیٹھے پچھتاتے رہنے" "ماہا اکیلی رہ جائے گی" والے اپنے اس احمقانہ

خیال کے ساتھ۔''

پڑھی لکھی لڑکی ہے، سنبھال لے گی خود۔

اس کے اپنے اندر سوال جواب ہوتے۔ اس فیصلے کے حق میں اور مخالفت میں دونوں طرح دلائل دیئے جاتے۔ وہ ان دنوں ایسی الجھنوں میں گرفتار تھا۔ اس کی یہ الجھنیں بلاوجہ اس کا رویہ تلخ کر رہی تھیں وہ خوامخواہ کسی بھی چھوٹی سی بات پر جھگڑا شروع کر دیتا۔

مگر وہ تو اس کی تلخیوں کے جواب میں پہلے سے بھی زیادہ نرم ہوگئی تھی۔ بہت تلاش اور کوشش کے باوجود بھی جب اسے چھوڑنے کی کوئی معقول وجہ اسے نہیں ملی تو آخر کار اس نے یہی طے کر لیا کہ اسے بغیر کسی وجہ کے ہی چھوڑ دے۔

سدرہ آفاق جیسی لڑکی اسے زندگی میں پھر کبھی نہیں ملنی تھی اور وہ زندگی میں پچھتانا نہیں چاہتا اور ماہا...... اسے اس کے لئے افسوس ہے، وہ اسے خوشی سے نہیں چھوڑ رہا۔ وہ ماہا کو یہ سب کچھ بتائے گا، بہت اچھی طرح۔ اچھے لہجے میں۔ دوستوں کے سے انداز میں۔ وہ اس کا دل دکھنے پر اس سے معذرت بھی کر لے گا۔

مگر اس کے بہت اچھے انداز اور نرم لہجے کے باوجود بھی اس بات پر ماہا کا ردعمل' پاگل پن اور جنون سے بھرا ہوا تھا۔ وہ اس سے کتنی مشکلوں سے پیچھا چھڑا پایا' یہ اس کا دل ہی جانتا تھا۔ سدرہ سے شادی کے کافی عرصے بعد اس نے ماہا سے طلاق کی بات کرنے کے لئے فون کیا۔ تب تو رونا پیٹنا مچا کر اس نے اسے کام کرنے ہی نہیں دیا تھا۔ اب وہ یہ اہم ترین بات کرنا چاہتا تھا۔ ماہا احمد علی واقع خودداری اور عزت نفس سے نا آشنا تھی۔ وہ اس سے طلاق لینے سے انکار کر رہی تھی۔

☆☆☆

سدرہ نے اسے اپنے پریگنٹ ہونے کی خبر سنائی تو اس خبر پر کوئی خاص خوشی محسوس نہ کرنے کے باوجود اس نے مصنوعی خوشی کا اظہار کیا۔ سدرہ چاہتی تھی کہ بچے کی پیدائش کراچی میں ہو۔ اس موقع پر وہ اپنی ممی کو اپنے قریب دیکھنا چاہتی تھی اور وہ بیماری کی وجہ سے امریکہ آنہیں سکتی تھی۔ سدرہ کافی پہلے کراچی چلی گئی تھی جبکہ وہ پریگنینسی کے آخری دنوں میں اپنے بہت سے کام چھوڑ کر وہاں جانے پر صرف اس وجہ سے مجبور ہوا تھا کہ اس کی غیر موجودگی پر وہ خاصی خفا تھی اور ہر فون کال میں اس خفگی کا اظہار کر رہی تھی۔ وہ ابھی اپنے ڈاکٹریٹ میں مصروف تھا اور بھی کئی طرح کے اہم ترین کاموں میں اس نے خود کو مصروف رکھا ہوا تھا۔ اس کے لئے اس کا کیریئر دنیا کے ہر رشتے سے زیادہ اہم تھا مگر پھر وہی بات کہ سدرہ آفاق کو ناراض کرنے کا رسک وہ بالکل نہیں لے سکتا تھا۔

ماہا کراچی میں اسے ایک دکان میں ملی تو اسے دیکھ کر اسے صرف یہ خوف لاحق ہوا کہ وہ سدرہ کے سامنے اس کے پاس آ کر اس کی منتیں نہ کرنے لگے۔ اسے اپنے پاس واپس بلانے کے لئے التجائیں نہ کرنے لگے۔ پتا نہیں کس مٹی کی بنی تھی' اس سے نفرت کرنے کے بجائے وہ ابھی بھی اس کی محبت میں مبتلا تھی۔ اس میں انا تھی ہی نہیں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ اسے چھوڑ کر چلا گیا ہے۔ اس کی واپسی کی دل و جان سے منتظر تھی۔

سدرہ تو اس کے نام سے بھی خار کھاتی تھی۔ اگر وہ پاس آ گئی تو لازمی طور پر سدرہ کا موڈ خراب ہو جائے گا لیکن شکر تھا کہ وہ پاس آئی نہیں تھی۔ ہاں اس کے دوست نے ضرور شاہ کے وفادار کا کردار نبھاتے کچھ طنز کرنے کی



کوشش کی تھی۔

اگر وہ باپ بن ہی رہا تھا تو اسے بیٹے کا باپ بننا تھا مگر قسمت نے یہاں اس کا ساتھ نہیں دیا تھا۔ اسے بیٹی کی کوئی خوشی نہیں ہوئی تھی مگر صرف سدرہ کی وجہ سے اس نے جھوٹی خوشی کا اظہار کیا اور جھک کر کاٹ میں لیٹی اپنی بیٹی کو پیار کرنے لگا۔

''ہم اپنی بیٹی کا کیا نام رکھیں حمیر؟'' اس نے سدرہ کی آواز سنی اور کہیں بہت دور یاد کا ایک دریچہ کھل گیا۔

''ہم اپنی بیٹی کا نام امل رکھیں گے۔''

''امل۔'' بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔ یہ نام لیتے وقت اسے خود اپنی آواز بہت اجنبی لگی۔ اس آواز میں کون سے دکھ بول رہے تھے، کون سے غم رو رہے تھے؟

''اس کا مطلب ہے، تم دل سے یہی چاہتے تھے کہ ہمارے ہاں بیٹی ہو۔ تب ہی تو پہلے سے اس کا نام بھی سوچ رکھا ہے، امل حمیر رضا۔ ہاں یہ بہت اچھا نام ہے۔'' وہ جواباً سر اثبات میں ہلاتا بمشکل مسکرایا۔

اپنی بیٹی کو جب دیکھتا اسے نجانے کیوں اس کا خیال آتا۔ اسے بچے کتنے پسند تھے، خاص طور پر لڑکیاں۔ اگر امل اس کی بیٹی ہوتی۔ ماں بن کر وہ تو خوشی سے پاگل ہی ہو جاتی۔ سدرہ نے امل کے لئے گورنس رکھی تھی۔ اگر وہ ہوتی تو اپنی بیٹی کے سب ناز نخرے خود اٹھاتی بالکل اسی طرح جیسے اس کے باپ کے اٹھاتی تھی۔ یہ وہ کس طرح کی باتیں سوچنے لگا ہے۔

ماہا احمد علی اس کا بیتا ہوا کل ہے، اس کا ماضی ہے۔ جذبات، احساسات، یادیں ان سب کے لئے حمیر رضا کی زندگی میں کوئی جگہ نہیں۔

☆☆☆

"To Homi with love" یہ حومی کون ہے؟'' وہ بیڈ پر اپنے گرد کتابیں پھیلائے بیٹھا اپنا کام کر رہا تھا۔ سدرہ نے وہاں آ کر بیٹھتے یونہی ایک کتاب اٹھا لی اور اس کے اوراق پلٹنے لگی۔ تیزی سے قلم چلاتے اس کے ہاتھ یک دم ساکت ہوئے تھے۔ جینکنگ پر یہ بہت مہنگی کتاب اسے ماہا نے تحفہ میں دی تھی۔

''میرے دوست مجھے کہتے تھے۔''

''لیکن یہ لکھائی اور یہ انداز تو کسی لڑکی کا ہے۔''

''تو کیا میرے دوستوں میں لڑکیاں شامل نہیں ہو سکتیں بالکل اسی طرح جیسے تمہارے دوستوں میں بہت سے مرد بھی شامل ہیں۔''

وہ بلاوجہ تلخ ہوا لیکن سدرہ اس وقت بہت اچھے موڈ میں تھی، اس لئے تلخی پر دھیان دیئے بغیر بولی۔

''یعنی یہ تمہارا نک نیم ہے۔ مجھے کیوں نہیں بتایا؟'' میں بھی تمہیں اسی نام سے بلاتی۔ چلو خیر، اب میں تمہیں تمہارے دوستوں کی طرح حومی ہی کہا کروں گی۔''

''نہیں۔'' وہ اتنی سختی سے ''نہیں'' بولا کہ سدرہ تعجب سے اس کی شکل دیکھنے لگی۔

''میرا مطلب ہے یہ نام مجھے پسند نہیں ہے۔ میرے دوست بھی مجھے اس نام سے چڑتا دیکھ کر جان بوجھ کر

مجھے زچ کرنے کو یہ نام لیتے تھے۔'' اپنے لہجے کی سختی کا اثر زائل کرنے کے لئے وہ فوراً وضاحتی انداز میں بولا۔

''دے دیتے اسے یہ نام لینے کا حق۔ جب اس کا ہر حق چھین کر اس عورت کی جھولی میں ڈال دیا تو ایک نام سے کیا فرق پڑتا ہے۔'' اس کے اندر کوئی اس سے لڑ پڑا۔ اپنے اندر سے ابھرتی یہ آواز اسے بہت ڈراتی تھی۔ اس آواز کے پاس بہت سارے دلائل تھے۔ یہ آواز ہر بار اسے لاجواب کر دیتی تھی اور یہ آواز دن بھر میں نجانے کتنی بار اس کے اندر گونجا کرتی تھی۔

اسے لگتا تھا کہ اسے اپنے سب کام ماہا سے کروانے کی عادت ہو گئی تھی۔ اس لئے اب جب اپنے وہ سارے چھوٹے چھوٹے کام بروقت نہیں ملتے تو ان کاموں کو انجام دینے والی کا خیال آجاتا ہے۔ یہ ایک فطری امر ہے۔ مگر اب یہاں اتنا سارا وقت گزار لینے کے بعد اس کے جو کام ملازمہ نہیں کرتی تھی، اس نے بخوشی انہیں خود کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس کی زندگی کے تمام معمولات بالکل ترتیب اور توازن کے ساتھ انجام پا رہے تھے۔ تب وہ کیوں یاد آتی تھی؟ تب کیوں اس کا خیال آتا تھا؟ ایسی ایسی جگہوں پر اس کا خیال آجاتا تھا جہاں اس کے یاد آنے کی کوئی تک بنتی نہیں تھی۔ کسی بہت بڑے بینکر سے ملتے وقت، اپنی سیکرٹری کو کچھ سمجھاتے وقت۔ ''تم مجھے اپنی سیکرٹری اپائنٹ کر لو۔ میں تمہارا سارا کام بالکل ٹھیک کیا کروں گی۔''

''حومی! مجھے پتا ہے، آسمانوں سے بھی اونچے تمہارے معیار ہیں مگر پلیز کچھ دیر تو اپنی اس خوشی پر پوری طرح خوش ہو لو۔'' اس کا کیریئر اونچائیوں کی طرف مسلسل پرواز کئے چلا جا رہا تھا اور ہر کامیابی پر جب وہ یہ سوچتا کہ ابھی اپنے معیار سے وہ کافی نیچے ہے تو یہ آواز اسے اس کے ناشکرے پن کا احساس دلاتی، ابھی جو خوشی ملی ہے اس پر تو خوش ہو لو۔ ہاں کل سے پھر بلندیوں کی طرف اور تیز اڑنا شروع کر دینا۔''

☆☆☆

آفاق جمال اس کی برق کی رفتار پر حیران تھے۔ ان ہی کے کانٹیکٹس کو بہت خوبصورتی سے استعمال کر کے وہ تھوڑے ہی وقت میں کہاں سے کہاں پہنچ گیا تھا۔ انہیں لگتا کہ چند سالوں میں تو وہ انہیں پیچھے چھوڑ چھاڑ کہاں سے کہاں پہنچا ہوا ہوگا۔ ان کے سہارے، ان ہی کی بیساکھیاں پکڑ کر اس نے چلنا شروع کیا تھا اور محض چند سالوں ہی میں وہ اس قابل ہو گیا تھا کہ ان بیساکھیوں کے بغیر اپنے قدموں پر کھڑا ہو سکے۔

وہ انسانوں کو اپنے فائدے کے لئے اتنی سہولت سے استعمال کر لیا کرتا تھا کہ آفاق جمال جیسا شاندار بینکنگ کیریئر رکھنے والا انسان اس کی قابلیت اور ذہانت کو تسلیم کرنے پر خود کو مجبور پاتا۔

وہ جائز، ناجائز، صحیح اور غلط کے چکر میں نہیں پڑتا تھا۔ ہاں مگر کام ہمیشہ اس طرح کرتا کہ وہ جائز اور صحیح نظر آتا۔ اس کا کیریئر دیکھنے والوں کو سو فیصد بے داغ نظر آتا اور وہ ہر لحاظ سے ایک ایماندار بینکر۔ آفاق جمال خود کو بہت ذہین چالاک سمجھتے تھے مگر وہ تو اس معاملے میں ان سے بھی آگے تھا۔ لوگ اس پر اعتبار کرتے اور وہ بڑی مہارت سے انہیں ڈبل کراس کرتا۔

کبھی وہ انہیں دھوکہ دیتا تو وہ اسے اس کی اوقات یاد دلا کر، اس سے سب کچھ چھین کر واپس پاکستان نہیں بھیج سکتے تھے۔ وہ یہاں اپنی جڑیں مضبوط کر چکا تھا۔ ان کے کانٹیکٹس اب ان سے زیادہ حمیر رضا کے کانٹیکٹس



تھے۔ وہ سدرہ سے اگر کبھی اپنے خدشات کا اظہار کرتے تھے تو وہ ان کی یہ بات مانتی نہیں تھی کہ حمیر کبھی اسے دھوکہ دے سکتا ہے۔

☆☆☆

''ہم اپنے گھر کے لان کے ایک حصے میں صرف گلاب ہی گلاب لگائیں گے۔ سرخ، گلابی، سفید بہت سے رنگوں کے گلاب۔''

اس کے خوابوں کا وہ گھر جو بیس سالوں بعد بھی وہ نہیں بنا پایا فقط ساڑھے چار سال کی مختصر مدت میں بن چکا تھا۔ وہاں کی کنسٹرکشن، وہاں کا انٹیریئر ہر چیز بہترین تھی۔ ہر لحاظ سے اس کے معیار کے مطابق۔ ٹائلز اٹالین ہونے چاہئیں۔ شیشے بلجیم کے اور لان میں لگائی جانے والی گھاس بھی امپورٹڈ ہی ہونی چاہئے۔ اس شاندار مکان میں ہر چیز شاندار تھی اور اس کے لان میں ڈھیر سارے گلاب بھی تھے۔ ایک قطعہ میں صرف گلاب ہی گلاب کھلے تھے جو اس نے خاص طور پر کہہ کر وہاں لگوائے تھے۔

''جس نے گلابوں کی بات کی تھی، جب اسے کوئی اہمیت نہیں دی تو اس کی خواہش کو اہمیت دینے کی بھی کیا ضرورت تھی؟'' تکمیل کے بعد جب وہ امریکہ سے پہلی بار اپنے گھر کو دیکھنے آیا اور اپنے اندر چھپے اس دس سال کے پھٹے پرانے کپڑے پہنے لڑکے کی خوشی پر مسکرایا تب مسکراتے جو اس نے گلابوں کے بارے میں سوچا تو اندر سے وہی ملامت کرتی آواز اس کی ساری مسکراہٹ چھین کر لے گئی۔ وہ اپنے گھر کے ہر کونے میں فخر اور خوشی کے ساتھ پھر رہا تھا مگر جیسی خوشی اس موقع پر اسے ہونی چاہئے تھی۔ وہ اس سے کوسوں دور تھی۔

ہر چیز اس کے خوابوں کے عین مطابق تھی اور وہ اپنے خواب کی تعبیر میں کھڑا خوشی کو ڈھونڈ رہا تھا؟ یہ لمحہ تو اس کی زندگی کا سب سے یادگار لمحہ تھا۔ آج جب یہ لمحہ اس کی دسترس میں ہے تو وہ یوں کھڑا ہے جیسے یہ لمحہ زندگی کے دوسرے عام سے لمحوں جیسا ہی تو ہے۔

سدرہ اس کے ساتھ تھی۔ وہ اس گھر کو دیکھ کر خوش تھی۔ یہ اس کی زندگی کا پہلا گھر نہیں تھا۔ ہاں یہ اس کے شوہر کا پہلا ذاتی عالی شان گھر ضرور تھا مگر وہ اس طرح کیسے خوش ہو سکتی تھی جیسے وہ ہوتی جس کے ساتھ مل کر اس نے اس گھر کا خواب دیکھا تھا جو اس گھر کے حصول کے لئے اس کے ساتھ جدوجہد میں پوری طرح شریک تھی جو ہمیشہ ایک گھر کے لئے ترسی تھی اور جس نے ''اپنا ایک شاندار سا گھر ہو'' والا اس کا خواب بڑی محبتوں سے اپنی پلکوں پر سجا لیا تھا۔ وہ سدرہ کے ساتھ اپنے بیڈروم میں داخل ہوا تھا۔

''اگر کسی دن کوئی مجھ سے زیادہ ذہین لڑکی مل گئی تو میں اور میرا فخر تو منہ دیکھتے رہ جائیں گے۔'' ہاں وہ اور اس کا فخر منہ ہی تو دیکھتے رہ گئے تھے۔ آج اس بیڈروم میں وہ ایک دوسری لڑکی کو اپنی بیوی کی حیثیت سے ساتھ لئے کھڑا تھا۔

''میں اپنے گھر کو اگنور نہیں کرنا چاہتی۔ میں اپنے گھر کو اور تمہیں پورا ٹائم دینا چاہتی ہوں۔''

''اپنا گھر؟'' کتنے یقین سے وہ اپنا گھر کا لفظ استعمال کرتی تھی۔ وہ گھر جو ان دونوں کے ملنے سے گھر بنتا تھا۔

''تم جیسا کہو گے میں ویسا کروں گی۔ میں شام میں کوئی اور جاب کر لوں گی اور سنڈے کو بھی کچھ کر لیا کروں گی۔ میں اب تمہیں بالکل بھی شکایت کا موقع نہیں دوں گی۔ میں تمہاری ہر بات مانوں گی۔''

اسی محل نما گھر کو جلد سے جلد حاصل کر لینے کی دھن میں اسے چھوڑ دیا تھا۔ اسے، جو اسی گھر کو حاصل کرنے کے لئے اس سے مزید محنت اور پہلے سے بھی زیادہ کام کرنے کا وعدہ کر رہی تھی۔

''تمہیں یقین بھی نہیں آئے گا کہ ماہا اتنی محنت کر سکتی ہے۔ میں تمہیں اتنی محنت کر کے دکھاؤں گی۔'' اسے کوئی کوڑے مار رہا تھا، بہت زور زور سے۔ اس کا پورا وجود زخمی اور لہولہان ہو رہا تھا۔ وہ سسک رہا تھا، وہ تڑپ رہا تھا۔

''ڈھائی سالوں میں اسے خود بھی خبر نہ ہو پائی کہ کب اس کی Calculated محبت غیر مشروط محبت میں بدل گئی۔ ہر سود و زیاں سے بے نیاز، ہر نفع نقصان سے بے پروا۔ حمیر رضا کا دل محبت کے جذبے سے بھی آشنا ہے کہ اسے یہ آشنائی ایک پیار بھرا دل رکھنے والی، محبتوں پر اندھا یقین رکھنے والی لڑکی نے دی تھی۔ کبھی اس دل کو اہمیت دی ہوتی، اس کی دھڑکنوں کو لمحہ بھر کے لئے ہی توجہ سے سنا ہوتا تو پتا چلتا بھی کہ اس دل میں وہ کس جگہ پر خود بخود ہی بس گئی ہے۔ ماہا کو چھوڑتے وقت جو کشمکش تھی، جو بے چینی اور جو الجھن تھی، وہ اسی دل کے سبب تو تھی۔

اگر پیسہ خوشی لاتا ہے تو پھر آج تو اسے دل و جان سے خوش ہونا چاہئے۔ پھر ایسا کیوں ہے کہ وہ ہنسنے کی کوشش کرتا ہے تو اندر دل پر قطرہ قطرہ آنسو گرنے لگتے ہیں۔

''صرف محبت میرے لئے کافی نہیں۔'' یہی کہا تھا ناں ماہا سے اس نے۔ صرف محبت؟ محبت کیا صرف ہوتی ہے؟۔

''تمہارے لئے یہ مذاق ہو گا مگر مجھے ایسا لگا جیسے کوئی مجھے پھانسی کے تختے پر کھینچ کر لے جا رہا ہو۔ میں تمہارے بغیر زندہ رہ ہی نہیں سکتی۔''

وہ ہر رات اس کے پاس آتی۔ اس کے سینے پر سر رکھ کر روتی۔ اسے اپنے سینے پر واقعی ایک بوجھ سا محسوس ہوتا، اپنی قمیض کسی کے آنسوؤں سے بھیگتی ہوئی لگتی اور اپنے بازوؤں پر کسی کے لرزتے ہوئے ہاتھوں کی مضبوط گرفت۔

''میں تمہارے بغیر مر جاؤں گی۔ مجھے چھوڑ کر مت جاؤ حوی۔'' یہ روتی ہوئی آواز آج بھی اس کا تعاقب کرتی تھی۔ اسے ہر پل یہی لگتا جیسے وہ اپنے اپارٹمنٹ کے دروازے سے اپنا سارا سامان لے کر باہر نکل رہا ہو اور وہ اس کے پیچھے بھاگ کر آتی اسے روک رہی ہو۔

جب اس روز وہ اس گھر سے چلا تھا تو صرف ماہا ہی کو نہیں چھوڑا تھا بلکہ اپنے وجود کا ایک حصہ ہمیشہ کے لئے وہاں چھوڑ آیا تھا۔ اپنے وجود کے اس کھوئے حصے کو اب ہر جا تلاشتا، پر وہ کھو جانے والا حصہ اسے کہیں پر بھی ملتا نہیں تھا۔

''مجھ سے ناراض ہو کر سوؤ گے تو تمہیں نیند آ جائے گی؟''

''وہ رات میں لیٹے لیٹے اٹھ کر بیٹھ جاتا۔ اسے سدرہ سے چڑ ہونے لگتی، اسے سدرہ سے نفرت ہونے لگتی، اسے اس کا وجود ناقابل برداشت لگنے لگتا۔ پھر وہ دبے پاؤں اس کے خیالوں میں چلی آتی۔

وہ سدرہ آفاق کے ساتھ شادی کے چار ساڑھے چار سال تک بہت اچھا اور محبت کرنے والا شوہر بن کر رہا۔ مگر پھر اس کا رویہ سدرہ کے ساتھ بدلنے لگا اور پھر ان کی شادی شدہ زندگی کے تلخ اور اس کے بعد تلخ ترین دور کا آغاز ہوا۔ وہ سدرہ کو نظر انداز کرنے لگا، وہ اس کے ساتھ کہیں چلنے کو کہتی اور وہ ''میرے پاس وقت نہیں ہے'' کہہ کر صاف انکار کر دیتا، وہ اسے بتا کر گھر پر اپنے مہمانوں کو انوائٹ کرتی اور وہ مہمان کھانا کھا کر رخصت بھی ہو جاتے تب تک گھر



واپس نہ آتا۔ نتیجتاً وہ اس سے لڑتی، جھگڑا کرتی۔ سدرہ کو اس سے بہت ساری شکایتیں رہنے لگی تھیں۔ وہ گھر کو ہوٹل سمجھتا ہے جہاں وہ صرف سونے آتا ہے۔ وہ پیسہ کمانے کی ایسی ہوس میں مبتلا ہے کہ دولت اور اپنے کیریئر کے آگے اسے اپنی فیملی نظر ہی نہیں آتی۔

وہ ان شکایتوں کی پروا کیوں کرتا، جبکہ وہ ان شکایتوں کو پیدا ہی جان بوجھ کر کر رہا تھا۔ جب تک وہ چاہتا تھا کہ سدرہ کو اس سے کوئی شکایت نہ ہو، تب تک اس نے اسے کوئی شکایت نہیں ہونے دی تھی اور اب وہ چاہتا تھا کہ سدرہ کو اس سے شکایتیں ہی شکایتیں ہوں۔ اسے اب سدرہ آفاق اور اس کے گلے شکوؤں سے کوئی غرض نہیں تھی۔

آفاق جمال سال بھر پہلے ریٹائر ہو چکے تھے اور ریٹائرمنٹ کے بعد انہوں نے اور ان کی بیوی نے مستقل رہائش کے لئے کراچی کو منتخب کیا تھا۔ اپنے ریٹائرڈ سسر سے اسے نہ تو اب کوئی خطرہ تھا اور نہ ان کی کوئی ضرورت جو وہ ان کی بیٹی کی ناراضیوں سے خائف ہوتا۔ بلکہ سچائی تو یہ تھی کہ وہ در پردہ چاہتا ہی یہی تھا کہ سدرہ اس سے لڑ جھگڑ کر خود ہی اسے چھوڑ جائے۔ کئی مہینوں تک ان کے درمیان لڑائی جھگڑوں کا سلسلہ جاری رہا۔

سدرہ جاہل عورتوں کی طرح اس پر چلاتی، اس سے لڑتی اور وہ اسے بکتا جھکتا چھوڑ کر گھر سے نکل جاتا، اگر گھر پر ہی ہوتا تو اپنے کمرے میں چلا جاتا اور اگر وہ کمرے میں آ کر لڑتی تو اسے نظر انداز کر کے سونے لیٹ جاتا۔ سدرہ نے غصے میں الگ کمرے میں سونا شروع کر دیا، اس کی صحت پر اس سے کون سا فرق پڑتا تھا، البتہ وہ تو دل ہی دل میں خوش ہوا تھا۔ ان دونوں کے لڑائی جھگڑوں اور تلخ رویوں کا اثر ایل پر لازمی پڑ رہا تھا۔ وہ ماں کو چیختا چلاتا دیکھ کر رونے لگتی تھی۔ ایل کے رونے سے اسے ہمیشہ تکلیف ہوتی۔ وہ بیٹی کی پیدائش پر چاہے خوش نہیں ہوا تھا مگر اب اپنی بیٹی سے اسے بہت پیار ہو گیا تھا۔ وہ چھوٹی سی گڑیا اپنی من موہنی اداؤں اور پیار بھری معصومانہ باتوں سے خود ہی باپ کے دل میں اپنی محبت پیدا کروا گئی تھی۔ کئی مہینوں کے لڑائی جھگڑوں کے بعد ایک رات سدرہ اس کے کمرے میں آئی اور اسے اپنی اور ایل کی پاکستان روانگی کی اطلاع دی۔

''میں ممی، ڈیڈی کے پاس واپس جا رہی ہوں، ہمیشہ کے لیے۔ مجھے ایسے آدمی کے ساتھ ہرگز نہیں رہنا جسے میری کوئی پروا نہیں، جس کی زندگی میں میری کوئی اہمیت نہیں، جو میرے ساتھ ہوتے ہوئے بھی کبھی میرے ساتھ نہیں ہوتا۔ تم سے شادی میری زندگی کا سب سے غلط فیصلہ تھی۔ ڈیڈی تمہارے بارے میں درست خدشات کا اظہار کرتے تھے۔ تب میں ان کی بات نہیں مانتی تھی۔ احسان فراموش اور محسن کش انسان ہو تم۔ مجھ سے اپنا کیریئر بنانے اور دولت اکٹھی کرنے کے لیے شادی کی اور آج جب سب کچھ حاصل کر لیا تو مجھے چھوڑ کر واپس اسی ماہا احمد علی کے پاس جانے کے بہانے تلاش کر رہے ہو۔ وہ تمہاری مڈل کلاس بیوی جو تمہارا سر اور تمہارے پاؤں دباتی تھی، تمہاری جی حضوری کرتی تھی۔ ان پانچ سالوں میں تم میرے ساتھ تو ایک پل نہیں رہے۔ تم نے ہر پل مجھ میں اسی کی شکل ڈھونڈی ہے۔ دولت تو اکٹھی کر ہی چکے ہو۔ جاؤ اب شوق سے اسی کے پاس، میں اور میری بیٹی تمہاری زندگی سے نکل رہے ہیں۔''

جو وہ چاہتا تھا وہ بڑی آسانی سے خود ہی ہو گیا تھا۔ سدرہ آفاق کے اس کی زندگی سے نکل جانے سے اس کا سارا مسئلہ ہی حل ہو رہا تھا۔ بس مسئلہ اگر تھا تو ایل کا۔ وہ اپنی بیٹی کو اپنے ساتھ رکھنا چاہتا تھا۔ مگر یہ سدرہ؟ وہ اس

معاملے میں اسے کس قدر زچ کر دینے کی اہلیت رکھتی تھی وہ جانتا تھا۔ فی الحال اس نے امل کے جانے پر کسی ردعمل کا اظہار نہیں کیا۔

وہ سدرہ سے امل کو چھین لے گا، چاہے جس بھی طرح۔ ''ماہا کا دل تو اتنا پیارا ہے کہ وہ امل کے لیے سدرہ سے بھی اچھی ماں ثابت ہو گی۔ سدرہ کرتی کیا ہے، گورنس کے رحم و کرم پر تو چھوڑ رکھا ہے، اس نے بچی کو۔ ماہا تو اسے بہت پیار سے، بڑے ناز و نعم میں پالے گی۔'' اس نے ماہا کے بارے میں بہت یقین سے سوچا۔

وہ ماہا کے پاس جائے گا۔ ہو سکتا ہے وہ تھوڑی بہت ناراضی کا اظہار کرے، وہ اسے منا لے گا۔ وہ اس سے معافی بھی مانگ لے گا۔ اب جب اس کے پاس دولت، مرتبہ، مقام سب کچھ ہے تو بس صرف ماہا ہی کی کمی ہے۔ یہ کمی دور ہو جائے پھر وہ پورے دل سے خوش ہو گا۔

ماہا اور وہ دونوں مل کر اپنے خوابوں کے گھر میں رہیں گے اور ہاں امل بھی تو۔ امل بھی ان دونوں کے ساتھ رہے گی۔ وہ اپنی بیٹی کو سدرہ کے پاس تو کسی قیمت پر نہیں چھوڑے گا۔ وہ سدرہ کے اپنی زندگی سے نکلنے کے فوراً بعد ہی ماہا کے پاس چلا جانا چاہتا تھا۔

مگر اس کے جانے کے بعد اگلے تین ماہ اسے اس سبب امریکہ میں گزارنے پڑے کہ اپنے پروفیشن کے حوالے سے چند بہت اہم کام نمٹانے کے ساتھ ساتھ اسے سولہ فروری کا بھی انتظار تھا۔ وہ ماہا کے پاس واپس سولہ فروری کے دن جانا چاہتا تھا۔ وہ یہ جان کر کتنی خوش ہو گی کہ حمیر نے اس دن کو اتنے اہتمام سے یاد رکھا ہوا ہے۔

ان تین ماہ میں اس نے سدرہ سے کوئی رابطہ نہیں کیا تھا، ہاں امل سے ضرور وہ فون پر بات کیا کرتا تھا۔ آفاق جمال نے اسے سدرہ کے کراچی پہنچنے کے ایک دن بعد ہی فون کیا تھا، وہ یقیناً اسے خوب کھری کھری سناتا اور اسے دھمکانا چاہتے تھے۔ مگر اس نے ان کی فون کال سننا پسند ہی نہیں کی تھی۔ وہ جانتا تھا جب تک سدرہ اور اس کی شادی برقرار ہے، آفاق جمال مصلحتاً خاموش رہیں گے۔ جس روز اس نے سدرہ کو طلاق دے دی پھر وہ اسے تباہ و برباد کرنے کے لیے اپنے سارے وسائل، تمام اثر و رسوخ اور ساری طاقت استعمال کر ڈالیں گے۔ اسے آفاق جمال کی طاقت کا بالکل ٹھیک ٹھیک اندازہ تھا اور ان کی طاقت کے جواب میں اپنی طاقت کا بھی۔ اس بوڑھے اور زخمی شیر سے مقابلے کی جو صورت حال عنقریب اسے درپیش آنے والی تھی وہ اس کے لئے خود کو بہت پہلے ہی سے بہت اچھی طرح تیار کر چکا تھا۔ وہ آفاق جمال سے بالکل خائف نہیں تھا۔

جس روز وہ کراچی جانے کے لئے جہاز میں سوار ہوا، اس کا دل اس نوعمر عاشق کی طرح اچھلنے اور چھلانگیں مارنے لگا جو ایک عرصہ کی جدائی کے بعد اپنی محبوب سے ملنے والا ہو۔

☆☆☆

شام کے ساڑھے پانچ بج رہے تھے جب ماہا کی سیکرٹری اس کے پاس آئی۔

''سر! ماہا میم کا ابھی فون آیا تھا۔ وہ میٹنگ ختم ہونے کے بعد آفس واپس نہیں آئیں گی۔'' وہ پچھلے چار گھنٹوں سے اس کے کیبن میں بیٹھا اس کی واپسی کا منتظر تھا۔

''اس نے جواباً بات سمجھ لینے والے انداز میں سر تو ہلا دیا، مگر کرسی پر سے اٹھا نہیں۔ دفتری اوقات ختم ہونے



پر اس کی سیکرٹری اب یقیناً اپنے گھر روانگی کے لئے تیار تھی۔ جب سیکرٹری کی اپنی باس سے فون پر بات ہوئی تھی تو پھر اس نے یقیناً اسے یہ بھی بتایا ہو گا کہ ''میم! جو صاحب صبح سے آپ سے ملنے کے لئے آئے بیٹھے ہیں، وہ ابھی بھی آپ کے آفس میں موجود ہیں۔'' اور یہ بات بھی یقینی نظر آ رہی تھی کہ ماہا نے اپنی سیکرٹری کو حمیر کے متعلق کچھ ہدایات جاری نہیں کی تھیں، اگر کی ہوتیں تو سیکرٹری حمیر کو اس کی مرضی پر یہاں بیٹھا چھوڑ کر کبھی آفس سے نہ جاتی۔ وہ حمیر کو اپنی جگہ جم کر بیٹھا دیکھ کر شانے اچکاتی کیبن سے باہر چلی گئیں۔

ماہا واپس آئے گی۔ اسے لازمی طور پر آنا ہے۔ اس سے گفتگو کو نامکمل چھوڑ کر وہ کبھی اپنے گھر نہیں جا سکتی۔ وہ ماہا سے بات کئے بغیر یہاں سے ہرگز نہیں جائے گا۔

گو وہ یہ توقع لے کر یہاں نہیں آیا تھا کہ ماہا اس کے ساتھ اس طرح کا برتاؤ کرے گی۔ لیکن اگر وہ ایسا کر رہی تھی تو وہ اس صورت حال کا خندہ پیشانی سے سامنا کرے گا۔ کتنی دیر کی ہو گی اس کی ناراضی؟ وہ اس سے اتنی بے تحاشا محبت کرتی ہے کہ زیادہ دیر تک اپنی ناراضی پر قائم رہ ہی نہیں پائے گی۔ جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا، آفس میں لوگوں کا شور اور کاموں کی گہما گہمی ختم ہوتی چلی جا رہی تھی۔ سوا سات بجے تو آفس میں مکمل سناٹا پھیل چکا تھا۔

شاید اب اکا دکا ہی کوئی لوگ وہاں موجود تھے۔

ماہا کا کیبن مکمل اندھیرے میں ڈوبا تھا۔ وہ اسی اندھیرے پر بیٹھا رہا۔ اس نے اٹھ کر ٹیوب لائٹ آن کرنے کی کوشش نہیں کی۔ ساڑھے سات بجے اسے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ کوئی کوریڈور میں چل رہا تھا۔ وہ اس طرف بڑھتے ایک ایک قدم کو اپنے دل سے ہم آہنگ پا رہا تھا۔ یہ کون آ رہا تھا۔ اس کا دل جانتا تھا۔ چند منٹوں بعد اس نے دروازہ کھلنے کی آواز سنی۔ اندر قدم رکھتے ہی اس نے سوئچ بورڈ پر تیزی سے ہاتھ چلاتے تمام لائٹس آن کر دی تھیں۔ یک دم ہی کمرہ روشنی میں نہا گیا اور وہ اتنے گھنٹوں سے اندھیرے میں بیٹھے رہنے کے سبب یک دم روشنی ہو جانے پر فوراً اپنی آنکھوں کو صحیح سے کھول نہیں پایا۔

''آپ ابھی تک یہیں ہیں؟'' حمیر کو معلوم تھا کہ یہ ایک مصنوعی حیرت ہے، وہ جانتی تھی کہ وہ ابھی بھی یہاں موجود ہے تب ہی تو ساڑھے سات بجے اپنے آفس واپس آئی تھی۔ وہ آنکھیں کھول سکنے کے قابل ہوتے ہی فوراً کرسی پر سے کھڑا ہوا اور ماہا کے عین سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔

''ماہا! تم مجھے جو سزا دینا چاہتی ہو دو، بس مجھے معاف کر دو۔'' وہ طنزیہ نگاہوں سے اسے دیکھتی رہی۔

''تم سے دور جا کر مجھے پتا چلا کہ تم سے دور جانا میری زندگی کی سب سے بڑی غلطی تھی۔ جس طرح تم مجھ سے محبت کرتی ہو، اسی طرح میں بھی تم سے محبت کرتا ہوں صرف تم سے۔''

''اور یہ محبت کتنے دنوں تک برقرار رہے گی؟ کتنے دنوں بعد وہ دن آئے گا جب تم مجھے بتاؤ گے کہ چونکہ تم میرے ساتھ خوش نہیں ہو، اس لئے کسی اور کے پاس جا رہے ہو۔'' وہ درپردہ طنز سے براہ راست غصے کی طرف آئی تھی۔ کم از کم اس نے اسے ''تم'' تو کہا تھا۔ اس کے لئے اس وقت یہی بہت تھا۔

''اب ایسا کبھی نہیں ہو گا ماہا! تم میرا اعتبار کرو۔''

''اعتبار کروں تمہارا؟ اس شخص کا جس نے میرے پاؤں کے نیچے سے زمین کھینچ لی اور سر کے اوپر سے

آسمان چھین لیا۔ میں تمہیں کتنی بے وقوف نظر آتی ہوں حمیر رضا؟ کتنی؟ تم پر تو اب میں مرتے دم تک بھی اعتبار نہیں کروں گی۔ کلثوم کہتی ہے اور بالکل سچ کہتی ہے کہ لوگ کچھ عرصہ کوئی جانور پال لیں تو اس سے بھی محبت ہو جاتی ہے۔ کہیں جانے لگیں تو اپنے پالتو جانور رکھوالی کے لئے کسی عزیز یا دوست کے پاس چھوڑ جاتے ہیں۔ تمہاری نگاہوں میں تو میری پالتو جانور جتنی اہمیت بھی نہیں تھی۔''

وہ اب اس پر چلا رہی تھی۔ جس لہجے میں اس نے کبھی حمیر سے بات نہیں کی تھی، اس میں کر رہی تھی۔

''میں راستہ بھٹک گیا تھا ماہا! میرے قدم بھٹک گئے تھے۔ مگر راستہ بھٹکنے سے کیا ہوتا ہے ماہا! راستہ بھٹک کر بھی میں آیا تو تمہارے ہی پاس ہوں۔ میری منزل تم ہو ماہا۔''

''تم اور غلط فیصلہ کرو گے؟ تمہارا کوئی فیصلہ غلط نہیں ہوتا حمیر رضا! تم جیسا شاطر اور چالاک انسان ہر کام سوچ سمجھ کر اور باقاعدہ پلاننگ کے ساتھ کرتا ہے۔ مجھ سے شادی پلاننگ کر کے کی، مجھے چھوڑا پلاننگ کرنے کے بعد اور اب واپس آئے ہو تو کچھ پلان کرنے کے بعد ہی آئے ہو گے تم اور راستے سے بھٹکو گے؟''

''ماہا! تم میرا یقین کیوں نہیں کر رہی ہو۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ بالکل سچی محبت۔ اب سے نہیں بلکہ جب ہم ساتھ تھے تب سے۔ مجھے خود اپنی محبت کی شدتوں کا ادراک نہیں تھا۔''

''تم کسی سے محبت نہیں کرتے حمیر رضا! تم کسی سے محبت کر ہی نہیں سکتے۔ تم ہر کام اپنا فائدہ نقصان دیکھ کر کرتے ہو۔ انسانوں کی اہمیت تمہاری نگاہوں میں بے جان اور حقیر چیزوں سے زیادہ نہیں۔ اپنے سوا تم کسی سے محبت نہیں کرتے۔'' وہ اس کے التجائیہ انداز کے جواب میں حقارت اور تنفر سے بولی۔

''ماہا! جو وقت ہم نے ساتھ گزارا تھا، کیا اس وقت کا کوئی ایک پل بھی ایسا نہیں جسے یاد کر کے تمہیں یہ احساس ہو کہ میں تب بھی تم سے محبت کرتا تھا؟ ہماری زندگی کتنی خوب صورت تھی ماہا۔'' وہ منت بھرے انداز میں اسے پرانے وقتوں کی یاد دلانے لگا۔

''ہم نے زندگی کب شیئر کی تھی حمیر رضا! ہم نے تو صرف ایک اپارٹمنٹ شیئر کیا تھا۔ پھر جب اس اپارٹمنٹ شیئر کرنے والی کی تمہیں ضرورت نہ رہی تو تم کہیں اور شفٹ ہو گئے۔'' وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کر غرائی۔ ''ہم یورپ یا امریکہ میں نہیں رہتے، اس لئے نکاح کے دو بول پڑھوا لئے تھے ورنہ تمہاری نظر میں ہمارے رشتے کی حقیقت یہ تھی کہ میں تمہارے ساتھ تمہارا اپارٹمنٹ شیئر کرتی تھی، تمہارا روم شیئر کرتی تھی، تمہارا بیڈ شیئر کرتی تھی۔ دن میں تمہاری فلیٹ میٹ اور رات میں میری حیثیت ایک مسٹریس کی ہو جاتی تھی۔ بیوی کی حیثیت تو تم نے مجھے کبھی دی نہیں۔'' ''تم میری بیوی تھیں ماہا۔ خدا گواہ ہے میں نے سچے دل سے تمہیں اپنی بیوی کی حیثیت دی تھی۔''

''بیوی کی حیثیت؟ بیوی کو اپنے بچے کی ماں بننے سے کبھی نہیں روکا جاتا حمیر رضا! ہاں مسٹریس کو ضرور روکا جاتا ہے۔''

''ماہا! خدا کے لئے بس کرو۔ مت استعمال کرو اپنے لئے اتنے گھٹیا لفظ۔'' اس کے لفظ دل پر ایسی چوٹ لگا رہے تھے کہ وہ چلا ہی تو اٹھا تھا۔ کتنی بدل گئی تھی وہ۔ کیسی زبان استعمال کر رہی تھی۔

''تمہاری بیوی وہ ہے جو تمہاری بیٹی کی ماں ہے اور جسے چھوڑ کر تم مجھ سے نجانے کیا لینے آئے ہو۔ خصلت ہے شاید یہ مردوں کی، ایک عورت پر اکتفا کر کے نہیں بیٹھ سکتے۔'' وہ اس سے زیادہ تیز آواز میں چلائی۔

''بیوی میں ہزار برائیاں ہوں تب بھی ظالم سے ظالم شوہر تک اسے چھوڑتے وقت یہ ضرور سوچتا ہو گا کہ یہ اکیلی ہے۔ میرے بغیر یہ تنہا لڑکی کہاں جائے گی؟ کیسے جیئے گی؟ پروا کی تھی تم نے میری؟ میری عزت اور آبرو کی؟ پروا کرتے بھی کیوں، میں تمہاری بیوی تھی کب۔ آج کس ڈھٹائی سے میرے سامنے آ کر کھڑے ہو گئے ہو۔ میں تمہاری دیدہ دلیری پر جتنا حیران ہوں کم ہے۔''

وہ اب بے بسی سے اس کی سمت دیکھے چلا جا رہا تھا۔ وہ اس سے نفرت میں اتنی انتہاؤں تک پہنچ چکی ہو گی، ایسا تو اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ اس کی جنونی محبت دیکھی تھی، جو اپنی محبت کے بدلے میں اس سے اور کچھ تو کیا محبت بھی نہیں مانگتی تھی۔ پھر وہ محبت ختم کیسے ہو سکتی تھی؟

''تمہیں مجھ سے محبت تو ہے ناں ماہا! میری خاطر نہ سہی اپنی اس محبت کی خاطر ہی مجھے معاف کر دو۔'' وہ ایک قدم مزید آگے بڑھا کر اس کے بالکل نزدیک ہو گیا۔ وہ فوراً پیچھے ہٹی۔ اس نے اپنے قدم ایک سیکنڈ میں پیچھے ہٹائے۔ اس کے قریب ہونے کا وہ ایک سیکنڈ بھی اسے نہیں مل سکا تھا۔ وہ دوبارہ اس سے اتنے ہی فاصلے پر کھڑی ہو گئی تھی۔

''محبت تو کیا، میرے دل میں تم جیسے مادہ پرست، موقع پرست، دھوکے باز اور گھٹیا انسان کے لئے سرے سے کوئی جگہ ہی نہیں ہے۔''

''جھوٹ بولتی ہو تم۔'' وہ غصے سے چلایا۔ ''جھوٹ ہے یہ ماہا! سراسر جھوٹ۔ میں تمہارے اس جھوٹ کو کبھی نہیں مانوں گا۔ اگر تمہیں مجھ سے محبت نہ رہی ہوتی تو تم اتنے سالوں تک اس رشتے کو جڑا نہ رہنے دیتیں۔ تم پہلی فرصت میں مجھ سے طلاق کا مطالبہ کر کے اپنا اور میرا ہر تعلق ختم کر دیتیں۔ یوں اتنے برسوں سے تنہا زندگی نہ گزار رہی ہوتیں۔''

''میرے دل میں تمہارے لئے محبت کا تو کیا نفرت کا جذبہ بھی نہیں ہے حمیر رضا! جذبات انسانوں کے لئے رکھے جاتے ہیں۔ تم جیسے جانوروں کے لئے نہیں۔ میرے دل میں تمہارے لئے کوئی جذبہ نہیں ہے۔'' وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کر بے خوف و خطر بولی۔

''میں ابھی بھی نہیں مانوں گا تمہارا جھوٹ۔ اگر تم ایسا ہی سوچتی ہو تو کبھی مجھ سے طلاق کا کیوں نہیں کہا؟ کیوں ہمارے رشتے کو جڑا رہنے دیا؟ یاد ہے یہ رشتہ میں نے تمہاری خواہش پر جڑا رہنے دیا تھا۔''

''وہ اس لئے تا کہ جب تم آسمان تک کی بلندیوں کی سیر کرنے کے بعد واپس زمین پر میرے پاس آؤ اپنی انہیں خوش فہمیوں سمیت تو میں تمہیں تمہارے منہ پر رد کر سکوں، بالکل اسی طرح دھتکار سکوں جیسے تم نے مجھے دھتکارا تھا۔ کیا اپنی بے عزتی کا بدلہ نہیں لینا تھا مجھے تم سے؟''

وہ لبوں پر تلخ مسکراہٹ لے کر استہزائیہ انداز میں زور سے ہنسی۔

''رد ہونا کیسا لگ رہا ہے حمیر رضا؟''

''ماہا! مجھے معاف کر دو پلیز۔ تمہیں کیا لگتا ہے مجھے اپنی غلطیوں کا احساس نہیں؟ غصے میں ایسی باتیں مت کہو جو تمہارا دل میرے لئے محسوس بھی نہیں کرتا۔ تمہاری محبت کی شدت سے کیا میں واقف نہیں؟ میری محبت میں کوئی کمی ہو سکتی ہے مگر تم جو محبت مجھ سے کرتی ہو وہ بالکل سچی اور کبھی نہ ختم ہونے والی ہے، یہ میں اچھی طرح جانتا ہوں۔''

وہ پھر قدم بڑھا کر اس کے نزدیک ہوا اور آہستگی سے اس کے ہاتھوں کے اوپر اپنے ہاتھ رکھ دیئے۔ اس کی آنکھوں میں اب ہلکی ہلکی سی نمی تیرنے لگی تھی۔ اس لڑکی کی بدگمانیاں اور اس کی نفرتیں دل کس طور سہے؟ اس نے بہت نفرت بھرے انداز میں فوراً اپنے ہاتھ پیچھے کیے۔

"یہ حق تم بہت پہلے کھو چکے ہو حمیر رضا!" اس نے انگلی اٹھا کر اسے تنبیہ کی۔ اس کے چہرے پر بے انتہا غصہ تھا۔

"ماہا تم۔" وہ اپنی آنکھوں کی نمی کو پی کر کچھ بولنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس نے حمیر کی بات کاٹ دی۔

"میں تم سے محبت نہیں کرتی اور تم سے طلاق چاہتی ہوں اور اگر تمہیں میری کہی بات کا یقین نہیں تو ثبوت میں ابھی دے دیتی ہوں۔" اپنے ہاتھ میں پکڑے موبائل پر وہ تیز رفتاری سے کوئی نمبر ملانے لگی۔ وہ دھک دھک کرتے دل کے ساتھ اس کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔ وہ کیا کرنے جا رہی تھی؟ وہ کسے کال کر رہی تھی؟

"ہیلو فائز! میں ماہا بول رہی ہوں۔"

حمیر بے یقینی سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا اور وہ فون پر کہہ رہی تھی۔

"فائز! تم نے آٹھ، نو ماہ قبل شادی کا جو پرپوزل میرے سامنے رکھا تھا، وہ مجھے قبول ہے۔ میں تم سے شادی کے لئے تیار ہوں۔"

جس پہاڑ کی چوٹی پر وہ بڑے فخر سے، سرفرازی اور کامرانی سے سرشار کھڑا تھا، اس پر سے اسے کسی نے بہت زور سے دھکا دیا تھا۔ وہ لڑھکتا ہوا نیچے جا رہا تھا۔ نیچے اور نیچے ایک گہری کھائی کی طرف۔

"میں چاہتی ہوں، ہماری شادی سادگی سے ہو اور جلدی ہو۔ تم اپنے مما، پاپا سے ہمارے رشتے کی بات کرلو۔"

اس کے کان اس مانوس آواز اور اجنبی لہجے کو سن ضرور رہے تھے، پہچان نہیں پا رہے تھے۔ مگر کھائی کے اندر بھی رگوں کو کاٹتے اور دل کو چیرتے یہ بے رحم اور سفاک لفظ اس کی سماعتیں سن رہی تھیں۔

"آ گیا اب یقین میری بات کا یا ثبوت کے طور پر تمہیں اپنی شادی کا دعوت نامہ دینا پڑے گا۔" وہ فون پر بات ختم کرنے کے بعد اس کی طرف طنز اور حقارت سے دیکھنے لگی۔

"میں فائز عبید سے شادی کر رہی ہوں حمیر رضا! اور تم سے جو واحد چیز میں چاہتی ہوں، وہ طلاق ہے۔ امید کرتی ہوں تم مجھے خلع کی طرف جانے پر مجبور نہیں کرو گے۔"

اسے لگ رہا تھا اس کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے ہیں۔ اپنا چہرہ، گردن اور گریبان سب اسے بھیگتے ہوئے لگ رہے تھے۔ ایسا کب ہوا؟ آخر کب؟ کب وہ لڑکی محبت کرتے کرتے اس سے نفرت کرنے لگی، زندگی کی بازی ہار جانے والا شخص اب کیا کہے؟ وہ خاموش تھا۔ وہ اپنے کانوں سے بندے، نیکلس اتارنے لگی اور سب سے آخر میں اپنی انگلی میں پہنی انگوٹھی اس نے کھینچ کر اتاری۔ وہ تینوں چیزیں اب اس کی مٹھی میں تھیں۔

"آج میں تمہارا اور اپنا ہر رشتہ ختم کر رہی ہوں۔ ماہا احمد علی اور حمیر رضا، جس کہانی کے دو کردار تھے، وہ کہانی آج ختم ہوئی۔"

اس نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے سامنے کیا اور اس کی کھلی ہتھیلی پر وہ تینوں زیور ڈال دیئے، جو کبھی اس نے بہت محبت سے اسے اپنے ہاتھوں سے پہنائے تھے اور جنہیں وہ کبھی خود سے جدا نہیں کرتی تھی۔



کہانی ختم ہوگئی؟ کیا واقعی کہانی اس طرح لمحہ بھر میں ختم ہو جاتی ہے؟ بس ایک پل میں سب کچھ ختم؟

"جب میں تم سے ہر رشتہ ختم کر رہی ہوں تو پھر اب مجھے، تمہیں کچھ کہنے کا کوئی حق تو نہیں ہے۔ پھر بھی بغیر کسی حق کے تمہیں ایک نصیحت کرنا چاہتی ہوں۔ تم دنیا میں کسی سے محبت نہیں کر سکتے، تم کسی کے ہو نہیں سکے، سوائے اپنے۔ مگر اپنی بیٹی کے ساتھ وہ سلوک مت کرنا جو دوسروں کے ساتھ کرتے ہو۔ تم کسی کے نہیں ہوئے، کم از کم اپنی بیٹی کے تو ہو جاؤ۔ ورنہ جس لہجے میں آج میں تم سے بات کر رہی ہوں، اسی میں آج سے بیس سال بعد تمہاری بیٹی کرے گی۔ پھر کیا کرو گے؟ پھر کہاں جاؤ گے؟ پھر تو تم سر اٹھا کر زندہ رہنے کے قابل بھی نہیں رہو گے۔"

وہ اس کے سامنے سے ہٹی اور پُروقار قدموں سے چلتی اپنی میز کے قریب جا کر کھڑی ہوگئی۔ "خدا حافظ حمیر رضا! ہمیشہ کے لئے۔"

دروازے اور حمیر کے درمیان وہی کھڑی تھی۔ درمیان سے ہٹ کر اس نے اسے جانے کا راستہ دے دیا تھا۔ سر اٹھا کر باوقار انداز میں کھڑی اور اسے اپنی زندگی سے نکل جانے کو کہہ رہی تھی۔ نہ اس کے چہرے پر کوئی رنج و ملال تھا نہ آنکھوں میں کوئی آنسو۔ وہ حمیر رضا کو آنکھوں سے ایک آنسو ٹپکائے بغیر اپنی زندگی سے وداع کر رہی تھی۔

قلبِ مضطر ٹھہر لمحہ بھر کے لئے
اس کی رخصت کا ہنگام درپیش ہے
وصلِ شیریں سے گل رنگ ماحول میں
اک کہانی کو انجام درپیش ہے
آخری بار جی بھر کے میں دیکھ لوں
کیا خبر پھر کبھی ہم ملیں نہ ملیں
شاخِ فردا ثمر بار ہو کہ نہ ہو
کس کو معلوم پھر گل کھلیں نہ کھلیں
ایسی ساعت کہاں، ایسا منظر کہاں
رنگ ہی رنگ ہے، روپ ہی روپ ہے
چھاؤں آنچل کی لے لوں گھڑی دو گھڑی
پھر سفر در سفر دھوپ ہی دھوپ ہے

اس کے اور ماہا کے بیچ جو چیز حائل ہو رہی تھی وہ اس کے آنسو تھے۔ وہ اسے دیکھ لینا چاہتا تھا، بہت اچھی طرح مگر اس کے آنسو اس کے چہرے کو دھندلا کر کے دکھا رہے تھے۔

"اچھا میں چلا جاتا ہوں۔ پھر کبھی تمہاری زندگی میں۔ آؤں گا بھی نہیں۔ بس ایک بار، صرف ایک بار آخری بار مجھے اسی پیار بھرے مانوس لہجے میں حوی کہہ دو اور تو میں کچھ بھی نہیں مانگ رہا تم سے۔ صرف ایک چھوٹا سا لفظ ماہا! اسی پیار سے صرف ایک آخری بار مجھے حوی کہہ دو۔"

اس کے ہونٹ ہلے ضرور تھے، مگر ان سے کوئی آواز نہیں نکلی تھی اور اگر اس کے منہ سے یہ منت بھری آواز

نکل بھی جاتی تو کیا وہ اس کی یہ خواہش پوری کرتی؟ اس پر سے نگاہیں ہٹا کر وہ دروازے کی طرف بڑھا۔ وہ اپنی زندگی کی بازی ہار کر یہاں سے جا رہا تھا۔

اس نے دروازہ کھولنے کے لئے ہاتھ کو آگے بڑھایا تو اس کا دل کسی چھوٹے سے بچے کی طرح پیر پٹخ پٹخ کر رونے لگا۔

''مجھے نہیں جانا یہاں سے۔'' اس نے دروازے کو کھول لیا اور باہر قدم رکھنے لگا۔

''مجھے چھوڑ کر مت جاؤ حوی!'' وہ خوشی سے جھومتا بے ساختہ بہت تیزی سے پلٹا۔

گھوم کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ میز کے پاس اسی سرد اور سپاٹ انداز میں کھڑی خوشی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کے چلے جانے کی منتظر۔ وہ پھر دروازے کی طرف پلٹا اور یک دم اسے یوں لگا جیسے وہ بھاگتی ہوئی اس کے پاس آگئی ہے۔ اس کے بالکل پیچھے آ کر کھڑی ہوگئی ہے۔

''میں مذاق کر رہی تھی حوی! تم نے مجھے اتنے دکھ دیئے، اتنا رلایا۔ کیا میں تمہیں تھوڑا سا تنگ بھی نہیں کر سکتی تھی۔ چلو ہم زندگی کو وہیں سے شروع کرتے ہیں، جہاں پر ہم الگ ہوئے تھے۔''

اس بار وہ پلٹا نہیں۔ گھوم کر اس کی طرف دیکھا نہیں۔ یہ صرف واہمہ ہے۔ یہ حقیقت ہو نہیں سکتی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ وہ اسے اپنی زندگی سے ہمیشہ کے لئے نکال رہی ہے۔

''ہیپی اینی ورسری حوی!'' وہ اس کے گلے میں بانہیں ڈال کر مسکرا رہی تھی۔

ارے ہاں آج تو سولہ فروری تھی۔ اسے یاد کیوں نہیں رہا۔

''ہاں واقعی یہ تو میری غلطی ہے۔ مجھے یاد دلانا چاہئے تھا۔'' وہ شرارت سے کھلکھلائی تھی۔ اور حمیر رضا کے لبوں سے کئی آہیں اور سسکیاں نکلی تھیں۔

ان کی زندگی میں سب کچھ صحیح تھا۔ پھر غلط ہونا کہاں سے شروع ہوا تھا؟ اس کی اپنی وجہ سے، اس کی طمع، اس کی حرص، اس کا لالچ۔ آسمان تک پہنچ جانے کی اس کی خواہش۔

اب کیوں نہیں ہوتے خوش؟ پا تو لیا وہ سب کچھ جو زندگی سے اپنے لئے پانا چاہتے تھے۔ کیا ہوا جو اس لڑکی کو کھو دیا جس کے بغیر زندگی کا کوئی پل سکھ سے نہیں جیا۔

اس کا دل چاہ رہا تھا وہ زندگی کے پچھلے ساڑھے پانچ سالوں کو حرف غلط کی طرح مٹا دے۔

ستمبر کی اس گرم دوپہر جب وہ اخبار اپنے سامنے پھیلائے بیٹھا تھا اور وہ اس کے بالوں میں تیل کی مالش کر رہی تھی۔ وہ کشمکش کا شکار تھا کہ ماہا سے کیسے بات کرے۔ کاش وہ پل پھر سے مل جائے۔ اس بار وہ ماہا سے سدرہ کے بارے میں کچھ نہ کہے گا۔ اب کی بار وہ اس دن کچھ غلط نہیں ہونے دے گا اور سدرہ آفاق کو اگلے روز آفس میں صاف صاف بتا دے گا کہ وہ اس سے شادی نہیں کر سکتا۔ زندگی مجھے ایک موقع دے دو۔

زندگی ہمیں ایک اور موقع کیوں نہیں دیتی؟

انہی آنسو بھری نگاہوں سے اسے آخری بار دیکھ لینے کے بعد اس نے دروازہ بند کیا۔ یہ دروازہ آج اس پر ہمیشہ کے لئے بند ہو گیا تھا۔



''کیا آج چاند گرہن ہے یا یہ اماوس کی رات ہے؟'' وہ کھلے آسمان کے نیچے کھڑا اس عمارت کو اندھیرے میں دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا جس میں سے وہ ابھی باہر نکلا تھا۔

''ایسی تاریکی، انتہا گہرا اندھیرا اور اداسی، فضائیں جیسے کسی کی موت پر نوحہ پڑھ رہی ہیں۔ کون مرا ہے آج؟'' بہت دیر تک وہاں کھڑے ہو کر روتے رہنے کے بعد وہ اپنی گاڑی کے پاس آ گیا۔

''تم نے آج پہلی بار مجھ سے کچھ مانگا ہے۔ ہمارے اتنے برسوں کے تعلق میں پہلی بار میں تمہیں مایوس نہیں کروں گا۔ جو تم مجھ سے چاہتی ہو وہ میں تمہیں دے دوں گا۔ لیکن ماہا! اتنے برسوں میں اگر آج پہلی بار تم نے مجھ سے کچھ مانگ ہی لیا تھا تو جدائی کیوں؟ میرا ساتھ کیوں نہیں؟'' اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے اس نے بہت شکست خوردہ انداز میں گاڑی سٹارٹ کر دی۔

وہ راستے طے کر کے گھر کس طرح پہنچا، اسے بالکل پتا نہیں تھا۔ اسے بس یہ پتا چل رہا تھا کہ زندگی میں دور دور تک اندھیرا ہے۔ زندگی میں اتنی بھاگ دوڑ اتنی مشقت، اتنی افراتفری، اتنی چالاکی، اتنی ہوشیاری، اتنی دغا بازی کس کے لئے؟ آخر کس کے لئے؟ یہ عالیشان مقبرہ، نوحے اور آہیں سننے کے لئے؟ تنہا بیٹھ کر رونے کے لئے؟ وہ ایک بار پھر ضبط کھو بیٹھا تھا۔ مٹھیاں بھینچ کر وہ زمین پر بیٹھتا چلا گیا۔ وہ بچوں کی طرح بلک بلک کر رو رہا تھا۔ اس عالیشان محل میں آج وہ تنہا تھا۔ اس کے آنسو صاف کرنے والا یہاں کوئی نہ تھا۔ اس کا غم بانٹنے والا یہاں کوئی نہ تھا۔ آج جب اپنے دل پر چوٹ لگی تھی تو احساس ہوا تھا کہ جن دلوں کو اس نے توڑا تھا، جن لوگوں کو اس کی وجہ سے تکلیفیں پہنچی تھیں انہیں بھی ایسا ہی درد ہوتا ہوگا، اسے صرف ماہا احمد علی چاہئے پورچ میں کوئی گاڑی آ کر رکی تھی۔ روتے روتے اس نے سر اٹھا کر اس طرف دیکھا۔ امل گاڑی سے اتر رہی تھی۔ جب وہ پاکستان آیا تھا، سدرہ، امل کو ڈرائیور کے ساتھ اس سے ملنے کے لئے بھیج دیا کرتی تھی۔ وہ امل کو حمیر سے ملنے سے نہیں روکتی تھی۔

امل اسے لان میں دیکھ کر دیوانہ وار بھاگتی ہوئی اس کی طرف آ گئی اور اس کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

''ہیلو پاپا!'' اس سے بولا نہیں جا رہا تھا ورنہ ہمیشہ کی طرح اسے سلام کی جگہ ہیلو کہنے پر ٹوکتا ضرور۔ ان لمحوں میں امل کا آ جانا کیسا جان فزا لگا تھا۔ اس گھٹن اور حبس میں جیسے کہیں سے تازہ ہوا کا جھونکا آ گیا تھا۔ حمیر نے بیٹی کے ماتھے پر پیار کیا۔

''پاپا! آپ رو رہے ہیں؟'' امل نے اس کی ٹھوڑی پر انگلی لگاتے ہوئے معصومیت سے پوچھا۔

''ایک شہزادی تھی بہت اچھی، بہت پیار کرنے والی۔ آج پاپا نے اسے کھو دیا ہے بیٹا۔'' اسے اپنے ساتھ لگا کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑا تھا۔

وہ اپنے ننھے منے ہاتھوں سے اس کے آنسو صاف ضرور کر رہی تھی مگر اس کی سمجھ میں نہ باپ کی بات آئی تھی اور نہ اس کا رونا۔

''آج اس نے مجھے میری بہت بدصورت شکل دکھائی ہے امل! بہت بدصورت بہت کریہہ۔ میں پاتال میں اتر رہا ہوں۔ اپنی کس کس غلطی کو یاد کروں؟ کس کس پر روؤں؟'' وہ چار سال کی بچی کیسے سمجھتی ان لفظوں کا مفہوم جو باپ کو کوئی تسلی کوئی دلاسہ دے پاتی۔

"تم کسی کے نہیں ہوئے، کم از کم اپنی بیٹی کے تو ہو جاؤ۔ اپنی بیٹی کے ساتھ وہ سلوک مت کرنا جو دوسروں کے ساتھ کرتے ہو۔" کچھ دیر پہلے کی سنی بات اچانک اس کی سماعتوں میں گونجی، اس نے کھینچ کر امل کو اپنے بازوؤں میں چھپالیا اور اس کے بالوں پر والہانہ انداز میں پیار کرنے لگا۔

"تم ٹھیک کہتی ہو، میں صرف خود سے محبت کرتا ہوں۔ صرف اپنے بارے میں سوچتا ہوں۔ دوسروں کے احساسات تو میرے لئے کچھ معنی رکھتے ہی نہیں۔ تمہارے پاس واپس گیا تو بھی صرف اپنی خوشی کا سوچا اور امل اپنی بیٹی اس کے بارے میں کچھ نہیں سوچا۔ اسے اس کی ماں سے چھین لوں گا۔ اپنے سیاہ نامۂ اعمال میں ایک اور گناہ لکھواؤں گا۔ ایک ماں سے اس کی بیٹی کو چھین کر۔ تمہارے پاس واپس گیا تو اس عورت کے بارے میں ایک پل کو نہ سوچا۔ جو میری بیوی، میری بچی کی ماں ہے، سچی محبت سیکھی تھی تو اعلیٰ ظرفی اور وسعت قلبی بھی سیکھنی تھی۔ خود غرضی اور محبت ایک ہی دل میں ساتھ ساتھ کیسے رہ سکتے ہیں؟"

وہ اٹھ کر سیدھا کھڑا ہوا امل کو گود میں اٹھالیا۔ وہ اس کے رخساروں پر پیار کر رہا تھا۔

اللہ نے اسے ایک محبتوں سے بھرا گھر اور ایک جان نچھاور کرنے والی بیوی دی تھی۔ اس کی اوقات سے بہت زیادہ۔ وہی ناشکرا، نکلا، اللہ کی عطاؤں کی قدر نہ کر سکا۔ گزرتے وقت کے ساتھ شاید ماہا کبھی اسے معاف کر دے مگر وہ خود اپنے آپ کو کیسے معاف کر پائے گا؟ اس کے دل کی عدالت اسے مجرم قرار دے چکی تھی۔ اب تو ساری زندگی ندامتوں اور پچھتاوؤں کے ساتھ گزارنی تھی۔

"میں اللہ سے دعا کروں گا کہ وہ میری بیٹی میں سب عادتیں تمہارے جیسی ڈال دے۔ تمہارے جیسا محبتوں سے بھرا دل، تمہارے جیسا خلوص۔ تمہارے جیسی سادگی، تمہارے جیسی مروت۔ سب کچھ تمہارے جیسا ہو بس قسمت تم سے مختلف ہو۔ اس کے نصیب میں کوئی حمیر رضا نہ ہو۔"

اس نے اپنا نام بہت نفرت سے لیا تھا۔

امل کے چہرے پر اب بیزاری نظر آنے لگی تھی۔ ایک گہرا سانس لے کر اس نے خود کو اس ماحول سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی، جس میں وہ موجود تھا۔

"امل! ماما کے پاس چلیں؟" وہ بیٹی کی خاطر مسکرایا۔ امل نے بہت خوشی سے فوراً زور و شور سے اقرار میں گردن ہلائی۔ اس نے امل کو گود سے اتار کر واپس نیچے کھڑا کیا اور پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر پورچ کی طرف آ گیا۔

"میں تمہارے بغیر کیسے جیوں گا مجھے نہیں معلوم مگر میں نے پھر بھی جینا تو ہے، اپنی بیٹی کی خاطر۔" گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے اس نے سوچا۔ امل جوش و خروش سے بولتی اسے نجانے اپنے کون کون سے دوستوں کے قصے سنا رہی تھی اور وہ گاڑی چلاتا بے دھیانی سے اس کی باتیں سن رہا تھا۔ اس کا رخ آفاق جمال کے گھر کی طرف تھا، جہاں سے اسے سدرہ کو واپس اپنے گھر لانا تھا۔ اپنی بیٹی کی ماں کو واپس اپنے گھر لانا تھا۔

"ماہا! میری دعا ہے کہ تم ہمیشہ خوش رہو۔ میرے ساتھ نہ سہی کسی اور کے ساتھ سہی لیکن تم خوش رہو۔ جو زیادتیاں میں نے تمہارے ساتھ کیں، فائز عبید ان سب کا ازالہ کر دے۔ میں بدقسمت تھا تمہاری قدر نہ کر سکا۔ مگر وہ تمہاری دل سے قدر کرے۔ وہ تمہیں ٹوٹ کر چاہے۔ وہ تم سے بے انتہا محبت کرے۔"



اس کے لبوں سے بے آواز وہ سچی دعائیں نکل رہی تھیں، جو ساری کی ساری اس لڑکی کے نام تھیں، جو اسے محبت کرنا سکھا گئی تھی، جو اسے خلوص اور مہر و وفا کے معنی سمجھا گئی تھی۔

"فائز عبید! تم بہت خوش نصیب ہو۔ دنیا کی بہترین عورتوں میں سے ایک عورت تمہیں ملنے جا رہی ہے۔ اس کا ہمیشہ بہت، بہت خیال رکھنا۔ دیکھنا اس کا دل بڑا نازک ہے۔ میرے دیئے زخموں سے چور چور ہے، تم اس دل کو کبھی کوئی ٹھیس مت پہنچانا۔"

اس کی آنکھوں سے پھر آنسو گرنے لگے تھے مگر یہ آنسو ماہا کی جدائی کے دکھ پر بہنے والے آنسو نہیں بلکہ اس کی دائمی خوشیوں کی سچے دل سے دعائیں مانگنے والے بے ریا اور سچے آنسو تھے۔

☆☆☆

"وہ واپس آئے گا۔ وہ واپس آئے گا کلثوم! میری محبت اتنی بے اثر تو نہیں ہو سکتی۔"

اور وہ واپس آیا تھا۔ اس کا یقین غلط نہیں تھا۔

چاہے ساڑھے پانچ سال بعد سہی، لیکن وہ واپس آ گیا تھا۔ پھر اس آنے والے کو لوٹا کیوں دیا تھا؟ کیا اس لئے کہ اس سے نفرت بہت شدید تھی؟

محبت اور نفرت، یہ دو جذبے ایک دوسرے کی ضد ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے اتنے قریب کیوں ہیں؟ جس کے بارے میں ایک عمر تک یہ یقین رکھو کہ ہم اس سے نفرت کرتے ہیں زندگی کے کسی عجیب سے موڑ پر جا کر اچانک انکشاف ہوتا ہے کہ وہ نفرت تو صرف ایک دکھاوا تھی۔ خود کو بہلانے کا ایک بہانہ۔

"تمہیں اپنے دل کی بات بتاؤں کلثوم! جس روز وہ واپس آئے گا۔ میں واقعی پچھلی ہر بات بھلا کر اس کے ساتھ اپنی زندگی وہیں سے شروع کر دوں گی جہاں پر ہمارا ساتھ چھوٹا تھا۔"

پچھلے کئی سالوں سے جس شخص کے بارے میں اسے یقین رہا تھا کہ وہ اس سے نفرت کرتی ہے، شدید نفرت، بے انتہا نفرت۔ وہ نفرت اس ایک پل میں کہاں غائب ہو گئی تھی جب وہ اس کے پاس آ کر بولا۔

"میری زندگی میں واپس آ جاؤ ماہا! تمہارے بغیر میری زندگی بہت اداس ہے، بہت ویران ہے۔" اور وہ اپنے کہے لفظوں کے عین مطابق ہر بات بھلا کر اس کے ساتھ اپنی زندگی کا سفر وہیں سے شروع کرنا چاہنے لگی جہاں ان کا ساتھ چھوٹا تھا۔ وہ دیوانی لڑکی اور اس کی جنونی محبت، وہ تو آج بھی وہیں تھی، اسی مقام پر زندگی کہیں آگے نہیں گئی تھی۔ وہ تو وہیں ٹھہری ہوئی تھی، اسی جگہ، اسی انتظار میں محبت میں پاگل ہوئی وہ لڑکی تو نفرت کبھی کرتی ہی نہیں تھی، نفرت تو وہ بیوی کرتی تھی جسے اس کے شوہر نے دھوکہ دیا تھا، بیچ راہ میں چھوڑ گیا تھا۔ اس سے بے وفائی کی تھی۔ وہ بیوی اپنے شوہر کو کبھی معاف نہیں کر سکتی تھی مگر وہ لڑکی اس کی محبت، نفرتوں سے بہت پرے تھی۔ پاگل پن کی حدوں کو چھوتی اس کی جنونی محبت، انا پرستی سے بہت آگے تھی، بہت دور۔

کیا محبت صرف اچھوں سے کی جاتی ہے؟ خوبیاں دیکھ کر۔ اچھائیاں جانچنے کے بعد۔ محبت اگر سچی ہے تو کبھی کم نہیں ہو سکتی، کبھی ختم نہیں ہو سکتی۔ وہ عورت جو ایک بیوی تھی اور جو انا پرست بھی بہت تھی، چاہے اس دیوانگی پر جتنا شور مچالیتی مگر اس لڑکی کی محبت کو ہرا نہیں سکتی تھی۔ ٹھیک تو کہہ رہا تھا حمیر، اگر وہ واقعی اس سے نفرت کرتی تھی تو

اتنے برسوں میں کبھی اس سے طلاق کا مطالبہ کیوں نہیں کیا؟ اس کے پہنائے وہ زیور، جو آج اسے لوٹائے ہیں، کیوں انہیں کبھی خود سے جدا نہیں کر پائی۔ محبت ہی کی وجہ سے ناں۔

وہ پھر سے اس کے ساتھ اپنی زندگی کو وہیں سے شروع کر دیتی، مگر وہ ایسا کر نہیں پائی۔ اس لئے نہیں کہ وہ ایک دوسری عورت کے بسے بسائے گھر کو اجاڑنا نہیں چاہتی تھی۔ اسے سدرہ آفاق سے کوئی ہمدردی نہیں تھی۔ جس عورت نے اس کا گھر اجاڑا تھا، اس کا شوہر چھینا تھا، اس کے خوابوں کو مسمار کیا تھا، وہ اس سے ہمدردی رکھتی؟ اسے اس کا شوہر واپس لوٹاتی؟ ایسی دیالو نہیں تھی وہ۔ مگر بات سدرہ آفاق کی نہیں بات امل حمیر رضا کی تھی۔ جو اس کی بیٹی نہیں، جس کی وہ ماں نہیں، پھر بھی اس کے ساتھ کچھ برا کرنے کا وہ تصور تک نہیں کر سکتی تھی۔ نجانے کیسا رشتہ تھا یہ، جو اسے اس معصوم بچی سے ایسی محبت میں مبتلا کر گیا تھا جیسے وہ اس کی اپنی اولاد ہو۔ سرخ کلر کا سلیولیس فراک پہنی، وہ کیوٹ سی، بھولی بھالی اور معصوم سی بچی۔

''یہ میرے ماما، پاپا ہیں۔'' اس کے کانوں میں آج بھی وہ پیاری سی آواز گونج رہی تھی۔ وہ امل سے اس کا گھر کیسے چھین لیتی؟ وہ امل سے اس کے ماں باپ کیسے چھین لیتی؟ ایسا ظلم کیسے کر دیتی اور وہ اس معصوم پر؟ حمیر اگر امل کو اپنے ساتھ لے کر اس کے پاس آتا تو وہ ماں سے محروم ہو جاتی اور اگر اسے اس کی ماں کے پاس چھوڑ کر اس کے پاس آتا تو باپ سے۔ ہر دو صورتوں میں نقصان تو امل ہی کا ہو رہا تھا۔

گھر سے محروم، ماں باپ، کی محبتوں کو ترسی امل، کل کہیں ایک اور ماہا احمد علی نہ بن جائے۔ ایک گھر کو ترسی، رشتوں کو ترسی، محبتوں کو ترسی، ماہا احمد علی جو پھر کسی ایک رشتے میں اپنا ہر رشتہ ڈھونڈے۔ کل پھر وہ ماہا احمد علی کسی حمیر رضا کی منتیں کرے، التجائیں کرے کہ مجھے چھوڑ کر مت جاؤ۔ اپنا ایک رشتہ، واحد رشتہ چھن جانے کا خوف اسے پل پل جینے اور پل پل مرنے کی اذیت نہ دے۔ اس کے پاس ایک گھر ہو، ماں باپ ہوں۔ الجھنوں سے آزاد سیدھی اور ہموار اس کی زندگی ہو، اس کی اپنی ایک مضبوط شخصیت ہو تا کہ کل اگر کوئی حمیر رضا اسے راہ میں تنہا چھوڑ جانے کی بات کرے تو وہ اس جانے والے کے سامنے اپنی انا نہ گنوائے، اس کے آگے ہاتھ نہ جوڑے، اس کے پاؤں نہ پکڑے، بلکہ اس چھوڑ کر جانے والے کی طرف کبھی مڑ کر دیکھے بھی نہیں۔

وہ ماہا احمد علی، اتنی خود غرض کیسے ہو سکتی ہے۔ وہ امل سے اس کا گھر کیسے چھین سکتی ہے۔ وہ معصوم بچی جس نے ابھی دنیا میں کچھ بھی نہیں دیکھا، وہ اس سے اس کا گھر چھیننے کا، اس سے اس کا باپ چھیننے کا ظلم کیسے کر سکتی ہے۔

''آج تمہارے پاپا کو جو کچھ کہا، جتنی نفرت کا اظہار کیا، جتنے برے الفاظ استعمال کئے اور اسے مایوس لوٹانے کو جو فائز عبید سے شادی کا فیصلہ کیا، سب تمہاری وجہ سے کیا ہے امل! ماں نہیں ہوں تو کیا ایک ممتا بھرا دل بھی نہیں ہے میرے سینے میں؟ میں نے تمہارے پاپا کو واپس تمہارے پاس بھیج دیا ہے امل۔ میں نے تمہارا گھر ٹوٹنے سے بچا لیا ہے امل، تا کہ تم ماہا جیسی نہ بن جاؤ۔ تم ایک گھر، کچھ رشتوں اور محبتوں کی تلاش میں دربدر نہیں پھرو گی۔ رشتے تمہیں ڈھونڈنے نہیں پڑیں گے، وہ تمہارے پاس موجود ہوں گے۔

وہ کھڑکی کھول کر کھڑی ہوئی تھی اور باہر اندھیرا ہونے کے باوجود اسے نیچے کھلے آسمان تلے وہ شخص کھڑا دکھائی دے رہا تھا۔ اندھیرے میں اس کی شکل صاف نظر نہیں آ رہی تھی تو اس کے آنسو کیسے نظر آتے۔ مگر وہ پھر بھی یہ



بات بتا سکتی تھی کہ وہ گاڑی کے پاس کھڑا رو رہا ہے۔

''تمہیں اپنے دل کی بات بتاؤں کلثوم! جس روز وہ واپس آئے گا۔'' وہ کھڑکی کا پٹ پکڑ کر زارو قطار رو پڑی۔ وہ واپس آنے والا، واپس جانے والا تھا۔ اسے جانے کو خود ہی کہا تھا، مگر اب اسے جاتا دیکھنا اپنی ہمت اور حوصلے سے بہت زیادہ لگ رہا تھا۔ وہ اپنی گاڑی میں بیٹھ رہا تھا۔ آٹھ سال قبل سولہ فروری کو جڑنے والا ایک رشتہ سولہ فروری ہی کو ٹوٹ بھی گیا تھا پچاس موم بتیاں کیک پر سمائیں گی کیسے؟''

''کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ میں بہت بڑا سا کیک بیک کروں گی۔ اتنا بڑا کہ اس پر پچاس موم بتیاں لگائی جا سکیں۔''

''بہت جلدی ہے پچیس سال گزروانے کی، پچیس سال بعد تم بوڑھی بھی تو ہو جاؤ گی۔'' اس کی گاڑی اسٹارٹ ہو گئی۔ اس کے لبوں سے ایک آہ نکلی۔ ایک سسکی، ضدی دل پھر اسے پکارنے کو مچلا۔ اس نے اپنے لبوں پر ہاتھ رکھ لیا۔ وہ روتے ہوئے دیکھ رہی تھی کہ اس کی گاڑی گیٹ سے باہر نکل چکی تھی۔ ''میرے اللہ...... یہ شخص ہمیشہ خوش رہے، ہمیشہ سکھی رہے تو اس کی زندگی کو خوشیوں سے بھر دینا۔ میرا کوئی حق اس کے ذمہ نہیں۔ میں اپنا ہر حق اسے معاف کرتی ہوں۔ میں نے اسے معاف کر دیا تو بھی اسے معاف کر دے۔ اس سے کوئی سخت حساب مت لینا۔ اسے کوئی سزا مت دینا۔ نہ اس دنیا میں نہ کل روز حشر میں۔ اس پر رحم فرمانا میرے اللہ...... اس پر رحم فرمانا۔'' روتے ہوئے کپکپاتے ہونٹوں سے وہ اللہ کو پکار رہی تھی۔

بہت دیر تک وہ روتی رہی۔ اس شخص کے لئے، اس کی ان یادوں کے لئے جو بھی اس کی تھیں۔ وہ آج انہیں آخری بار یاد کر رہی تھی تا کہ کل جب وہ فائز عبید کے ساتھ اپنی نئی زندگی شروع کرے تو اپنی سوچوں اور اپنی یادوں میں بھی اس کی وفادار ہو کر رہ سکے۔ اس کا دل یہ سوچ کر مطمئن تھا کہ اس نے فائز سے محبت کا کوئی جھوٹا اظہار نہیں کیا۔ وہ اپنی نئی زندگی کا آغاز کسی جھوٹ کے ساتھ نہیں کرے گی۔

وہ اس کا مخلص دوست پورے یقین کے ساتھ کہتا ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ان کی دوستی خود بخود محبت میں بدل جائے گی۔ محبت کا تو پتا نہیں مگر اس کے ساتھ انتہائی حدوں تک مخلص اور وفادار وہ مرتے دم تک رہے گی۔ وہ اپنی یادوں اور اپنے خیالوں میں بھی کبھی اس سے بے وفائی نہیں کرے گی۔ فائز کے دل پر زارا کی بے وفائی کا جو گہرا زخم لگا ہے، وہ اس زخم کو اپنے پیار اور اپنی توجہ سے بہت جلدی بھر دے گی۔

اس نے زندگی میں بہت سے خواب دیکھے تھے۔ ایک گھر کے، رشتوں کے، محبت کے۔ اس کا صرف محبت کا خواب ہی تو ٹوٹ کر بکھرا ہے، باقی سارے خواب تو ابھی سلامت ہیں۔ اپنے ایک گھر کا خواب، اپنا کہہ سکنے والے کچھ رشتوں کا خواب اور سب سے بڑھ کر اسے ''ماما'' کہہ کر بلانے والے ایک ننھے سے وجود کا خواب۔ اسے اپنے ان سارے خوابوں کی تعبیریں حاصل کرنی تھیں۔

اس نے اپنے چہرے پر سے سارے آنسوؤں کو مٹا ڈالا پھر پرس کندھے پر ڈال کر وہ اپنے آفس سے باہر نکل آئی۔ وہ صرف آفس سے نہیں نکلی تھی، وہ یادوں کے حصار سے بھی نکل آئی تھی۔ وہ زندگی کو ایک نیا عنوان دینے جا رہی تھی اور اس نئے عنوان میں وہ بیتے کل کا کوئی پل شامل نہیں کرنا چاہتی تھی۔

❁

# قائم یہ اعتبار رہے

وہ اسے پچھلے ایک مہینے سے یہاں آتا دیکھ رہے تھے۔ پتہ نہیں اس میں ایسی کیا بات محسوس ہوئی تھی جو وہ اس کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ خود ان کا تو برسوں پرانا معمول تھا کہ وہ شام میں واک کرنے کے لئے پارک آیا کرتے تھے۔ مگر اس لڑکی کو انہوں نے اس سے پہلے یہاں آتے کبھی نہ دیکھا تھا۔

یہ ایک مہینہ پیشتر کی بات تھی جب انہوں نے اسے پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ روزانہ چھ بجے کے قریب وہ پارک آتی اور پارک کے کونے میں بالکل الگ تھلگ سی بینچ پر بیٹھ جایا کرتی۔ اتنے وسیع پارک کے قدرے سنسان سی جگہ پر واقع اس بینچ پر کوئی اور بیٹھتا بھی نہیں تھا۔ اسی لئے اس کی یہ مخصوص بینچ اسے روز ہی خالی ملتی۔ وہ بظاہر کھیلتے کودتے بچوں پر نگاہیں مرکوز کئے بیٹھی رہتی مگر انہیں ایسا لگتا جیسے وہ صرف جسمانی طور پر یہاں موجود ہے ورنہ اس کا دل اور دماغ کہیں اور ہی مصروف عمل ہیں۔ عجیب سی تھکاوٹ اور بیزاری اس کے چہرے پر چھائی رہتی تھی۔ جیسے وہ ساری دنیا سے ناراض ہے۔ اسے لوگوں نے بڑا مایوس کیا ہے اور وہ اپنی تنہائی اور اکیلے پن کا سوگ منانے میں آتی ہے۔

مغرب کا وقت ہوتا اور بچے پارک سے جانا شروع کر دیتے وہ تب بھی ویسے ہی بیٹھی رہتی۔ پھر جب اندھیرا ہلکا ہلکا پھیلنا شروع ہو جاتا وہ بینچ پر سے یوں کھڑی ہوتی جیسے ابھی بھی یہاں سے جانا نہیں چاہتی۔

وہ جو اپنی عمر کا ایک بڑا حصہ لوگوں اور ان کے رویوں کو سمجھنے میں گزار چکے تھے، اپنے تجربات کی روشنی میں یہ بات کہہ سکتے تھے کہ وہ اپنے گھر اور گھر کے افراد سے روٹھی ہوئی ایک ناراض سی لڑکی ہے۔ وہ جگہ جہاں وہ رہتی تھی شاید وہ وہاں رہنا ہی نہیں چاہتی تھی اسی لئے اس جگہ سے فرار حاصل کرنے کے لئے یہاں چلی آتی تھی۔ مگر یہاں آنے کے باوجود وہ اس جگہ سے متعلق تکلیف دہ سوچوں کو جھٹک نہیں پاتی تھی اسی لئے لاشعوری طور پر سارا وقت وہیں کے بارے میں سوچتی رہتی تھی۔ روزانہ واک کرتے ہوئے وہ دو تین بار اس کے سامنے سے گزرتے تھے مگر وہ کبھی بھی ان کی طرف متوجہ نہیں ہوئی تھی۔

آج ایک دم ان کا دل چاہا کہ اس سے جا کر بات کریں اور اسے سمجھائیں کہ اتنی اداسی اور دل کی گرفتگی اچھی نہیں۔ اگر تمہیں کوئی دکھ پہنچا بھی ہے تو اسے برداشت کرنے کی کوشش کرو اور خدا کی رحمت سے مایوس مت ہو۔



اپنی اس سوچ کو عملی جامہ پہنانے کے لئے واک کرتے ہوئے اس کے پاس آ گئے اور بولے۔

"ہیلو ینگ لیڈی! کیا میں آپ کے پاس بیٹھ سکتا ہوں؟" وہ اپنے کسی دھیان سے چونک کر ان کو حیران نظروں سے اپنے سامنے کھڑا دیکھ رہی تھی۔ شاید ان کی بات اس نے صحیح طور پر سنی بھی نہیں تھی۔ اس کے چہرے کے حیرت بھرے تاثرات کے پیش نظر وہ دوبارہ بولے۔

"بیٹا کیا میں آپ کے پاس بیٹھ سکتا ہوں؟"

"جی ضرور۔" وہ کچھ بوکھلا کر بولی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کون ہیں اور اس کے پاس کیوں بیٹھنا چاہتے ہیں۔ اس کے بولتے ہی وہ فوراً بینچ پر بیٹھ گئے اور اس کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولے۔

"مجھے نئے نئے دوست بنانے کا بہت شوق ہے۔ یہ اور بات ہے کہ دوستی کے معاملے میں، میں بڑا چوزی ہوں صرف انہیں لوگوں سے دوستی کرتا ہوں جو مجھے اچھے لگتے ہیں اور تم کیونکہ مجھے بہت اچھی لگی ہو اس لئے میں تم سے دوستی کرنا چاہتا ہوں۔"

ان کے بے تکلفانہ انداز تخاطب پر وہ بے اختیار مسکرا دی اور بولی۔

"آپ تو مجھے جانتے بھی نہیں ہیں پھر میں آپ کو اچھی کیسے لگ گئی؟"

"اچھی لگی ہو اسی لئے تو جاننا چاہتا ہوں کہ میری نئی دوست کون ہے کہاں رہتی ہے وغیرہ وغیرہ۔"

ان کا دھیما اور پرخلوص سا انداز اسے بے اختیار اپنی گرفت میں لے گیا۔ وہ اب بڑے دھیان سے اور غور سے ان کی طرف دیکھنے لگی ان کے چہرے پر اتنی شفقت اور محبت محسوس ہو رہی تھی کہ وہ ان کی بات کا جواب دینے کے بجائے ایک ٹک انہیں دیکھتی رہی۔ اسے اتنی توجہ سے اپنی طرف دیکھتے، پا کر وہ قدرے شریر انداز میں بولے۔

"کیا میں آج بھی اتنا ہینڈسم ہوں کہ لڑکیاں اتنے غور سے مجھے دیکھیں؟" ان کی بات پر وہ بے اختیار کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی۔ وہ اس کے ہنستے مسکراتے چہرے کو بڑی دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔

"میرا خیال ہے کہ پہلے میں ہی اپنا تعارف کروا دیتا ہوں" کچھ دیر کی خاموشی کے بعد وہ اس سے مخاطب ہوئے۔

"میرا نام سید مبشر لودھی ہے۔ عمر اکہتر سال ہے بقول شاعر کبھی ہم خوبصورت تھے۔ اگر تم چالیس پچاس سال پہلے ملی ہوتیں تو دیکھتیں کہ اسمارٹنس اور خوبصورت کسے کہتے ہیں۔"

وہ اتنے ہنس مکھ سے تھے کہ وہ اپنی ریزرو رہنے والی نیچر کے باوجود قہقہہ لگا کر ہنس پڑی اور بولی۔

"آپ ابھی بھی بہت ہینڈسم ہیں اور اگر خود اپنے منہ سے اپنی ایج نہ بتائیں تو ساٹھ سے زیادہ کے تو لگتے بھی نہیں ہیں۔" اس کی بات پر وہ بھی ہنس پڑے اور بولے۔

"بچی تم میرا دل رکھنے کو تو ایسا نہیں کہہ رہیں کہ چلو بڑے میاں کو تھوڑا خوش کر دیں۔"

"آئی سویئر میں سچ کہہ رہی ہوں۔" پتہ نہیں ان کی شخصیت اور بولنے کے انداز میں کیسا جادو تھا کہ وہ خود بخود ان کی طرف کھنچی چلی جا رہی تھی۔

"چلو تم کہہ رہی ہو تو مان لیتا ہوں۔" وہ ان کی بات کا مزہ لیتے ہوئے بولے۔

"خیر میں اپنا انٹروڈکشن کروا رہا تھا۔ بڑی مصروف اور بھاگتی دوڑتی زندگی گزاری ہے میں نے۔ اسی لئے

اب آرام سے ریٹائرڈ لائف کو انجوائے کر رہا ہوں۔ ان دنوں کچھ لکھنے پڑھنے سے زیادہ ہی شغف ہو گیا ہے۔ اس لئے سارا دن اپنی سٹڈی میں کتابیں پڑھنے میں گزار دیتا ہوں۔ اپنے یورپ اور افریقہ کے ممالک کے دوروں کے نتیجے میں وہاں کے حالات اور اپنے تجربات پر مبنی دو عدد سفرنامے لکھ چکا ہوں۔ آج کل کچھ قریبی دوستوں کے مشورے پر اپنے مختلف موضوعات پر لکھے گئے آرٹیکلز جو اخبارات میں شائع ہو چکے ہیں کو کتابی شکل دینے کی کوشش کر رہا ہوں۔ یہیں ڈیفنس میں رہتا ہوں۔''

وہ ان سے بڑی مرعوب اور متاثر نظر آ رہی تھی۔

''اب تم اپنے بارے میں بتاؤ۔'' وہ اس سے مخاطب ہوئے۔

''آپ جیسے عالم فاضل اور انٹیلکچوئل کے سامنے میں اپنا کیا تعارف کرواؤں۔ بہرحال میرا نام اجالا شہریار ہے اور میں نے انڈس ویلی سے فائن آرٹس میں گریجویشن کی ہے۔ ان دنوں ایک آرٹ اسکول میں جاب کر رہی ہوں۔ میں بھی ڈیفنس ہی میں رہتی ہوں۔''

''اچھا تو میری ننھی دوست ایک آرٹسٹ ہے۔ بھئی میں تو پہلی نظر میں جان گیا تھا کہ تم بڑی ٹیلنٹڈ لڑکی ہو۔''

وہ اپنی تعریف پر مسکراتی ہوئی بولی۔

''اتنی ننھی بھی نہیں ہوں جتنا آپ سمجھ رہے ہیں۔ اس جنوری میں، میں پورے چھبیس سال کی ہو گئی ہوں۔''

وہ اس کے صاف گوئی سے اپنی عمر بتانے پر ہنس پڑے اور بولے۔

''میرے آگے تو چھوٹی سی بچی ہی ہو۔ خیر یہ بتاؤ تمہیں مجھ سے دوستی کرنا منظور ہے۔'' وہ جواب میں اپنا سر اثبات میں ہلاتے ہوئے بولی۔

''کیا اب تک ہماری دوستی ہو نہیں چکی؟''

''نہیں باقاعدہ دوستی تو نہیں ہوئی ناں۔ اب تم دوستی کرنے کے لئے مان گئی ہو تو میں تمہیں بتاؤں کہ میں دوستی میں بھی ڈکٹیٹر شپ کا قائل ہوں۔ لہٰذا میری پہلی ڈکٹیشن تو یہ ہے کہ مجھے روتے بسورتے چہرے بہت زہر لگتے ہیں اس لئے اگر مجھ سے فرینڈ شپ کرنی ہے تو جب بھی مجھے ملو ہنستی مسکراتی نظر آؤ۔ ٹھیک ہے۔'' وہ اپنا ہاتھ اس کے سامنے پھیلاتے ہوئے بولی۔ اس نے کچھ جھجکتے ہوئے ان کے بھاری مردانہ ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے دیا اور گردن ہلا دی تو انہوں نے بڑی گرم جوشی سے اس کا ہاتھ دباتے ہوئے چھوڑ دیا۔ پھر کچھ دیر وہ اس سے فائن آرٹس اور اس کی جاب کے بارے میں بات کرتے رہے۔ اذان سے کچھ پہلے وہ اٹھے تو اجالا بھی ان کے ساتھ ہی کھڑی ہو گئی۔ دونوں چہل قدمی کرتے ہوئے پارک سے نکل آئے۔ پارک سے پانچ منٹ کی واک پر ان کا گھر تھا۔ سڑک کے کنارے پہ کھڑے ہو کر انہوں نے اسے اشارے سے اپنا گھر دکھایا اور چلے گئے تو وہ بھی آگے بڑھ گئی۔

اگلے روز وہ پارک آئی تو وہ اسے واک کرتے ہوئے نظر آئے۔ اس ایج میں بھی ان کی فزیکل فٹنس زبردست تھی۔ چھ فٹ قد اور مضبوط ڈیل ڈول۔ ان کی نہ تو کمر جھکی ہوئی تھی نہ ہی چال میں سست رفتاری نظر آ رہی تھی۔ گہری اور چمک دار آنکھیں جو مخاطب کو مقناطیس کی طرح اپنی طرف کھینچ لیں۔ داڑھی نے ان کے چہرے کو ایک عجیب سے نورانی ہالے میں لے رکھا تھا۔ اسے دیکھ کر انہوں نے دور سے ہاتھ ہلا کر وش کیا تھا۔ وہ مسکراتی ہوئی تیز قدموں



سے چلتی ان کے پاس آ گئی اور بولی۔

''السلام علیکم۔''

''وعلیکم السلام کیسی ہو بیٹا؟'' وہ شفقت سے مسکرا کر بولے۔

''میں ٹھیک ہوں انکل آپ کیسے ہیں؟'' ''میں بھی بالکل ٹھیک ہوں۔ آؤ آج بیٹھنے کے بجائے تم بھی میرے ساتھ واک کرو۔''

اسے آفر کرتے انہوں نے چلنا شروع کیا تو وہ بھی ان کے قدم سے قدم ملا کر چلنے لگی۔ کافی دیر تک وہ دونوں واک کرتے رہے اس دوران انہوں نے آپس میں بہت ساری باتیں کیں۔ ایک دوسرے کی پسند ناپسند وغیرہ کے بارے میں آگاہی حاصل کرتے رہے۔ بات کرتے کرتے اچانک ان کی نظر اپنی گھڑی پر پڑی تو بوکھلا کر بولے۔

''مارے گئے، وہ الو تو مجھ سے سخت ناراض بیٹھا ہوا ہوگا۔'' اس کی حیران شکل پر نظر پڑی تو مسکرا کر بولے۔

''میرا پوتا ہے اویس۔ اسے اکثر میں پیار سے الو ہی کہتا ہوں۔ اب کہیں تم اسے کوئی احمق سی مخلوق نہ سمجھ لینا۔ بڑا جینئس اور لائق ہے۔ یہ بات صرف میں ہی نہیں اسے جاننے والے تمام لوگ کہتے ہیں۔ بچپن سے لے کر آج تک زندگی کے ہر میدان میں اول رہا ہے۔ پڑھائی میں تو خیر اچھا تھا ہی لیکن اسپورٹس میں بھی اس کی کارکردگی نہایت شاندار تھی۔ اسکواش اور سوئمنگ میں اس نے ہمیشہ ہی فرسٹ پرائز حاصل کیا ہے۔ اس جیسا ڈیبیٹر کوئی اور ہو ہی نہیں سکتا۔ بڑی ہی قطعی نیچر کا مالک ہے۔ اپنے ارادوں میں اٹل اور قطعی فیصلے کرنے والا۔ دلیر، نڈر اور مستقل مزاج۔ ہارنا تو جیسے اس نے سیکھا ہی نہیں ہے۔ آکسفورڈ میں بھی اپنی ذہانت اور لیاقت کے جھنڈے گاڑھ کر آیا ہے۔ اس کے وہاں کے پروفیسرز آج بھی اسے یاد کرتے ہیں۔ ان تمام باتوں کے علاوہ مجھ سے بہت پیار کرتا ہے اور اب میرا اتنا پھیلا ہوا بزنس وہی سنبھال رہا ہے۔ مجھے اس نے ریٹائرمنٹ دلوا دی ہے۔''

ان کے لہجے میں اپنے پوتے کے لئے محبت، فخر، مان اور کیا کیا کچھ نہ تھا۔ وہ ان کے چہرے پر بکھرے ہوئے ان رنگوں کو بڑی حسرت سے دیکھ رہی تھی اس کے لئے اس لہجے میں محبتیں اور چاہتیں جتانے والا کوئی نہ تھا۔ وہ کسی کو عزیز از جان نہیں تھی۔ کسی کو اتنی فرصت نہ تھی کہ اس کی خوبیوں کو سراہتا اور اپنی والہانہ چاہت کا اظہار کرتا۔ وہ ایک عجیب سے تاسف اور دکھ کو اپنے دل میں گھر کرتا ہوا محسوس کرنے لگی۔ جبکہ وہ اس کی کیفیت سے بے خبر کہہ رہے تھے۔

''آج ذرا جلدی گھر جانا ہے۔ تم چل رہی ہو یا ابھی رکو گی؟'' ان کی بات پر وہ ایک گہری سی سانس لے کر بولی۔

''نہیں میں بھی آپ کے ساتھ ہی چل رہی ہوں۔'' کل کی طرح وہ دونوں ساتھ ساتھ چلتے باہر نکل آئے۔

ان کے گھر کی اسٹریٹ کے کنارے انہیں خدا حافظ کہتی وہ آگے بڑھ گئی تھی۔

پھر ان سے روز پارک میں ملنا جیسے ایک معمول سا بن گیا تھا۔ وہ کیونکہ واک کرنے آتے تھے سو اجالا بھی انہیں جوائن کر لیتی اور پھر گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ ان کی سنگت میں گزار کر جب وہ واپس لوٹتی تو خود کو بہت تر و تازہ اور خوش محسوس کرتی۔ ان کی کمپنی اتنی دلچسپ ہوتی کہ اسے بوریت کا احساس ہی نہیں ہوتا تھا۔ عام بوڑھے افراد کی طرح انہیں نئی نسل میں سینکڑوں خرابیاں بھی نظر نہیں آتی تھیں۔ وہ محض تنقید کرنے کے لئے یا جنریشن گیپ کے پیش نظر ہمارے زمانے میں تو یوں ہوتا تھا یہ آج کل کی نسل تو نری واہیات ہے۔ جیسے فقرے بھی نہیں بولا کرتے تھے۔ جبکہ انہیں اپنے

زمانے کا میوزک، فلمیں اور لٹریچر پسند تھا وہیں وہ نئی نسل کے بھی بہت سے گلوکاروں کو پسند کرتے تھے۔ نئے دور کی عمدہ اور معیاری فلمیں اور کتب بھی ان کی من پسند تھیں۔ اسی لئے اسے کبھی بھی ایسا محسوس نہیں ہوا کہ وہ دل سے بوڑھے شخص کے ساتھ وقت گزار رہی ہے۔

کمپیوٹر اور انٹرنیٹ تک کے بارے میں ان کی معلومات اتنی اپ ٹو ڈیٹ تھیں کہ وہ خود ان سے بہت کچھ سیکھ رہی تھی۔ انہوں نے اس سے کبھی بھی اس کے گھر یا گھر والوں سے متعلق کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ زیادہ تر وہ لوگ جنرل ٹاپکس پر باتیں کرتے رہتے۔ اسے ان کی یہ عادت بہت اچھی لگتی تھی کہ وہ بلاوجہ کے تجسس میں مبتلا ہو کر اس سے پرسنل باتیں نہیں پوچھا کرتے تھے اور کیونکہ وہ اپنے گھر کے حوالے سے کوئی بات کرنا بھی نہیں چاہتی تھی اس لئے ان کی اس عادت سے بہت خوش تھی۔ خود وہ البتہ باتوں باتوں میں اکثر اپنے پوتے کا ذکر کیا کرتے تھے۔

بات چاہے کسی بھی موضوع پر ہو رہی ہوتی اس کا کسی نہ کسی طرح سید اویس لودھی سے لنک جوڑ دیا جاتا تھا۔ اگر کھانے پینے کی بات ہو رہی ہوتی تو وہ کہتے ''اویس کو سی فوڈ اور مختلف قسم کے سلاد کھانے کا بہت شوق ہے۔ کھانے کی میز پر بیٹھ کر پہلے اپنا آدھا پیٹ تو سلاد سے بھر لیتا ہے۔ اسی لئے ہمارے خانساماں بے چارے کو اس کی وجہ سے مختلف کھانے پکانے کی کتابوں اور ٹی وی پروگراموں سے استفادہ حاصل کرنا پڑتا ہے۔ تاکہ اسے روز نئی سے نئی طرح کی سلاد بنا کر کھلا سکے۔''

اگر کتابوں کی یا پڑھنے پڑھانے کی بات ہو رہی ہوتی تو کہتے۔

''اویس کو بھی میری طرح کتابوں سے عشق ہے۔ روزانہ رات کو سونے سے پہلے کچھ نہ کچھ ضرور پڑھتا ہے چاہے وہ کوئی میگزین ہو یا کوئی کتاب۔'' وہ اپنے پوتے سے والہانہ عشق کرتے تھے۔ اسی لئے یہاں نہ ہوتے ہوئے بھی وہ ان کے پاس موجود ہوتا تھا۔ ان دونوں کے بیچ وہ ایک تیسرے فرد کی طرح ہمیشہ ساتھ رہتا تھا۔

اس روز بھی وہ ان کے ساتھ واک کرتی ہوئی ان کی باتیں بغور سن رہی تھی۔ گفتگو کا موضوع بعض لوگوں کا اپنی کسی بھی عادت کو نشے کی طرح اختیار کر لینا تھا۔ اپنی عادت کے مطابق وہ اپنے پوتے کا ذکر کرنا نا بھولے اور بولے۔

''اویس کی ایک یہی عادت مجھے ناپسند ہے۔ حالانکہ اس نے کبھی میرے سامنے سگریٹ نہیں پیا، لیکن مجھے معلوم ہے کہ وہ سموکنگ کرتا ہے۔ ویسے اپنی فٹنس کا اور اپنی ہیلتھ کا اتنا خیال رکھتا ہے روزانہ صبح باقاعدگی کے ساتھ ایکسرسائز کرتا ہے۔ شام میں سوئمنگ کرتا ہے اور ہفتے میں دو تین بار سکواش کھیلنے بھی جاتا ہے مگر سموکنگ سے باز نہیں آتا۔'' ان کی بات بڑے غور سے سنتے ہوئے وہ ایک دم بول پڑی۔

''وہ کیا آپ کی بات نہیں مانتے۔؟''

''نہیں خیر ایسی تو کوئی بات نہیں۔ دراصل اس نے کبھی میرے سامنے سموکنگ کی ہی نہیں ہے اس لئے میں اسے کبھی ٹوک نہیں پایا۔''

اتنے عرصے سے اس کے بارے میں سنتے سنتے اسے اب وہ نادیدہ بندہ بڑا جانا پہچانا سا لگنے لگا تھا۔ اسے یونہی خیال آیا کہ وہ ہمیشہ اپنے پوتے ہی کا ذکر کرتے ہیں کبھی بیٹے اور بہو کی کوئی بات نہیں کی۔ اپنے اس خیال کے پیش نظر وہ بول اٹھی۔



''آپ کے بیٹا اور بہو کیا کہیں دوسرے ملک میں رہتے ہیں؟''

اس کے سوال پر ایک تاریک سا سایہ ان کے چہرے پر نظر آیا تھا۔ ان کا ہنستا مسکراتا چہرہ ایک دم ویران اور برسوں کا بیمار نظر آنے لگا تھا۔ ان کے کچھ کہے بغیر ہی اسے اپنے سوال کا جواب مل گیا تھا اور وہ اب بڑی شرمندگی میں گھری کھڑی تھی۔

''آئی ایم سوری میں نے آپ کو دکھی کر دیا۔''

اس کی بات پر وہ ایک دم چونک کر اس کی طرف متوجہ ہوئے اور بڑے دکھی انداز میں دھیرے سے بولے۔

''یہ دکھ تو ہر لمحہ میرے ساتھ ہے۔ لیکن بعض اوقات ہمیں اپنے تمام دکھ اور رنج و الم اپنے سے وابستہ دوسرے افراد کی وجہ سے دل کے کسی نہاں خانے میں چھپانے پڑتے ہیں۔ لیکن اس طرح کرنے سے بھی اس دکھ کی شدت کم تو نہیں ہو جاتی۔ آج جو میں زندہ ہوں تو صرف اویس کی وجہ سے ورنہ برسوں پہلے جوان بیٹے اور بہو کی موت کی خبر سن کر ہی شاید میں مر گیا ہوتا۔'' اس کی اتنی ہمت ہی نہیں ہو رہی تھی کہ وہ ان ہنستی مسکراتی زندگی سے بھرپور آنکھوں میں نمی دیکھ سکے اس لئے چپ چاپ سر جھکائے ان کی بھرائی ہوئی آواز سن رہی تھی۔ پھر وہ ایک دم اپنی آنکھیں رگڑ کر صاف کرتے ہوئے اس سے بولے۔

''آج میں تمہیں اپنے بارے میں بہت ساری باتیں بتاؤں۔'' وہ ان کی طرف نظر ڈالے بغیر ان کے ساتھ چلتی بینچ پر آ کر بیٹھ گئی۔ کچھ دیر بعد اس نے سنا وہ آسمان پر نگاہیں جمائے بول رہے تھے۔

''کبھی ہمارا ایک محبت بھرا آشیانہ ہوا کرتا تھا۔ جس میں، میں صبیحہ اور دانیال رہا کرتے تھے۔ صبیحہ میرے ماموں کی بیٹی تھی۔ ہماری شادی بزرگوں کی مرضی سے طے پائی تھی مگر اس میں ہم دونوں کی پسند بھی شامل تھی۔ وہ بہت اچھی تھی۔ بڑی ہمدرد، نیک دل اور خدمت گزار، ایسی بیوی قسمت والوں ہی کو ملا کرتی ہے۔ اس نے میری زندگی میں شامل ہو کر اسے ہر لحاظ سے مکمل کر دیا تھا۔ میرے کہے بغیر میرے دل کا حال جان لینے والی وہ مجھ سے بہت محبت کرتی تھی۔

پھر ہماری زندگی میں دانیال آ گیا تو جیسے ہر طرف خوشیاں ہی خوشیاں پھیل گئیں۔ ہماری زندگی خوشیوں اور مسرتوں سے بھرپور تھی۔ وقت گزرتا گیا دانیال بڑا ہو گیا۔ وہ بڑا ذہین اور قابل تھا بالکل میرے اویس کی طرح۔ ہم دونوں میاں بیوی اپنے بیٹے کی کامیابیوں پر فخر کیا کرتے تھے۔ وہ تھا بھی بہت اچھا بڑا فرمانبردار اس نے تمام زندگی کبھی مجھ سے یا اپنی ماں سے اونچی آواز میں بات نہیں کی۔ کبھی ہمارا کہا نہیں ٹالا اس کے اخلاق اور اچھی فطرت کے اپنے پرائے سب ہی گن گاتے تھے۔ جب وہ اپنی زندگی میں ہر لحاظ سے سیٹ ہو گیا تو ہم لوگوں نے اس کی شادی کے بارے میں سوچا، صبیحہ اپنے طور پر خاندان کی دو تین لڑکیوں کو اس کے لئے پسند کرتی تھی۔ مگر اس نے اپنی پسند سے شادی کرنے کا فیصلہ سنایا تو مجھے تو کوئی اعتراض نہ تھا مگر صبیحہ روایتی ماؤں کی طرح اس بات پر ناراض ہو گئی۔ زندگی میں پہلی مرتبہ میرے بیٹے نے کسی چیز کے لئے ضد کی تھی۔ میرے سمجھانے بجھانے کے باوجود صبیحہ اپنی ضد سے ایک انچ پیچھے نہ ہٹی۔ مگر اس موقع پر دانیال بھی حد درجے ضدی اور سرکش ثابت ہوا۔ اس نے فیصلہ سنا دیا کہ شادی کرے گا تو سبین سے ورنہ کسی سے بھی نہیں کرے گا۔ بالآخر میرے بہت سمجھانے اور منانے پر صبیحہ اس شادی کے لئے تیار ہو گئی

لیکن دل سے وہ دانیال سے سخت ناراض تھی۔

سبین بہو بن کر ہمارے گھر میں آ گئی تو پتہ چلا کہ ہمارے فرمانبردار بیٹے نے کسی غلط چیز کے لئے ضد نہ کی تھی۔ وہ اتنی پیاری تھی کہ میں بتا نہیں سکتا۔ شکل صورت میں تو لاجواب تھی ہی۔ اپنی عادتوں میں بھی بے مثال تھی۔ وہ یونیورسٹی میں دانیال سے دو سال جونیئر تھی مگر اس کی سادگی اور معصومیت دیکھ کر لگتا ہی نہیں تھا کہ اس نے اتنا سارا پڑھا ہوا ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ صبیحہ کا غصہ بھی جاتا رہا اور وہ دونوں ساس بہو کے بجائے ماں بیٹی نظر آنے لگیں۔ پھر ہمارے گھر کی رونقوں کو دوبالا کرنے کے لئے اویس آ گیا۔ وہ ننھا فرشتہ اپنے ماں باپ اور دادی کی آنکھوں کا تارا تھا اور میری تو بات ہی کیا تھی مجھے تو اس سے ایک عجیب سا عشق ہو گیا تھا۔ شاید اس کی بے تحاشا محبت خدا نے میرے دل میں اسی لئے ڈال دی تھی کہ اس بن ماں باپ کے بچے کی پرورش مجھے کرنی تھی۔ دانیال اور سبین کے ہوتے ہوئے بھی وہ ہر وقت میرے ساتھ رہا کرتا تھا۔ یہاں تک کہ رات کو سوتا بھی میرے پاس تھا۔

پھر جب وہ دو سال کا ہوا تو ایک روز اچانک صبیحہ مجھے چھوڑ گئی۔ اس وقت تو اس کے چلے جانے پر میں بہت اپ سیٹ ہوا تھا مگر خدا کے ہر کام میں ہی کوئی نہ کوئی مصلحت ہوتی ہے۔ اچھا ہوا جو وہ بیٹے اور بہو کا غم دیکھنے سے پہلے اس دنیا سے چلی گئی۔ اس کے جنازے کو اس کے جوان بیٹے نے کندھا دیا تھا وہ خوش قسمت تھی اور میں بڑا ہی بدنصیب جس نے اپنے جوان بیٹے کے لاشے کو اپنے کندھے پر اٹھایا تھا اور ستم یہ کہ مجھے پھر بھی جینا تھا اپنے اویس کی خاطر۔ دانیال کے دوست کی شادی تھی جس میں شرکت کے لئے وہ اور سبین حیدر آباد گئے تھے۔ اویس مجھ سے مانوس ہونے کی سبب میرے پاس ٹھہر گیا تھا۔

شادی میں شرکت کر کے واپس آتے ہوئے ان کی گاڑی کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔ ایکسیڈنٹ اتنا شدید تھا کہ دونوں موقع پر ہی دم توڑ گئے۔ یہ اطلاع پا کر میرا جو حال ہوا وہ بیان نہیں کر سکتا۔ بس یہی ہوا کہ اس دنیا میں، میں اکیلا ہو گیا تھا۔ میرا آشیانہ تنکا تنکا ہو کر بکھر گیا تھا۔ میرا دل مرنے کو چاہنے لگا تھا۔ مگر مجھے جینا تھا۔ اپنے دانیال کی نشانی کی حفاظت کرنی تھی۔ وہ پانچ سال کا معصوم بچہ اسے تو شاید اپنے نقصان کا صحیح سے انداز بھی نہیں تھا۔ اسے تو اس وقت یہ پتہ بھی نہیں تھا کہ وہ کتنی بڑی نعمت سے محروم ہو گیا ہے۔ بس پھر اویس کی خاطر میں نے خود کو سنبھالا۔ وہ بچپن ہی سے بڑا حساس بچہ تھا میرے کہے بنا میرا ہر دکھ اس نے اپنے اندر اتار لیا۔ ہم دونوں کو ایک دوسرے کے سامنے اپنی بات کی وضاحت کے لئے الفاظ استعمال نہیں کرنے پڑتے وہ مجھے اور میں اسے مکمل طور پر جانتے ہیں۔ ہماری محبت بڑی نرالی اور انوکھی ہے۔''

ان کی آنکھ سے بہنے والے اس واحد آنسو کو اس نے اپنے ہاتھ سے پونچھ دیا تھا اور پھر اپنی انگلی کی پور پہ ٹھہرے اس آنسو کو دیکھ کر ان سے بولی تھی۔

''آپ بہت عظیم انسان ہیں۔ اتنے دکھ اٹھا کر بھی اتنے خوش اور مطمئن نظر آتے ہیں۔ تقدیر سے شاکی نہیں آپ کو خدا سے کوئی شکوہ نہیں۔''

اس کی بات کے جواب میں ایک تھکی ہوئی اداس سی مسکراہٹ ان کے ہونٹوں پر پھیلی تھی۔

''خدا اپنے بندوں سے بہت پیار کرتا ہے۔ اس نے اگر مجھ سے کچھ لے لیا تو اس سے کئی گنا بڑھ کر دیا بھی



تو ہے اور جو واپس لے لیا وہ بھی تو اسی کا تھا۔ اس کی تو عنایت تھی کہ اس نے ایک اچھی بیوی اور فرمانبردار بیٹا مجھے دیا تھا اور اب بھی اس کا رحم و کرم مجھے اپنے گھیرے میں لئے ہوئے ہے۔ میرا اویس میرے پاس ہے اور میں اپنے رب کا شکر گزار ہوں۔''

کچھ دیر بعد جب وہ اپنے گھر جانے والے راستے کی طرف بڑھ رہی تھی تو اس نے محسوس کیا کہ وہ جو ہر دم خدا سے اور اپنی قسمت سے ناراض رہا کرتی تھی اچانک بدل گئی ہے۔ اسے محسوس ہوا کہ دنیا میں صرف وہی دکھی اور تنہا نہیں اس سے بھی بڑھ کر غمزدہ اور تنہا لوگ موجود ہیں لیکن وہ اپنے دکھوں سے سمجھوتہ کر لیتے ہیں اور خدا کی رضا میں راضی ہو جاتے ہیں۔

کتنے عرصے بعد اس روز وہ سکون سے سوئی تھی۔ وہ اپنے رب کی شکر گزار تھی جس نے ایک اتنے اچھے شخص سے اسے ملوا دیا جو اسے درست راستہ دکھا رہا ہے اور اسے زندگی کی طرف واپس آنے میں مدد دے رہا ہے۔

پتہ نہیں کیا بات تھی کہ وہ تین روز سے پارک میں نہیں آ رہے تھے۔ ان کے نہ آنے سے وہ بڑی بے کل اور اداس سی ہو رہی تھی۔ روزانہ بڑی آس سے پارک آتی اور مغرب کے وقت تک بیٹھ کر ان کا انتظار کرتی رہتی مگر وہ نہ آتے۔ آہستہ آہستہ اس کی اداسی پریشانی میں بدلتی جا رہی تھی۔ انہوں نے اسے بتایا تھا کہ روزانہ شام کے وقت پارک آنا ان کا برسوں پرانا معمول ہے اور اب وہ اپنے معمول سے ہٹ گئے تھے تو وہ فکرمند ہو گئی تھی۔

ان چار مہینوں میں وہ ان کی اتنی عادی ہو گئی تھی کہ ان سے ملے بغیر اسے کسی پل چین نہیں آ رہا تھا۔ جب پانچویں دن بھی وہ اسے پارک میں نظر نہ آئے تو وہ خود کو روک نہیں پائی اور چلتی ہوئی اسی سڑک پر مڑ گئی جس پر وہ روز مڑا کرتے تھے۔ انہوں نے اسے اشارے سے دکھا کر بتایا تھا کہ کارنر سے پانچواں مکان ان کا ہے۔ وہ دل ہی دل میں ان کی خیر و عافیت کی دعائیں مانگتی پانچویں مکان کے سامنے پہنچ گئی۔ ان کا گھر بھی ان کی شخصیت کی طرح عالیشان تھا۔ گو وہاں تمام ہی مکانات اچھے بنے ہوئے تھے۔ ڈیفنس جیسے پوش علاقے کا وہ وی۔ آئی۔ پی فیز تھا۔ لیکن ان کا گھر دیگر گھروں کے مقابلے میں بہت خوبصورت تھا۔ گیٹ پر موجود چوکیدار سے وہ ابھی ان کے بارے میں پوچھنے ہی والی تھی کہ اندر سے ایک گاڑی بڑی تیز رفتاری سے گیٹ کے پاس آ کر ہارن بجانے لگی۔ چوکیدار نے اسے چھوڑ کر جلدی سے آگے بڑھ کر گیٹ کھول دیا۔ اتنی دیر میں وہ نیم پلیٹ پر جلی حروف میں لکھا ''سید مبشر لودھی'' پڑھ کر کنفرم کر چکی تھی کہ وہ درست جگہ پہنچی ہے۔

گاڑی گیٹ سے باہر نکلی تو اس نے اس امید پر گاڑی کی طرف بغور دیکھا کہ شاید وہ اس میں موجود ہوں مگر اندر موجود ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے بندے کو دیکھ کر اس کی امید مایوسی میں بدل گئی۔ وہ جو تیز رفتاری سے گاڑی آگے بڑھا دینا چاہتا تھا اسے گیٹ پر کھڑی ایک انجان لڑکی کو دیکھ کر رک گیا جو دیکھ بھی اس کی طرف رہی تھی۔ گاڑی میں بیٹھے بیٹھے ہی وہ اس سے بولا۔

''فرمائیے آپ کو کس سے ملنا ہے؟''

''انکل ہیں گھر پر؟'' اس کی بات پر وہ ایک لمحے کو حیران ہوا تو وہ فوراً ہی اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے بولی۔

"مجھے مبشر انکل سے ملنا ہے۔"

"ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے وہ ہاسپٹل میں ایڈمٹ ہیں۔" وہ ایک سرسری سی نگاہ اس کے چہرے پر ڈال کر گاڑی سٹارٹ کرنے لگا تو وہ بے ساختہ دو قدم آگے بڑھ کر اس کی گاڑی کے بالکل پاس آ کر کھڑی ہوتے ہوئے بولی۔

"کیا ہو گیا ہے انہیں؟"

"کچھ ہارٹ ٹربل ہو گئی ہے اس وجہ سے ہوسپٹلائز کرنا پڑا ہے۔" اب کے لہجہ بڑا بے زار اور کوفت زدہ تھا۔ وہ شاید کہیں جانے کی جلدی میں تھا اور یہ بلاوجہ کی انکوائری اسے پسند نہیں آ رہی تھی اسی لئے چہرے پر بڑے ہی بے مروت سے تاثرات نظر آ رہے تھے جیسے وہ کہنا چاہتا ہو کہ "بی بی مجھے معاف کر دو اور ذرا جلدی میرا پیچھا چھوڑ دو۔"

اس کے بے زار سے انداز کو دیکھنے کے باوجود وہ دوبارہ بول پڑی۔

"کس ہاسپٹل میں ایڈمٹ ہیں؟" اسے ہاسپٹل کا نام بتا کر وہ تمام تر مروت بالائے طاق رکھتے ہوئے گاڑی آگے بڑھا گیا تو وہ بھی تھکے تھکے قدموں سے چلتی واپس اپنے گھر آ گئی۔

کچھ لوگوں کے ساتھ آپ تمام عمر گزار دیں مگر آپ کے اور ان کے درمیان کوئی جذباتی وابستگی اور ہم آہنگی پیدا نہیں ہو پاتی اور کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو ایک پل ہی میں اپنے بن جاتے ہیں جن سے ایک بار مل کر بار بار ملنے کو دل چاہنے لگتا ہے۔ جن سے کوئی رشتہ نہ ہونے کے باوجود بھی ایک اپنائیت سی محسوس ہوتی ہے۔ کچھ اسی قسم کا تعلق جڑ گیا تھا اس کا سید مبشر لودھی کے ساتھ۔ وہ جو اس کے کچھ بھی نہیں لگتے تھے اور جنہیں وہ چار ماہ پہلے تک جانتی بھی نہیں تھی آج ان کی علالت کا سن کر بے قرار ہو گئی تھی۔

گھر آ کر اس نے ہاسپٹل فون کر کے وہاں کے ملاقات کے ٹائم کے بارے میں معلوم کیا تو پتہ چلا تھا کہ صبح آٹھ سے دس اور شام پانچ سے سات بجے تک ملنے کے اوقات مقرر ہیں۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اڑ کر پہنچ جائے اور ان کو دیکھ کر اپنے دل کی تسلی کر سکے۔ مگر ان سے ملنا اب کل سے پہلے ممکن نہ تھا اس لئے وہ اپنے بے چین دل کو بہلانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس نے اپنوں کی بے اعتنائیاں سہی تھیں رشتے ناطوں پر اس کا اعتبار اٹھ گیا تھا اور اب جو ایک پرخلوص اور ہمدرد سے انسان نے اسے دوبارہ زندگی کی طرف لانے کی کوشش کی تھی اور وہ کسی حد تک بہل بھی گئی تھی کہ ان کی بیماری اسے انجانے سے وسوسوں میں مبتلا کرنے لگی۔ اس شخص کو وہ کسی قیمت پر کھونا نہیں چاہتی تھی۔

ابھی تو وہ انہیں اپنے بارے میں کچھ بتا بھی نہیں پائی تھی۔ ابھی تو اسے ان سے ڈھیر ساری باتیں کرنی تھیں اپنے دل کا تمام بوجھ ان کے سامنے ہلکا کرنا تھا۔ ابھی تو اس نے انہیں یہ بھی نہیں بتایا تھا کہ وہ ان سے بہت زیادہ محبت کرتی ہے۔ ابھی تو وہ ان کے ہونے کو ڈھنگ سے محسوس بھی نہیں کر پائی تھی کہ جدائی کا، بچھڑ جانے کا عفریت اس کے پیچھے چلا آیا تھا۔

اس رات وہ اپنے رب کے حضور رو رو کر اور گڑگڑا، کر اپنے اس محسن اور پیارے سے انسان کے لئے دعائیں مانگتی رہی تھی۔ صبح وہ جلدی جلدی دو چار لقمے نگل کر اور اسکول فون کر کے کہ وہ آج نہیں آ سکے گی۔ ہاسپٹل چلی آئی دل ہی دل میں دعائیں مانگتی کہ سب خیر ہو، وہ بالکل ٹھیک ہوں۔ اپنے معمول کے مطابق ہنستے مسکراتے اور قہقہے



بکھیرتے ہوئے ہوں وہ ریسپشن سے روم نمبر معلوم کر کے اپنے مطلوبہ کمرے کے سامنے پہنچ گئی۔ سب سے پہلی تسلی تو اسی بات سے ہو گئی تھی کہ وہ آئی سی یو میں نہیں تھے۔ یعنی خطرے کی کوئی بات نہیں تھی۔ دروازے پر ہلکی سی دستک دے کر اس نے اندر سے "یس کم ان" کی آواز سنی تو دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئی۔ وہ بیڈ پر تکیوں سے ٹیک لگائے بیٹھے ہوئے تھے اور ان کے بیڈ کے دائیں طرف کرسی پر بیٹھا وہ شاید انہیں ناشتا کروا رہا تھا۔ دروازے پر دستک ہونے پر وہ دونوں ہی سر گھما کر نو وارد کو دیکھنے لگے تھے۔ اس پر نظر پڑتے ہی ان کے چہرے پر مسکراہٹ نمودار ہو گئی تھی۔

"آہا میری بیٹی آئی ہے۔ اسے کہتے ہیں دل کو دل سے راہ ہونا میں کل سے تمہیں بہت یاد کر رہا تھا۔" انہیں ہشاش بشاش اور باتیں کرتا دیکھ کر اس کی کب سے بے ترتیب دھڑکنیں معمول پر آئی تھیں۔

"السلام وعلیکم کیسے ہیں آپ۔" وہاں موجود اس بندے کی وجہ سے وہ یونہی کھڑی ہوئی فارمل انداز میں ان کی خیریت پوچھنے لگی ورنہ دل تو اس کا یہ چاہ رہا تھا کہ ان کے سینے میں منہ چھپا کر بہت سا روئے اور کہے۔

"اب دوبارہ کبھی بیمار مت ہوئیے گا۔"

"وعلیکم السلام۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ ان لوگوں کو تو شوق ہے مجھے بیمار بنا کر بستر پر ڈالنے کا۔" وہ اپنے برابر بیٹھے بندے کی طرف اشارہ کر کے بولے۔

"تم کھڑی کیوں ہو بیٹھو ناں۔" وہ پر تکلف انداز میں سامنے موجود صوفے پر بیٹھنے لگی تو وہ ٹوکتے ہوئے بولے۔

"وہاں اتنی دور کیوں بیٹھ رہی ہو۔ یہاں میرے پاس آ کر بیٹھو۔" وہ اپنے بیڈ پر اس کے لئے جگہ بنانے لگے تو وہ کچھ جھجکتی ہوئی ان کے بائیں طرف ذرا سا سمٹ کر بیٹھ گئی۔ وہ شاید اس کے آنے سے بہت ہی خوش ہوئے تھے۔ اسی لئے بڑی گرم جوشی سے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے بولے۔

"اویس یہ اجالا ہے۔ میں نے تم سے ذکر کیا تھا ناں کہ پارک میں میری ایک بہت ہی پیاری سی دوست بنی ہے، وہ یہی ہے۔"

وہ اس کے بالکل سامنے بیٹھے شخص سے مخاطب ہوئے تھے۔ جو اتنی دیر سے اپنے پاپا جانی کے لئے باعث مسرت بن جانے والی اس لڑکی کو دیکھ رہا تھا۔ اسے دھیان آیا تھا کہ کل جب وہ ہاسپٹل جانے کی جلدی میں گھر سے نکل رہا تھا تو یہی لڑکی گیٹ پر کھڑی ملی تھی۔ اس وقت اسے ہاسپٹل پہنچ کر پاپا جانی کے ذاتی معالج ڈاکٹر ثروت حسین بخاری سے ملنا تھا۔ اس لئے وہ بڑی بے مروتی سے اس سے ڈھنگ سے بات کئے بغیر چلا گیا تھا۔ عام حالات میں وہ اس بات کی مطلق پروا نہیں کرتا تھا کہ کوئی اس کے بارے میں کیا سوچ رہا ہے۔ اگر کوئی اسے مغرور اور گھمنڈی سمجھتا تھا تو اس کے بلا سے۔ وہ نہ ہر کسی سے بے تکلف ہوتا تھا نہ ہر ایک کو خود سے قریب ہونے کی اجازت دیتا تھا۔ اس کے انہیں رویوں کی بدولت وہ اپنے حلقے میں مغرور مشہور تھا۔ لڑکیاں بالخصوص اس کے مغرورانہ انداز پر بڑا چڑا کرتی تھیں۔ مگر یہاں مسئلہ اس لڑکی کا تھا جو اس کے پیارے پاپا جانی کو پیاری تھی اس لئے اسے اپنے کل کے رویئے پر افسوس سا ہو رہا تھا۔

"ہیلو کیسی ہیں آپ؟" اپنی عادت کے برخلاف وہ بڑی خوش اخلاقی سے مسکرا کر اس سے مخاطب ہوا۔ شاید کل کے رویئے کا ازالہ کرنا مقصود تھا۔

''میں بالکل ٹھیک ہوں۔'' وہ ایک سرسری سی نظر اس پر ڈال کر بولی۔ وہ ان سے اتنی بے تکلفی سے باتیں کیا کرتی تھی مگر اس وقت اس کی موجودگی کے سبب کچھ ریزروسی ہو کر بیٹھی ہوئی تھی۔

''پتہ ہے اولیس یہ اجالا بڑی زبردست آرٹسٹ ہے۔ اس کے ہاتھ کے بنے اسکیچز دیکھو تو حیران رہ جاؤ مجھ سے تو اس نے وعدہ کر رکھا ہے کہ میرا ایک شاندار سا پورٹریٹ بنائے گی۔''

وہ شاید اس کی جھجک محسوس کر گئے تھے اسی لئے ماحول میں بے تکلفی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ان کی اس تعریف سے وہ بری طرح شرمندہ ہو گئی تھی جبکہ وہ مسکرا کر بولا۔

''یہ آپ کا شوق ہے یا پروفیشن؟'' اس کے جواب دینے سے پہلے وہ دوبارہ بول اٹھے۔

''بھئی اس نے فائن آرٹس میں گریجویشن کر رکھا ہے اور بہت پروفیشنل قسم کی جینئس سی ٹیچر ہے یہ آرٹ اسکول میں پڑھاتی ہے خیر سے میری بیٹی۔''

انہیں شاید دوسروں کی تعریفیں کر کے انہیں آسمان پر چڑھانے میں بہت مزہ آتا تھا اس لئے دل کھول کر اس کی تعریف کر رہے تھے جبکہ وہ سرخ چہرے کے ساتھ کچھ شرمندہ سی بیٹھی ہوئی تھی۔ اسے اپنے بارے میں بات ہونا چاہے وہ تعریف ہی کیوں نہ ہو ہمیشہ ہی کچھ پریشان سا کر دیا کرتی تھی۔ انہیں اچانک ایک خیال آیا تو بولے۔

''تمہیں میرے یہاں ایڈمٹ ہونے کا کیسے پتہ چلا؟'' ان کے اس سوال پر ایک لمحے کے لئے اس کی نظریں سامنے بیٹھے شخص کی طرف اٹھی تھیں پھر وہ پرسکون انداز میں بولی تھی۔

''میں آپ کے گھر گئی تھی۔ وہیں سے پتہ چلا تھا۔'' اولیس نے چونک کر اس کی طرف دیکھا تھا شاید وہ اس کے چہرے پر موجود تاثرات سے کچھ اندازہ لگانا چاہتا تھا۔

''اچھا تو تم گھر گئی تھیں۔ یعنی یہ کہ تم نے مجھے مس کیا تھا۔'' وہ مسکرا کر بولے تو اس نے گردن ہلانے پر اکتفا کیا۔

''پاپا جانی باتیں اپنی جگہ لیکن آپ پلیز ناشتا تو کریں۔'' وہ دودھ کا گلاس ان کی طرف بڑھاتا ہوا بولا تو وہ بڑی بے دلی سے گلاس ہاتھوں میں لے کر بیٹھ گئے۔ انہیں ٹھیک ٹھاک دیکھ کر اس کے دل کی تسلی ہو گئی تھی اس لئے اب اسے اپنا یہاں مزید رکنا بڑا بے محل محسوس ہو رہا تھا۔ ان دادا پوتے کی پرائیویسی میں مداخلت اسے اچھی نہیں لگ رہی تھی اس لئے اپنا سائیڈ میں رکھا ہوا بیگ کندھے پر ڈالتے ہوئے بولی۔

''اچھا انکل میں چلتی ہوں۔''

''اتنی جلدی، ابھی کچھ دیر تو اور رکو۔'' وہ بڑی بے ساختگی میں اس کا ہاتھ تھام کر بولے تو وہ معذرت خواہانہ انداز میں بولی۔

''مجھے کچھ کام ہے۔ میں انشاءاللہ کل پھر آؤں گی۔'' وہ ان دونوں کی گفتگو سے بے نیاز اخبار اٹھا کر پڑھنے لگا تھا۔ اس کی معذرت کے جواب میں مجبوراً انہوں نے اس کا ہاتھ چھوڑتے ہوئے اسے جانے کی اجازت دی تو وہ کھڑی ہو گئی۔

''تم جاؤ گی کیسے؟'' ان کی فکرمندی پر وہ مسکرا کر رہ گئی۔



''میں اپنی گاڑی میں آئی ہوں۔ جانے کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔''

''اچھا خدا حافظ۔'' اس کی بات پر انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور بولے۔

''بہت اچھا لگا تمہارا آنا بہت شکریہ۔'' وہ ان کے شکریہ کے جواب میں بہت کچھ کہنا چاہتی تھی مگر سامنے موجود اس اخبار کے پیچھے چھپی شخصیت کی موجودگی اسے کھل کر کچھ کہنے نہیں دے رہی تھی اس لئے خاموشی پر اکتفا کرتے وہ دروازے کی طرف بڑھی۔ اسے دروازے کی طرف بڑھتا دیکھ کر وہ ایک دم اخبار رکھ کر کھڑا ہو گیا اور دروازے کے باہر تک اس کے ساتھ آتا ہوا بولا۔

''خدا حافظ۔'' وہ حیران نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی جو کل ایک اکھڑ اور بد دماغ سا شخص محسوس ہوا تھا اور آج اتنا باادب اور مہمان نواز اپنی حیرت کو چھپاتی وہ اسے خدا حافظ کہتی کوریڈور میں آگے بڑھ گئی تھی۔

اگلے روز وہ ان سے ملنے شام کے وقت آئی تھی اور یہ دیکھ کر اسے بہت خوشی ہوئی تھی کہ وہ اکیلے تھے۔ انہوں نے بڑی گرمجوشی سے اس کا استقبال کیا تھا۔ کل کی نسبت وہ آج ان سے کافی دیر تک باتیں کرتی رہی۔ ان کا خیال تھا کہ وہ بالکل ٹھیک ہیں بس یہ اولیس کو وہم ہو گیا ہے کہ وہ بیمار ہو گئے ہیں۔

''بالکل باؤلا ہے یہ اولیس ذرا سا بی پی کیا ہائی ہوا اس نے تہلکہ مچا دیا جیسے میں کتنا خطرناک بیمار ہو گیا ہوں۔ اصل میں مجھ سے محبت بھی تو بہت کرتا ہے ناں شاید اس لئے میرے لئے اتنی فکر کرتا ہے۔ اتنے دنوں سے میرے ساتھ لگا بیٹھا ہے۔ اس وقت بھی میں نے زبردستی گھر بھیجا ہے کہ جا کر تھوڑی دیر آرام کر کے آؤ۔ حالانکہ میں نے کتنا سمجھایا ہے کہ بچے اتنی جلدی اوپر جانے کا میرا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ ابھی تو مجھے تمہارے بچوں کی بھی شادیاں کروانی ہیں۔'' وہ اپنی عادت کے مطابق ہنسنے ہنسانے میں مصروف تھے۔ حالانکہ ان کے چہرے ہی سے کمزوری اور بیماری ظاہر ہو رہی تھی مگر شاید انہیں اپنی تکلیفوں کا اشتہار لگوانا پسند نہیں تھا اسی لئے خود کو ہشاش بشاش ظاہر کر رہے تھے۔ اس روز وہ ایک گھنٹہ ان کے پاس بیٹھی تھی۔ انہوں نے بتایا تھا کہ وہ زبردستی یہاں سے ڈسچارج ہونے کا پروگرام بنا چکے ہیں اس لئے شاید وہ کل گھر چلے جائیں۔

''ریسٹ ہی تو کرنا ہے وہ میں گھر پر بھی کر سکتا ہوں۔'' وہ مطمئن انداز میں بولے تھے۔

اگلے روز اس ادھیڑبن میں مصروف وہ فیصلہ ہی نہیں کر پائی کہ ان سے ملنے جائے یا نہ جائے۔ پتہ ہی نہیں چل رہا تھا کہ وہ ہاسپٹل سے ڈسچارج ہو گئے ہیں یا نہیں۔ وہ دن تو یونہی گزر گیا۔ اس سے اگلے دن جمعہ تھا۔ اسی لئے وہ اسکول کی چھٹی جلدی ہونے پر گھر واپس آ رہی تھی۔ گاڑی گھر کی طرف موڑتے اسے خیال آیا کیوں نہ ان کے گھر پر معلوم کر لیا جائے کہ وہ واپس آ گئے ہیں یا نہیں۔ اس سوچ کے ذہن میں آنے کی دیر تھی کہ وہ فوراً گاڑی ان کی گلی میں موڑ گئی۔ ان کے گیٹ کے سامنے گاڑی روک کر اس نے چوکیدار سے ان کی موجودگی کی بابت دریافت کیا اور جواب اثبات میں آیا تو اس سے کہا۔

''اندر جا کر انکل کو بتا دیں کہ اجالا ملنے آئی ہے۔''

چوکیدار نے وہاں سے گزرتے کسی ملازم کے ہاتھ پیغام بھجوا دیا اور اس سے بولا۔

''آپ اندر تشریف لے جائیے۔'' اس کی بات پر وہ گیٹ سے اندر داخل ہو گئی اور بغور ارد گرد کا جائزہ لینے

گی۔ لان میں موجود پودوں کی بہتات سے وہ ابھی اچھی طرح لطف اندوز بھی نہیں ہو پائی تھی کہ ملازم بھاگتا دوڑتا اس طرف آیا اور اس سے بولا۔

"آپ جلدی سے اندر چلیں وہ اتنے ناراض ہو رہے ہیں کہ آپ کو باہر کیوں کھڑا کیا ہے۔" اسی ملازم کی ہمراہی میں وہ گھر کے مختلف حصوں سے گزرتی آخر کار لاؤنج میں سے اوپر جاتی سیڑھیوں پر چڑھتی ایک کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ شاید اب خود ہی کمرے سے باہر نکلنے والے تھے اسی لئے کھڑے ہوئے نظر آئے اسے دیکھ کر ان کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"آؤ بیٹا بیٹھو۔" اسے بٹھا کر وہ ملازم کی طرف متوجہ ہوئے۔

"صرف نام ہی کے اخلاق ہو۔ ورنہ اخلاق اور تمیز چھو کر بھی نہیں گزری۔ بتاؤ ذرا اتنی دھوپ میں بچی کو باہر کھڑا کیا ہوا ہے۔" ان کی ڈانٹ کھاتا وہ بے چارہ باہر جانے لگا تو وہ فوراً بولے۔

"میری بیٹی پہلی دفعہ میرے گھر آئی ہے۔ بڑی اچھی سی خاطر تواضع ہونی چاہئے۔" وہ انہیں منع کرنا چاہتی تھی کہ وہ صرف کھڑے کھڑے ان کی خیریت دریافت کرنے آئی ہے مگر وہ کچھ سننے کے موڈ میں ہی نہیں تھے۔ اس نے جانے کے لئے زیادہ زور دیا تو بولے۔

"کیا گھر والے پریشان ہو رہے ہوں گے؟" اگر ایسی بات ہے تو یہاں سے فون کر کے بتا دو کہ تم میرے پاس ہو اور اب میرے ساتھ لنچ کر کے ہی جاؤ گی۔"

"میرے لئے کوئی پریشان نہیں ہوتا۔ میں اگر سارا دن بھی گھر سے غائب رہوں تو کسی کو قطعاً کوئی فرق نہیں پڑے گا۔"

وہ پہلی مرتبہ اپنی ذات کے حوالے سے ان سے کچھ بولی تھی۔ انہوں نے اس کی بات کے جواب میں کچھ بھی نہیں کہا صرف ایک گہری نظر اسکے چہرے پر ڈالتے ہوئے بولے۔

"پھر تو فکر کی کوئی بات ہی نہیں ہے۔ آرام سے بیٹھو۔ بلکہ میرا خیال ہے کہ تم اسکول میں سے سیدھی یہیں آ رہی ہو ایسا کرو منہ ہاتھ دھو کر فریش ہو جاؤ۔" انہوں نے اس کی بات پر کوئی تبصرہ کئے بغیر اتنے آرام سے موضوع بدل دیا کہ وہ حیران رہ گئی۔ وہ جتنا پر تکلف ہونے کی کوشش کر رہی تھی وہ اسے اتنا ہی گھر کا فرد بنانے پر تلے ہوئے تھے۔ وہیں ان کے باتھ روم میں منہ ہاتھ دھو کر اس نے ان کے ساتھ ان کے کمرے میں بیٹھ کر کھانا کھایا۔ وہ اسے اصرار کر کے مختلف چیزیں کھلا رہے تھے۔

"یہ بریانی لو، یہ چکن لو۔ اچھا سویٹ ڈش تھوڑی اور لے لو" ان کے اتنے اصرار پر مجبور ہو کر اسے اپنی روٹین سے ہٹ کر کچھ زیادہ ہی کھانا پڑ گیا۔ وہ خود پرہیزی کھانا کھا رہے تھے۔

کھانے کے بعد چائے پیتے ہوئے انہوں نے آپس میں بہت ساری باتیں کیں۔ وہ تین گھنٹے ان کے ساتھ گزار کر جب وہ واپس جانے لگی تو وہ اس سے کہنے لگے۔

"میں تو اس بیڈ ریسٹ کے ہاتھوں تنگ ہوں۔ اویس ہاسپٹل سے لانے پر صرف اس شرط پر راضی ہوا تھا کہ میں گھر پر مکمل آرام کروں گا۔ اسی لئے آج کل پارک جانے پر بھی پابندی عائد ہے۔ بیٹا تم آئی ہو تو بہت اچھا لگا



ہے۔ کیا تم کل بھی آؤ گی؟"

وہ شاید تنہائی سے بری طرح گھبرا گئے تھے۔ اس نے بے اختیار حامی بھر لی تھی۔ کل کی ڈانٹ پھٹکار کی وجہ سے اخلاق صاحب سچ مچ کے با اخلاق انسان بن گئے تھے اور اسے دیکھ کر مسکرا کر بولے تھے۔

"صاحب اپنے کمرے میں ہیں آپ وہیں چلی جائیں۔" صاحب کے التفات سے اتنی بات تو وہ بھی سمجھ گیا تھا کہ اس لڑکی کی کیا حیثیت اور مرتبہ ہے۔ سیڑھیاں چڑھتی وہ اوپر پہنچی اور ان کے کمرے کی طرف جانے کے لئے کوریڈور میں آگے بڑھی تب ہی اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر اویس باہر نکلا۔ اسے اتنے آزادانہ اور مالکانہ انداز میں کوریڈور میں پھرتے دیکھ کر وہ ٹھٹک کر رک گیا تھا جبکہ وہ اس کو سامنے پا کر کچھ شرمندہ سی ہو گئی تھی۔ اس نے خود ہی اپنے طور پر سمجھ لیا تھا کہ وہ کل کی طرح آج بھی گھر پر نہیں ہوگا۔ لیکن یہ اس کا گھر تھا اور وہ یہاں کہیں بھی اور کسی بھی وقت پایا جا سکتا تھا۔ اپنی بے تکلفی پر کچھ شرمساری ہوتی وہ بے اختیار رک گئی تھی۔

"السلام علیکم کیسی ہیں آپ۔" وہ اتنے عام سے انداز میں اس سے سلام دعا کرنے لگا جیسے یہاں آنا اس کے معمولات میں شامل تھا۔

"وعلیکم السلام۔" اس کے منہ سے آواز بھی بڑی مری مری سی نکلی تھی۔ وہ ایک آدھ سیکنڈ اس کے چہرے کو بغور دیکھتے رہنے کے بعد بولا۔

"پاپا جانی اپنے بیڈ روم میں ہیں۔ یہ سامنے والا کمرہ ان کا ہے۔" اس نے ہاتھ کے اشارے سے بتایا تو وہ فوراً اسی طرف بڑھ گئی۔ وہ شاید کہیں جا رہا تھا اس لئے سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔

اسے دیکھ کر وہ حسب معمول بہت خوش ہوئے تھے۔ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ ان کے پاس گزار کر وہ واپس گھر آ گئی تھی۔ اگلے دن سے اس کے اسکول میں چھٹیاں شروع ہو رہی تھیں اس لئے اس کا صبح کا ٹائم بھی فارغ ہو گیا تھا۔ صبح ناشتے اور دیگر کاموں سے فارغ ہو کر وہ ان کے گھر چلی آئی۔ صبح کے دس بج رہے تھے اور اس کا خیال تھا کہ وہ گھر پر اکیلے ہی ہوں گے۔ وہاں پہنچ کر اس کے اس خیال کی تصدیق بھی ہو گئی تھی۔ لنچ ٹائم تک وہ ان کے پاس رکی تھی۔ اس دوران انہوں نے اسے اپنی سٹڈی بھی دکھائی تھی۔ وہاں موجود کتابوں کا ذخیرہ دیکھ کر وہ انگشت بدنداں رہ گئی تھی۔ وہاں ایک سے ایک نادر اور نایاب کتابیں موجود تھیں۔ اس نے وہیں اسٹڈی میں بیٹھ کر انہیں ان کی من پسند کتاب پڑھ کر سنائی تھی۔ وہ فلور کشن پر گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھے ہوئے تھے اور بڑے غور و فکر سے اسے سن رہے تھے۔ ان کے اصرار پر اس نے دوپہر کا کھانا ان کے ساتھ کھایا تھا۔ اس دوران تین چار مرتبہ اویس نے فون کر کے ان کی طبیعت پوچھی تھی۔ وہ اپنے لئے اس کی بے قراری پر مسکراتے ہوئے اسے تسلی دیتے رہے تھے کہ وہ بالکل ٹھیک ہیں۔ پھر اس طرح روز ان کے پاس آنا جیسے ایک معمول سا بن گیا تھا۔

اتوار کے دن کے علاوہ وہ روزانہ صبح دس، ساڑھے دس بجے ان کے پاس چلی آتی تھی۔ اس دوران اس کا کبھی بھی اویس سے سامنا نہیں ہوا تھا۔ البتہ اس کی موجودگی میں اس کا فون بہت مرتبہ آتا تھا۔ اسے اس طرح ان کے پاس آتے ایک ہفتہ ہو گیا تھا اس روز بھی وہ ان کے گھر آئی ہوئی تھی۔ ادھر اُدھر کے مختلف موضوعات پر باتیں کرتے کچھ ہی دیر گزری تھی کہ اخلاق ان کے لئے ناشتے کے ٹرے سجائے چلا آیا۔ اسے دیکھ کر انہوں نے کڑوا سا

منہ بنایا اور بولے۔

''پی تو لیا تھا صبح میں نے دودھ، اب یہ ناشتے کی کیا تک بنتی ہے۔'' وہ بڑی عاجزی اور خوشامدانہ انداز میں ٹرے ان کے سامنے رکھتا ہوا بولا۔

''اویس بھائی کا چار بار فون آچکا ہے کہ پاپا جانی نے ناشتہ کیا یا نہیں۔ اگر آپ نے ابھی بھی ناشتہ نہیں کیا تو وہ مجھ پر بہت ناراض ہوں گے۔''

''ایک تو اس لڑکے نے میرا ناک میں دم کر رکھا ہے۔ زبردستی اوٹ پٹانگ چیزیں کھلائے چلا جاتا ہے۔ صبح بھی مجھ سے ناراض ہو کر گیا تھا کہ میں اس کے سامنے ناشتہ کیوں نہیں کر رہا۔'' وہ بڑی بے زاری اور ناراضگی سے بول رہے تھے۔

''انکل وہ ٹھیک تو کہتے ہیں۔ آپ کو اپنی صحت کا خیال رکھنا چاہئے۔ تھوڑا سا چکھ لیں۔ پلیز میری خاطر۔'' ان کا دیا مان اور محبت اس سے ایسے جملے بلوا گیا تھا جو اس نے اس سے پہلے کبھی کسی سے نہ کہے تھے۔

''یہ پھیکے...... بدمزہ کھانے تو میں کسی کی خاطر بھی نہیں کھا سکتا۔ تنگ آگیا ہوں میں یہ بدذائقہ اور پرہیزی چیزیں کھا کھا کر۔'' وہ کسی چھوٹے سے بچے کی طرح روٹھے ہوئے انداز میں بولے تو وہ مسکرا دی اور بولی۔

''اچھا آپ مجھے بتائیں آپ کا کیا کھانے کو دل چاہ رہا ہے۔ میں آپ کی پسند کے مطابق کھانا بنا کر لاؤں گی۔'' وہ انہیں کسی بچے کی طرح ڈیل کرنے لگی تو وہ کچھ حیرانی سے بولے۔

''تم بناؤ گی؟''

''جی میں بناؤں گی۔ آپ نے کیا مجھے بالکل ہی پھوہڑ اور بدسلیقہ سمجھ لیا ہے۔ جلدی بتائیں کیا بناؤں۔'' وہ کھڑی ہوگئی تھی جیسے اب یہ مہم وہ سر کر کے ہی رہے گی۔

''مجھے ارہر کی دال چاول اچار کے ساتھ کھانا ہیں۔ خوب مرچوں والی دال جس پر اصلی گھی کا بگھار لگا ہو۔'' وہ منہ میں پانی بھرتے ہوئے بولے۔

''اوہ بعد میں اویس سے ڈنڈے کھاؤں کہ میرے پاپا جانی کو اصلی گھی اور اچار کیوں کھلایا ہے۔'' وہ ہنستے ہوئے بولی تو وہ بھی مسکرا دیے اور کہنے لگے۔

''چلو اصلی گھی نہ سہی کورن آئل کا بگھار بھی چلے گا۔'' اخلاق چپ چاپ کھڑا ان کے مذاکرات سے محفوظ ہو رہا تھا۔ انہیں تھوڑی دیر انتظار کرنے کا کہہ کر وہ اخلاق کے ساتھ ہی کچن میں آگئی۔ وہاں موجود خانساماں نے اسے حیران ہو کر دیکھا تھا۔ گزشتہ چند روز سے گھر میں پابندی سے آتی اس لڑکی کا صاحب سے کیا رشتہ ہے یہ بات وہاں کے تمام ملازمین کے لئے سوالیہ نشان تھی۔ یہ گھر جس میں کسی عورت کا کوئی وجود نہ تھا۔ یہاں تک کہ ملازم بھی سارے مرد ہی تھے، وہاں انہوں نے پہلی مرتبہ کسی لڑکی کو آتے دیکھا تھا۔ وگرنہ اس سے پہلے یہاں صرف بطور مہمان تھوڑی بہت دیر کو ہی خواتین یا لڑکیاں آتے دیکھی گئی تھیں۔ اخلاق اسے وہاں چھوڑ کر چلا گیا تھا اور وہ خانساماں سے چیزوں کے بارے میں پوچھتی جلدی جلدی پکانے میں مصروف تھی۔ دال چڑھ گئی اور چاول اس نے چن لئے تو سوچا کہ اس کے پکنے میں تو تھوڑی دیر لگے گی جبکہ وہ بھوکے بیٹھے ہوئے ہیں۔ اس خیال کے آتے وہ سوچنے لگی کہ انہیں کیا دے۔



کافی دیر غور کرنے کے بعد اس نے ان کے لئے گریپ فروٹ کا جوس نکالنے کا سوچا۔ وہ سٹریس پریس میں گریپ فروٹ کا جوس نکال رہی تھی جب اسے لاؤنج سے آتی آواز سنائی دی جو یقیناً اویس کی تھی وہ اخلاق سے کہہ رہا تھا۔

''پاپا جانی نے کچھ کھایا؟'' وہ ایک دم گھبرا گئی تھی۔ پتہ نہیں اس کی اپنے گھر میں اتنی بے تکلف آمد کو وہ پسند بھی کرتا تھا یا نہیں۔ اس شخص کے چہرے پر موجود تاثرات سے وہ کبھی بھی نہیں جان پائی تھی کہ وہ اس کے لئے کس انداز سے سوچتا ہے۔ لیکن اسے لگتا تھا کہ وہ شاید اسے ناپسند ہی کرتا ہے۔

اخلاق سے کچھ کہتا وہ کچن کی طرف آگیا تھا۔

''شاید! پاپا جانی کے لئے کھانا نکالو میں......'' وہ بڑے مصروف انداز میں بولتا ہوا کچن کے دروازے میں آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ اس پر نظر پڑتے ہی اپنا جملہ ادھورا چھوڑ کر اسے حیرانی سے دیکھنے لگا تھا۔ شاید اتنا بے تکلف مہمان اس نے اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ ہی دیکھا تھا۔ ایک لمحے کو تو اسے ایسا لگا کہ یہ گھر اجالا کا ہے وہ یہاں مہمان ہے۔ وہ اتنے استحقاق سے کچن میں ٹیبل کے پاس کھڑی ہوئی تھی۔

''السلام علیکم۔'' وہ اپنے آپ بھی بڑا عجیب سا محسوس کر رہی تھی۔ مگر بہر حال اس نے سلام کرنے میں پہل کر دی تھی۔

''وعلیکم السلام۔'' اس کے چہرے پر پھیلی شرمندگی دیکھ کر اس کے لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔ وہ شاید توقع نہیں کر رہی تھی کہ وہ اس وقت بھی گھر آ سکتا ہے اور اب اسے سامنے پا کر وہ بڑا گلٹی فیل کر رہی تھی۔

''خیریت سے ہیں آپ؟'' وہ اس کی شرمندگی نظر انداز کر کے بڑے عام سے انداز میں بولا تو اس نے گردن ہلا کر اپنی خیریت سے آگاہ کر دیا تھا۔

اسے مزید شرمندگی سے بچانے کے لئے وہ وہاں سے پلٹ گیا تھا۔ اس کے جاتے ہی اجالا نے کب سے اٹکی ہوئی سانس بحال کی تھی۔ ہارٹ بیٹ کو نارمل کرتی وہ جگ اور گلاس ٹرے میں رکھ کر ان کے کمرے کی طرف چلی آئی۔ اس کا ارادہ تھا کہ انہیں جوس پلا کر وہ فوراً گھر سدھارے گی۔ بغیر دروازہ نوک کئے وہ آرام سے اندر داخل ہوئی تو وہ بیڈ پر ان کے پاس ہی بیٹھا ہوا تھا۔

''کیا میری قسمت میں ہمیشہ ہی اس شخص کے سامنے شرمندہ ہونا لکھا گیا ہے۔ کیا سوچ رہا ہوگا وہ کہ میں کتنی ال مینرڈ اور ان کلچرڈ لڑکی ہوں۔'' وہ اپنے بے ڈھنگے پن کو کوس کر رہ گئی تھی۔ وہ دونوں آپس میں کوئی بات کر رہے تھے۔ اسے ایک دم اندر آتا دیکھ کر وہ اس کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔

''لگتا ہے تم بھی دشمنوں کے کیمپ میں شامل ہو گئی ہو۔'' وہ اس کے ہاتھ میں پکڑی ٹرے دیکھ کر ناراضی سے بولے تو وہ احتجاجاً چیخ اٹھا۔

''یہ دشمنوں سے آپ کی کیا مراد ہے؟''

''میں کوئی تم سے ڈرتا ہوں اچھی بھلی میری بیٹی کو بھی پتہ نہیں کیا پٹیاں پڑھائی ہیں کہ گھنٹے بھر سے کچن میں جتی ہوئی تھی۔'' وہ اس تمام گفتگو سے بے نیاز ان کے سامنے ٹرے رکھ کر صوفے پر بیٹھ گئی۔

''اور وہ دال چاول کیا ہوئے؟'' انہوں نے برا سا منہ بنا کر اس سے دریافت کیا۔

''وہ ابھی پک رہے ہیں۔ تھوڑی دیر اور لگے گی۔'' اسے سامنے پا کر وہ بڑی رکی سے انداز میں انہیں جواب دے کر اپنے ہاتھوں پر نظریں جما کر بیٹھ گئی۔ اگر وہ یہاں نہ ہوتا تو وہ خود اپنے ہاتھوں سے انہیں جوس پلاتی۔

''صرف تمہاری وجہ سے یہ پی رہا ہوں۔ ورنہ دنیا کی کوئی طاقت مجھے مجبور نہیں کر سکتی تھی۔'' وہ خفا خفا سے انداز میں بولتے گلاس میں جوس ڈال کر گھونٹ گھونٹ پینے لگے۔ وہ اس جادو اثر لڑکی کو دیکھ کر رہ گیا تھا جو اتنے آرام سے کام سرانجام دے گئی تھی جسے کرنے میں وہ صبح سے ناکام تھا۔

''آپ کو یاد ہے ناں آج ڈاکٹر بخاری سے اپائنمنٹ ہے۔ میں اپنے کمرے میں ہوں آپ تیار ہو جائیں تو مجھے بلوا لیجئے گا۔'' انہوں نے خالی گلاس ٹرے میں رکھتے بے توجہی سے اس کی بات سنی تھی جبکہ وہ کمرے سے باہر چلا گیا تھا۔ وہ تو پہلے ہی جانے کے لئے تیار بیٹھی تھی اب جو ان کے جانے کا سنا تو اس کے کمرے سے نکلتے ہی خود بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ حالانکہ اسے مزید رکنے کے لئے مجبور کر رہے تھے، مگر اس نے سہولت سے معذرت کر لی تھی۔ جانے سے پہلے دال بگھار کر اور شاہد کو بتایا کہ انکل کی تھوڑی دیر بعد دال چاول کھلا دینا وہاں سے چلی آئی تھی۔

اگلے دو روز وہ ان سے ملنے نہیں آئی اور صرف فون کر کے ہی ان سے بات چیت کر لی۔ حالانکہ وہ جانتی تھی کہ وہ اس کا انتظار کر رہے ہوں گے وہ خود بھی تو ان سے ملنے اور باتیں کرنے کی اتنی عادی ہو گئی تھی کہ ان سے ملے بغیر وہ ایک دن بھی نہیں رہ سکتی تھی۔ مگر وہاں موجود وہ قدرے مغرور اور اکھڑ سا بندہ اس کے وہاں جانے کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ تھا۔ وہ شاید اپنے پاپا جانی کے لحاظ میں اسے کچھ کہتا تو نہیں تھا مگر اجالا کو اندازہ تھا کہ وہ ایک غیر اور انجان لڑکی کا اتنے بے تکلفانہ انداز میں اپنے گھر آنا پسند نہیں کرتا۔ اور کسی کے گھر ناپسندیدہ اور زبردستی کا بن بلایا مہمان بن کر جانا اسے بڑا آکورڈ سا لگ رہا تھا اور جو کسی روز وہ تمام تر لحاظ اور مروت ایک طرف رکھ کر اس سے کہہ دے کہ محترمہ آپ ہمارا پیچھا چھوڑ نہیں سکتیں تو وہ تو شرم اور غیرت کے مارے شاید مر ہی جائے۔

مگر تیسرے ہی دن وہ اپنے عہد سے پھر گئی کہ اب وہاں نہیں جانا اور دوبارہ سے ان کے گھر جانے کے لئے تیار ہونے لگی۔ اسے پتہ تھا کہ ان دنوں وہ اپنی بیماری کے ہاتھوں تنگ آ کر بڑے ڈپریس سے رہنے لگے تھے اور ان کی اداسی پر وہ ہرگز بھی برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے بڑے پیار سے اور دل سے ان کے لئے بہت کم مسالے اور ہلکا سا نمک ڈال کر حلیم بنایا۔ ان کے پرہیز کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے اس نے مرغی کا گوشت استعمال کیا ڈونگے میں حلیم کے اوپر خوب اچھی طرح ہرا دھنیا اور لیموں وغیرہ سجا کر وہ فارغ ہوئی تو خیال آیا کہ فون کر کے معلوم کر لیتی ہوں وہ اکیلے ہیں یا نہیں۔ اگر وہ بھی ہوا تو ڈرائیور کے ہاتھ حلیم بھجوا دوں گی۔ ممی نے اسے کچن میں مصروف دیکھ کر بڑی حیرت سے پوچھا۔

''کیا پکا رہی ہو؟'' عرصہ ہوا وہ گھر اور گھر سے متعلق تمام امور سے لاتعلق ہو چکی تھی۔ اس نے سرسری سے انداز میں جواب دیا تو وہ جو شاید مسعود کے لئے کچھ پکانے آئی تھیں اپنے کام میں مصروف ہو گئیں۔ وہ فون کرنے کے لئے لاؤنج میں آ گئی۔ تیسری ہی بیل پر فون ریسیو کر لیا گیا تھا۔ اخلاق کی آواز وہ اچھی طرح پہچان گئی تھی۔

''میں اجالا بول رہی ہوں۔'' اس کے استفسار پر وہ بولی تھی۔

''کیسی ہیں آپ؟ صاحب آپ کو بہت یاد کر رہے تھے۔''



اتنے دن سے وہ ان کے گھر مستقل آ جا رہی تھی اسی لئے وہ اٹھارہ انیس سال کا لڑکا بڑی اپنائیت سے اس سے بول رہا تھا یا پھر شاید گھر کے مالک کی اس والہانہ محبت اسے بتا گئی تھی کہ وہ کوئی عام سی مہمان نہیں ہے۔

''انکل ہیں گھر پر؟'' اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اپنے مطلب کی بات کیسے پوچھے۔

''ہاں وہ گھر پر ہی ہیں۔ آپ بات کریں گی کیا ان سے؟''

''اویس بھی ہیں گھر پر۔'' اس نے لہجے کو بڑا سرسری سا بنا کر پوچھا جیسے یہ بات وہ یونہی اتفاقاً پوچھ بیٹھی تھی۔

''اویس بھائی تو کہیں گئے ہوئے ہیں آپ کو کیا ان سے کوئی کام ہے؟'' لاؤنج کا دروازہ کھول کر اندر آتا اویس اپنا نام سن کر رک گیا۔ اس وقت اس کا کوئی بھی کال اٹینڈ کرنے کا موڈ نہیں ہو رہا تھا اس لئے دور کھڑا ہو کر صرف یہ دیکھنے کے لئے رک گیا کہ کہیں کوئی ضروری فون نہ ہو۔ دوسری طرف پتہ نہیں کون تھا جس سے وہ بڑی خوش اخلاقی سے کہہ رہا تھا۔

''اچھا آپ آ رہی ہیں۔ یہ تو بہت ہی اچھی بات ہے۔ صاحب خوش ہو جائیں گے جی خدا حافظ۔'' وہ فون رکھ کر مڑا تو اویس کو کھڑا دیکھ کر سلام کرتا ہوا غالباً اندر پاپا جانی کو اس کی آمد کے بارے میں بتانے کے لئے چلا گیا۔ اس سے کچھ پوچھے بغیر ہی وہ جان گیا تھا کہ یہ فون کس کا تھا۔ حالانکہ وہ اس وقت صرف کپڑے چینج کرنے گھر آیا تھا اسے جم خانہ جانا تھا۔ مگر اپنا جانے کا پروگرام فی الفور ملتوی کر کے وہ وہیں لاؤنج میں بیٹھ گیا۔

وہ اپنے بارے میں بڑا خود آگاہ تھا۔ اسے پتہ تھا کہ لوگ اسے مغرور کہتے ہیں۔ کتنے لوگ اس سے بات کرنے اور اس کے قریب آنے کے لئے ہزاروں جتن کرتے ہیں اور وہ انہیں منہ بھی نہیں لگاتا۔ اپنے پاپا جانی اور قریبی دوستوں کے علاوہ اس کا دیگر تمام افراد کے ساتھ ایسا رویہ ہوتا تھا جیسے وہ ان سے بات کر کے کوئی بہت بڑا احسان کر رہا ہو۔ وہ عام طور پر لوگوں سے زیادہ گھلنا ملنا پسند نہیں کرتا تھا۔ مگر یہ لڑکی اجالا شہریار جو اس کے پاپا جانی کو بڑی عزیز ہو گئی تھی اس کے لئے وہ اپنے تمام اصول اور ضابطے ترک کر سکتا تھا۔ اسے اندازہ تھا کہ دیگر افراد کی طرح شاید وہ بھی اسے مغرور اور خود پرست سمجھتی ہے اور شاید وہ خود بھی دوسروں سے دبے رہنا اور کم بات چیت کرنا پسند کرتی ہے اسی لئے اس سے فری ہونے کی کوشش کرنے کے بجائے وہ وہاں اس کی موجودگی میں آنے سے پرہیز کر رہی تھی۔ اس نے ابتک کی زندگی میں صرف لڑکیوں کو اپنے پیچھے بیوقوفوں کی طرح منڈلاتے دیکھا تھا۔ شاید یہ لڑکی ان سب سے مختلف تھی اور اس کی یہ غلط فہمی کہ وہ اس کی یہاں آمد جو پسند نہیں کرتا وہ اسے دور کر دینا چاہتا تھا۔ اگر اس کے پاپا جانی اس لڑکی سے محبت کرتے تھے اس کے ساتھ وقت گزارنا انہیں اچھا لگتا تھا تو وہ کون ہوتا تھا اعتراض کرنے والا۔ وہ تو الٹا اس کا شکر گزار تھا کہ وہ یہاں آ کر ان کو کمپنی دیتی ہے ان کا ڈپریشن کم کرنے کی کوشش کرتی ہے۔

ٹھیک دس منٹ بعد وہ لاؤنج کا سلائیڈنگ ڈور کھول کر اندر داخل ہوئی۔ اندر داخل ہوتے ہی اس کی نظر صوفے پر بیٹھے اویس پر پڑی تو وہ دل ہی دل میں اخلاق کو گالیاں دیتی آگے بڑھی۔ آ گئی تھی تو اب واپس تو جایا نہیں جا سکتا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر اخلاقاً کھڑا ہوتا ہوا بولا۔

''السلام علیکم''۔ اس نے بڑی بے دلی سے سلام کا جواب دیا۔

"آپ بیٹھیے پاپا جانی کے کسی دوست کا فون آیا ہوا ہے وہ اس میں بزی ہیں۔" وہ بڑی نرم سی مسکراہٹ چہرے پہ لاتا ہوا بولا۔ اسے مجبوراً صوفے پر بیٹھنا ہی پڑ گیا۔ اسے بٹھا کر وہ خود بھی سامنے بیٹھ گیا۔ اپنے ہاتھ میں پکڑا ڈونگا اس نے سینٹر ٹیبل پر رکھ دیا۔ وہ بغور اس کے چہرے کا جائزہ لے رہا تھا جبکہ وہ کچھ الجھی ہوئی سی بیٹھی ہوئی تھی۔

"میں اتنے دنوں سے آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہ رہا تھا لیکن اتفاق سے آپ سے ملاقات نہیں ہو پا رہی تھی۔"

وہ تعجب سے اس کی طرف دیکھنے لگی تو وہ اپنی بات کی وضاحت کرنے لگا۔

"آپ پاپا جانی کا اتنا خیال رکھتی ہیں۔ انہیں اتنا ٹائم دیتی ہیں۔ ظاہر ہے آپ کی اس مہربانی پر مجھے آپ کا شکریہ تو ضرور ہی ادا کرنا چاہئے تھا۔" وہ اتنے بھاری بھرکم تشکرانہ الفاظ پر بوکھلا کر رہ گئی۔ لیکن اب اس کی بات کے جواب میں کچھ نہ کچھ کہنا بھی ضروری تھا اس لئے کچھ نروس سے انداز میں بولی۔

"اس میں شکریہ کی کوئی بات نہیں ہے۔ آپ پلیز اس ذکر کو رہنے دیجئے۔"

"آپ کہہ رہی ہیں تو رہنے دیتا ہوں ورنہ یہ آپ کا میرے اوپر احسان ہی ہے۔ پہلے میں آفس میں بیٹھ کر پاپا جانی کی طبیعت کی طرف سے پریشان رہتا تھا اب آپ کے ہونے سے تسلی رہتی ہے کہ وہ اکیلے نہیں ہیں۔" وہ کچھ شرمندہ سی سر جھکا کر بیٹھی ہوئی تھی۔

"ہم لوگوں کی اس سے پہلے آپس میں اتنی کوئی خاص بات چیت نہیں ہوئی لیکن اس کے باوجود پاپا جانی کی بدولت میں آپ کے بارے میں بہت کچھ جانتا ہوں۔ جب سے آپ انہیں ملی ہیں ان کے پاس آپ کے علاوہ بات کرنے کے لئے کوئی ٹاپک ہی نہیں ہوتا۔ اجالا یوں کرتی ہے وہ اسکیچز بھی اچھے بناتی ہے، اسے کوکنگ بہت اچھی آتی ہے، وہ بڑی نرم دل اور ہمدرد ہے وغیرہ وغیرہ اس قسم کے جملے میرا خیال ہے میں روز ہی سنتا ہوں۔" وہ بڑے دوستانہ انداز میں مسکرا کر بول رہا تھا۔ اس کی بات پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر لہرائی تھی۔

"مجھ سے بھی وہ آپ کے بارے میں بہت ساری باتیں کرتے ہیں۔ بلکہ پہلے جب میں ان سے پارک میں ملا کرتی تھی اس وقت بھی آپ کا غائبانہ تعارف تھا۔" وہ ایک نظر اس کے چہرے پر ڈال کر دھیمے سروں میں بولی تھی۔

"اس غائبانہ تعارف میں یقیناً میری خوب تعریفیں ہی ہوتی ہوں گی۔ بقول میرے دوستوں کے میرا دماغ انہیں الٹی سیدھی تعریفوں نے خراب کیا ہے۔"

وہ بڑی شگفتگی سے مسکرا کر بولا۔ وہ ابھی اس کی بات کے جواب میں کچھ کہنے ہی والی تھی کہ وہ سیڑھیاں اترتے نظر آئے۔

"کل کہاں تھیں بے وفا لڑکی۔ میں نے تمہارا کتنا انتظار کیا۔" وہ دور ہی سے بولتے ہوئے آپ قریب آ کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے۔

"لگتا ہے تم مجھ سے بور ہو گئی ہو۔"

"نہیں انکل ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ وہ میں کچھ بزی تھی اس لئے نہیں آ سکی تھی۔" وہ ایک دم بوکھلا کر وضاحت کرنے لگی تو وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔ وہ خاموشی سے بیٹھا ان دونوں کو دیکھ رہا تھا۔

"اس میں کیا ہے؟" ان کی نظر ٹیبل پر رکھے ڈونگے پر پڑی تو پوچھنے لگے۔



"میں آپ کے لئے حلیم بنا کر لائی ہوں۔" وہ ان کے برابر میں صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

"حلیم لائی ہو۔ زبردست، لیکن یہ میرے کھانے پینے کا دشمن مجھے کبھی بھی حلیم نہیں کھانے دے گا۔ اسے تو ہر بات میں کولیسٹرول اور کیلوریز کا غم ستاتا رہتا ہے۔" وہ کچھ مایوسی سے بولے۔ "لیکن یہ میں نے چکن میں بنایا ہے اولیو آئل use کیا ہے میں نے اور مسالے بھی بہت ہلکے رکھے ہیں۔" وہ فوراً بولی۔

"ایسی بات ہے تو لاؤ ابھی کھا کر دیکھا جائے تم نے کیسا حلیم پکایا ہے۔" اخلاق کی تلاش میں نظریں دوڑاتے ہوئے اسے موجود نہ پا کر اس سے بولے۔

"ذرا بھاگ کر کچن سے ایک پلیٹ اور چمچ تو لے آؤ" اولیس مسکراتا ہوا پاپا جانی کی بیتابی دیکھ رہا تھا۔

"جلدی لے آئیں ورنہ یہ اسی میں شروع ہو جائیں گے۔" وہ اس کے بدلے ہوئے بے تکلف انداز پر دل بھر کر حیران ہوتی کچن سے پلیٹ چمچ لے آئی۔ پہلا چمچہ منہ میں ڈالتے ہی انہوں نے اس کی شان میں قصیدہ خوانی شروع کر دی تھی۔ حلیم کی شان میں زمین آسمان ایک کئے جا رہے تھے اور وہ چپ چاپ بیٹھی انہیں کھاتا دیکھ کر دل ہی دل میں بہت خوش ہو رہی تھی۔

"تم جم خانہ نہیں گئے۔" انہیں اچانک اس کا دھیان آیا تو پوچھنے لگے۔

"کچھ تھکن ہو رہی ہے اس لئے پروگرام کینسل کر دیا ہے۔"

"شاہد ذرا اچھی سی کافی تو بلواؤ۔" انہیں جواب دے کر وہ شاہد کو آواز دینے لگا۔

"شاہد کو رہنے دو۔ آج ہمیں ہماری بیٹی کافی بنا کر پلائے گی۔ وہ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے اولیس سے مخاطب ہوئے تو وہ مسکرا کر کہنے لگا۔

"ان سے پوچھ تو لیں کہیں وہ مائنڈ نہ کر جائیں کہ ہمارے ہاں مہمانوں سے کام کروایا جاتا ہے۔"

"مہمان کیوں ہوئی یہ اس کا اپنا گھر ہے۔ کیوں اجالا کیا تم اسے اپنا گھر نہیں سمجھتیں۔" وہ اس وقت بہت بری پھنسی تھی۔ انکل تو اس سے ہمیشہ ہی اسی قسم کی باتیں کیا کرتے تھے مگر وہ اس کی موجودگی کے سبب بری طرح نروس ہو رہی تھی۔ کوئی جواب دینے کے بجائے وہ کافی بنانے کے لئے کھڑی ہو گئی۔ وہ دونوں ہی شاید اس کی بوکھلاہٹ اور نروس ہونے کو محسوس کر گئے تھے اس لئے مزید کچھ نہیں کہا گیا۔

تھوڑی دیر بعد جب وہ کافی بنا کر وہاں آئی تو وہ آپس میں گفتگو میں مشغول تھے۔ ان دونوں کو کپ سرو کر کے وہ اپنا کپ لے کر انکل کے برابر میں بیٹھ گئی۔ کافی کا سپ لیتا وہ ان سے مخاطب ہوا۔

"میں آپ کو بتانا تو بھول ہی گیا۔ ویزا لگ گیا ہے۔ اب آپ ڈسائیڈ کر لیں کہ کب چلنا ہے۔" اس کی بات پر وہ ایک دم خوش ہو اٹھے تھے۔

"دیر کس بات کی ہے۔ میں تو ابھی تیار ہوں۔ تم اپنی سہولت دیکھ لو، اسی حساب سے سیٹس کنفرم کروا لو" وہ سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی کہ وہ کہاں جانے کی بات کر رہے ہیں۔ وہ خود ہی اسے بتانے لگے۔

"ہم دادا پوتا ہر سال کہیں نہ کہیں گھومنے جاتے ہیں یہ اور بات ہے کہ میں اس کے پیچھے لگا رہتا ہوں اور یہ مصروفیات کا بہانہ بنا کر ٹال مٹول سے کام لیتا رہتا ہے اور پھر آخر کار سو نخروں کے بعد کہیں یہ حضرت اذیل ایبل

ہوتے ہیں۔ اس بار صورتحال کچھ ڈفرنٹ ہے۔ انہیں کیونکہ وہم ہو گیا ہے کہ مجھے اپنی طبیعت کے پیش نظر تبدیلی آب و ہوا کی شدید ضرورت ہے اس لئے میرے کہے بغیر خود ہی پروگرام ارینج کر لیا۔ پیرس، روم اور لندن تو پہلے ہی ہمارے پروگرام میں شامل تھے۔ میں نے سوچا کہ کیوں نہ واپسی میں آتے ہوئے عمرہ بھی کر لیا جائے۔ خوش قسمتی سے اس کا ویزا بھی فوراً ہی مل گیا۔'' ان کی وضاحت پر وہ کچھ بجھے بجھے ہوئے انداز میں بولی۔

''کتنے دنوں کے لئے جا رہے ہیں آپ؟''

''کم سے کم ایک مہینہ تو ضرور لگے گا۔'' وہ اس کے اداس چہرے کو دیکھ کر کہنے لگے۔

''اچھا تم یہ بتاؤ وہاں سے تمہارے لئے کیا لاؤں۔'' وہ شاید اسے بہلانے کی کوشش کر رہے تھے۔ اویس کافی کا کپ ہاتھ میں لئے بڑی فرصت سے اس کے چہرے کو پڑھ رہا تھا۔ اس نے انکار میں گردن ہلا دی تو وہ کہنے لگے۔

''ٹھیک ہے پھر میں اپنی مرضی سے جو بھی لے آؤں چپ چاپ رکھ لینا یہ مت کہنا کہ یہ چیز تو مجھے بالکل بھی پسند نہیں ہے۔'' اسی وقت اویس کے موبائل کی بیل بجی تھی اور ایکسکیوز کرتا ہوا وہاں سے اٹھ گیا تھا۔

اس کے رویے سے کچھ حوصلہ ملا تھا اسی لئے وہ اگلے دن دس بجے ان کے گھر آ گئی تھی۔ وہ خود تو گھر پر موجود نہ تھا انکل البتہ گھر پر ہی تھے۔ انہوں نے اسے بتایا تھا کہ کل رات بارہ بجے کی فلائٹ سے وہ لوگ روم جا رہے ہیں پھر وہاں سے پیرس، لندن اور آخر میں جدہ۔ ان کی بات پر وہ بہت اداس ہو گئی تھی۔ ان سے اتنے دن کی جدائی کا سوچ کر اسے گھبراہٹ ہو رہی تھی۔ اگلے دن اس نے انہیں فون پر ہی خدا حافظ کہہ دیا تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ وہ ان کے سامنے جا کر رو پڑے گی اور وہ اس کے رونے پر حیران ہوں گے ان کے گھومنے پھرنے کے لئے کہیں جانے پر رونے کا کونسا پہلو نکلتا ہے۔

☆☆☆

دن بڑے بے کیف سے گزر رہے تھے۔ وہ جو ان سے روز ملنا ایک روٹین سا بن گیا تھا اب ان کے بغیر اسے کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ اللہ اللہ کر کے ایک مہینہ پورا ہوا تو اس نے سکون کا سانس لیا۔ فون کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ لوگ ابھی نہیں آئے ہیں۔ پھر وہ روز ہی فون کر کے معلوم کرتی اور ہر روز ہی اسے مایوسی کا سامنا کرنا پڑتا۔ یونہی کرتے دس روز مزید گزر گئے تھے۔ صرف ایک مہینہ اور دس دن ان کے بغیر صدیوں کے برابر محسوس ہو رہے تھے۔

اس روز چھٹی کا دن تھا۔ وہ ناشتے کے بعد بے دلی سے اپنے کمرے میں لیٹی وقت گزارنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اسی وقت حمیدہ نے اطلاع دی تھی کہ اس کا فون ہے۔ وہ اندازے لگاتی کہ کس کا فون ہو سکتا ہے لاؤنج میں آ گئی تھی۔ دوسری طرف انکل کی آواز سن کر وہ خوشی کے مارے چیخ اٹھی تھی۔

''اتنے دن لگا دیئے آپ نے میں آپ کو اتنا یاد کر رہی تھی۔'' دوسری طرف وہ حیران ہو کر کہہ رہے تھے۔

''اتنے زیادہ دن تو نہیں لگے صرف ایک مہینہ اور دس دن زیادہ تو نہیں ہوتے۔''

''آپ کے لئے نہیں تھے میرے لئے زیادہ تھے۔ آپ کا کیا ہے آپ تو وہاں گھوم پھر رہے تھے انتظار میں تو میں سوکھ رہی تھی۔'' وہ اس کے روٹھے لہجے پر بے اختیار ہنس پڑے تھے۔

''مجھے کیا پتہ تھا میری بیٹی اتنی شدت سے مجھے یاد کر رہی ہے ورنہ میں اور جلدی آ جاتا۔ خیر یہ بتاؤ تم مجھ سے



ملنے یہاں آ رہی ہو یا میں تمہارے گھر آ جاؤں؟''

''میں آ رہی ہوں، ابھی فوراً۔'' وہ جلدی سے بولی تھی۔ انہیں خدا حافظ کہتے ہی وہ فوراً ہی گھر سے نکل کھڑی ہوئی تھی۔ ان کے اور اس کے گھر کے درمیان مشکل سے دس منٹ کا واکنگ ڈسٹنس تھا۔ وہ بھی اس نے تیز قدموں سے طے کیا تو تین چار منٹ کے اندر ہی ان کے گھر پہنچ گئی۔ لاؤنج کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی تو وہ صوفے پر بیٹھے ٹی وی دیکھ رہے تھے اور اویس فلور کشن پر بیٹھا اخبار کا مطالعہ کر رہا تھا۔ انگریزی اور اردو کے تین چار اخبارات اس کے سامنے بکھرے پڑے تھے۔ اسے اندر آتا دیکھ کر وہ دونوں ہی اس کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔

''کیا سپیڈ ہے بھئی ابھی تو پاپا جانی نے کارڈلیس رکھا ہی تھا کہ آپ پہنچ بھی گئیں۔'' وہ مسکرا کر بولا تھا۔

''ویسے آپ دونوں کا ایک سا حال ہے۔ یہ پاپا جانی رات کو بارہ بجے آنے کے ساتھ ہی آپ کو فون کھڑکانے والے تھے وہ تو میں نے روک دیا کہ انشاء اللہ صبح بھی ہو گی۔ کسی کے گھر فون کرنے کا یہ بڑا ہی اوڈ ٹائم ہے۔'' اس کی بات پر پاپا جانی جو اسے ہاتھ پکڑ کر اپنے برابر بٹھا رہے تھے بول پڑے۔

''تم کیا جل رہے ہو۔ ہماری محبت سے۔'' اسے فارغ کر کے وہ اجالا کی طرف متوجہ ہوئے۔

''کیسی ہے میری بیٹی۔ کچھ کمزور سی لگ رہی ہو کیا بات ہے۔'' وہ ان کی فکرمندی پر مسکرا دی اور تسلی دینے والے انداز میں بولی۔

''میں بالکل ٹھیک ہوں۔ آپ لوگوں کا ٹور کیسا رہا؟''

''ٹور ایک دم شاندار رہا ہم دونوں دادا پوتا خوب گھومے۔ لندن میں تو کچھ رشتے دار اور دوست احباب رہتے ہیں ان سے ملنا ملانا رہا۔ وہاں اتنی کوئی خاص تفریح نہیں ہوئی البتہ روم اور پیرس ہم نے فرصت سے گھوما۔'' وہ اسے اپنے دورے کی تفصیل سنانے لگے تھے۔

''آپ تو اس سے پہلے بھی وہاں بہت مرتبہ گئے ہوئے ہوں گے۔'' وہ بڑے شوق سے دریافت کرنے لگی۔

''ہاں روم تیسری مرتبہ اور پیرس چھٹی مرتبہ گیا ہوں میں۔ سب سے پہلی دفعہ پیرس اپنی یونیورسٹی کے دنوں میں گیا تھا اور وہ شہر مجھے اتنا اچھا لگا تھا کہ شادی کے بعد ہنی مون کے لئے ہم اور صبیحہ پیرس ہی گئے تھے۔'' وہ کسی تصور میں کھوئے اسے بتا رہے تھے۔ اویس ان دونوں کو باتوں میں مگن دیکھ کر دوبارہ اخبار میں غرق ہو گیا تھا۔

''اخلاق میرے کمرے میں جو بلیک کلر کا شوپر رکھا ہے وہ لے کر آؤ۔'' انہوں نے اخلاق کو باآواز بلند آواز دی اور وہ سر ہلاتا کمرے کی طرف چلا گیا تو وہ اس سے کہنے لگے۔

''اخلاق بتا رہا تھا کہ تم روزانہ فون کر کے پوچھتی تھیں ہم لوگوں کے بارے میں۔''

''ہاں آپ نے اتنے دن جو لگا دیئے۔ ایک مہینے کا کہہ کر گئے تھے۔'' وہ ناراضی سے بولی۔

''اصل میں ارادہ تو خالی عمرہ کر کے واپس آ جانے کا تھا پھر میں نے سوچا کہ پندرہ دن کا ویزا مکمل استعمال کرنا چاہئے قسمت والے ہوتے ہیں وہ جنہیں اللہ اپنے در کی حاضری نصیب کرتا ہے۔ اس لئے پروگرام سے ہٹ کر یہ اضافی دن مکہ مدینہ میں گزر گئے۔'' اسی وقت اخلاق نے ایک بھاری بھرکم شوپر لا کر ان کے سامنے رکھا۔

''اجالا کے لئے لائم جوس اور میرے لئے ایک کپ گرما گرم کافی کا جلدی سے لے کر آؤ۔'' وہ بیگ میں

سے سامان نکالتے ہوئے اس سے بولے۔

"یہ پرفیومز میں نے تمہارے لئے پیرس سے خریدے ہیں اور یہ پینٹنگ بطور خاص تمہارے لئے وینس سے خریدی ہے۔ ہم لوگ دو دن کے لئے وینس بھی گئے تھے۔ میں نے سوچا کہ آرٹسٹ بندی ہے اس لئے کسی نادر و نایاب پینٹنگ سے بڑھ کر کوئی اور تحفہ کیا ہوگا اور یہ پین لندن سے خریدا تھا۔ اب پتہ نہیں یہ چیزیں تمہیں اچھی لگی بھی ہیں یا نہیں بہرحال۔ میں نے سوچا تم دوسری لڑکیوں کی طرح کاسمیٹکس اور جیولری تو زیادہ استعمال کرتی بھی نہیں ہو۔ اس لئے اس قسم کی کوئی چیز نہیں لی۔"

وہ اتنے زیادہ قیمتی تحائف قبول کرنے سے ہچکچا رہی تھی۔

"انکل آپ کا بہت شکریہ آپ نے مجھے یاد رکھا۔ لیکن یہ سب بہت زیادہ ہے۔ بس ایک آدھ چیز کافی تھی۔" وہ انہیں انکار کرنا بھی چاہ رہی تھی اور کرتے ہوئے ڈر بھی رہی تھی کہ وہ ناراض ہو جائیں گے۔

"اس کا مطلب ہے تمہیں یہ چیزیں پسند نہیں آئیں۔" وہ جان بوجھ کر اس کی بات کو غلط رنگ دینے لگے تو وہ بے اختیار بولی۔

"سب چیزیں بہت اچھی ہیں لیکن......"

"کوئی لیکن ویکن نہیں۔" وہ اس کی بات کاٹ کر خفگی بھرے انداز میں بولے۔

"میں تمہیں صرف بیٹی کہتا ہی نہیں سمجھتا بھی ہوں اور تم میرے ساتھ غیریت برت رہی ہو یہ اویس بھی تو ہے۔ تمہاری طرح اس کے لئے بھی میں نے پرفیومز خریدے بلکہ اس نے ضد کر کے مجھ سے پیسے بٹورے، تمہارے ہی جیسا پین اس کے لئے بھی لیا۔ اسے تو مجھ سے کوئی بھی چیز لیتے ہرگز تکلیف نہیں ہوئی تم کیا اس سے بھی بڑی ہو گئی ہو۔" ان کی ناراضی سے سہم کر وہ جلدی سے بولی۔

"آپ ناراض تو مت ہوں آئی ایم سوری۔"

"آئندہ اگر تم نے میرے ساتھ غیروں والی بات کی تو میں واقعی ناراض ہو جاؤں گا۔" اویس اس تمام بات چیت سے بے نیاز اخبار میں کھویا ہوا تھا۔ اخلاق نے ٹرے لا کر سامنے رکھی تو اس نے لائم جوس کا گلاس اٹھا لیا۔

"مدینہ میں ایک اتنا خوبصورت گولڈ کا بریسلٹ خریدتے خریدتے رک گیا۔ حالانکہ وہ تمہارے ہاتھ میں بہت اچھا لگتا۔ لیکن میں نے تمہیں کبھی جیولری پہنے ہوئے دیکھا ہی نہیں اس لئے سوچا کہ شاید تم پسند نہیں کرتیں۔" وہ کافی پیتے ہوئے بولے۔

"نہیں مجھے الجھن ہی ہوتی ہے۔ اگر کبھی کہیں آنے جانے کے لئے پہن بھی لوں تو سخت کوفت ہوتی ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے بہت سا وزن میرے اوپر لدا ہوا ہے۔ سانس گھٹنے لگتی ہے۔" وہ اپنے سادہ رہنے کی وجہ بتانے لگی تو وہ بے اختیار مسکرا دیئے۔

"اویس میں تم سے کہہ رہا تھا ناں اس کی ہر بات سیمین جیسی ہے۔ وہ بھی اسی کی طرح میک اپ اور زیورات سے بے زار رہا کرتی تھی۔" انہوں نے اویس کو مخاطب کیا تو وہ اخبار پر سے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھ کر مسکرا دیا اور وہ دوبارہ اپنی نظریں اس پزل کی طرف گاڑھ دیں جسے وہ حل کر رہا تھا۔ اس کی طرف سے اپنی بات کا کوئی جواب نہ پا کر



وہ کچھ بے مزہ سے ہوئے۔

"یہ لڑکا کبھی نہیں سدھرے گا۔" انہوں نے دل میں سوچا۔ اس کی طرف سے مایوس ہو کر وہ دوبارہ اجالا سے مخاطب ہوئے۔

"صبیحہ تو سخت چڑا کرتی تھی سیمین کی اس عادت سے۔ مگر وہ بھی ایک ہی تھی۔ اگر کبھی کہنے سننے پر کچھ پہن بھی لیا تو تھوڑی دیر بعد ہی سب اتار کر بیٹھی ہوئی ہوتی تھی۔ بالکل تمہاری طرح دھلے ہوئے منہ سے رہا کرتی تھی۔"

"انہیں تیار ہونے کی ضرورت بھی کیا تھی۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں سجا سنوار کر اور خوب تیار کر کے اس دنیا میں بھیجا تھا۔ ان مصنوعی سہاروں کی انہیں بالکل بھی حاجت نہیں تھی۔"

وہ سامنے دیوار پر لگی اس تصویر پر جس میں ایک بے حد حسین لڑکی ایک نہایت خوبرو مرد کے ساتھ کھڑی تھی نظریں جما کر کہا۔ ہر بار ان کے گھر آ کر اس تصویر کو دیکھ کر وہ یہی سوچا کرتی تھی کہ شاید ایسے ہی جوڑے کو چاند سورج سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ وہ دونوں حسن و خوبصورتی کا مجموعہ تھے۔ ایک دم پرفیکٹ کپل۔

"تمہارے سادگی سے رہنے کی بھی کیا یہی وجہ ہے۔" وہ شرارت سے مسکرا کر بولے تو وہ جھینپ کر رہ گئی۔

"میں اپنی بات تو نہیں کر رہی تھی۔ میں تو عادتاً ہی ایسی ہوں۔" وہ وضاحتی انداز میں بولی تو وہ کہنے لگے۔

"کیوں تمہارے خیال سے کیا تم خوبصورت نہیں ہو؟" انہوں نے ذرا سی بات کا ایشو بنا کر بحث کو طویل کر دیا تھا۔ وہ ایک نظر اویس پر ڈال کر جو ان لوگوں سے یکسر بے نیاز اور بیگانہ محسوس ہو رہا تھا بولی۔

"اللہ کا شکر ہے اس نے تمام چیزوں کے ساتھ بنایا ہے اور اللہ تعالیٰ سب لوگوں کو تو حسن کا مجسمہ بنا نہیں سکتے تھے۔ کچھ لوگوں کو تو میرے جیسا بھی ہونا تھا بڑا عام سا۔" اس کی بات پر وہ تاسف سے گردن ہلا کر بولے۔

"لڑکی تم خود انکساری سے کام لے رہی ہو تمہیں اندازہ ہی نہیں ہے اپنی خوبصورتی کا۔" ان کی بات پر وہ بے ساختہ مسکرا دی تھی۔

"آپ کو تو میں پیاری لگوں گی ہی۔" وہ ان کی بات کو انجوائے کرتے ہوئے بولی تھی۔

"کیوں تم خود کس کو پیاری لگنا چاہتی ہو؟ کون ہے وہ جس کے تعریف کرنے پر تمہیں اپنی خوبصورتی کا یقین آئے گا۔"

وہ بڑے صاف گو بلکہ کس حد تک منہ پھٹ بھی ہیں یہ بات وہ جانتی تھی لیکن اس حد تک ہوں گے یہ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ اس وقت ان کی اس بات پر اس کے چودہ طبق روشن ہو گئے تھے وہ کوئی جواب دینے کی پوزیشن ہی میں نہیں تھی۔

سامنے بیٹھے بندے نے اخبار ایک طرف رکھ دیا تھا اور اب بڑے غور سے اس کا سرخ پڑتا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ وہ اپنے قریبی لوگوں سے بھی بڑے لئے دیئے ریزروڈ سی رہا کرتی تھی۔ انکل سے اتنی جلدی اتنی بے تکلفی ایک بڑی انہونی اور اس کی فطرت کے خلاف بات ہوئی تھی۔ مگر اویس اور ان کے ساتھ بیٹھ کر اس درجہ بے تکلفانہ بات وہ نہیں کر سکتی تھی۔

اس گفتگو سے بچنے کو فوری طور پر اس کی سمجھ میں یہی آیا کہ کپ اور گلاس ٹرے میں رکھ کر واپس کچن میں رکھ

آئے اس خیال کے آتے ہی وہ جلدی سے ٹرے اٹھا کر کھڑی ہوگئی۔

"انکل آپ کے لئے کافی اور لاؤں؟" وہ جو ہونٹوں میں مسکراہٹ دبائے اسے شوخ نظروں سے دیکھ رہے تھے بے اختیار قہقہہ لگا کر ہنس پڑے تھے۔

"نہیں رہنے دو۔" اس کی حالت پر شاید انہیں ترس آ گیا تھا اس لئے قہقہہ مختصر کرتے ہوئے جواب دیا تھا اور وہ جلدی سے کچن کی طرف چلی گئی تھی۔ کچن میں آ کر دو گلاس ٹھنڈے پانی کے پی کر اس نے اپنے حواس بحال کئے اور پھر وہیں کھڑے ہو کر دو چار منٹ گزار دیئے۔ کچھ دیر بعد وہ لاؤنج میں واپس آئی تو خود کو کسی حد تک نارمل کر چکی تھی۔

"اچھا انکل میں چلتی ہوں۔" وہ وہیں کھڑے کھڑے ان سے بولی تو وہ ٹی وی سے نظریں ہٹا کر اسے دیکھتے ہوئے بولے۔

"اتنی جلدی کیا ہے۔ کھانا کھا کر جانا۔"

"نہیں مجھے گھر جا کر اپنے ہفتے بھر کے جمع شدہ بہت سے کام نمٹانے ہیں۔ اور ویسے بھی میں نے تو ناشتہ ہی اتنا لیٹ کیا تھا لنچ تو شاید ہی کروں۔"

"کوئی بہانہ نہیں چلے گا۔ بھوک نہیں ہے تو کوئی بات نہیں خالی ہمارا ساتھ دینے کے لئے بیٹھ جانا۔" وہ اس کے اعتراض کو کوئی اہمیت دینے کو تیار نہ تھے۔

"انکل دیر ہو جائے گی۔ سچ مجھے بہت کام ہے۔"

اویس شاید اخبار پڑھ چکا تھا اسی لئے اب فرصت سے بیٹھا ان دونوں کی گفتگو سن رہا تھا۔

"ویسے تو مجھے معلوم ہے کہ تم بہانے بازی کر رہی ہو لیکن پھر بھی مان لیتا ہوں کہ تمہیں جلدی ہے۔ لیکن کھانا تو تمہیں پھر بھی کھانا پڑے گا" اس سے کہتے انہوں نے شاہد کو آواز دے کر کھانا لگانے کے لئے کہا۔

"تمہاری خاطر آدھا گھنٹہ پہلے ہی لنچ کر لیتے ہیں۔" وہ ہتھیار ڈالنے والے انداز میں صوفے پر بیٹھ گئی۔

اویس اس کی بے بسی پر مسکرا کر رہ گیا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ ان دونوں کے ساتھ ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھی تھی۔ وہ اسے اصرار کر کے مختلف چیزیں پیش کرنے لگے تو وہ روٹھے ہوئے لہجے میں بولی۔

"آپ نے کہا تھا خالی ساتھ دینے کے لئے بیٹھ جانا۔" اس کی بات پر اویس بڑی سنجیدگی کے ساتھ پاپا جانی سے مخاطب ہوا۔

"یہ بالکل صحیح کہہ رہی ہیں آپ کو اپنے کہے لفظوں کا احترام کرنا چاہئے۔" اجالا نے چونک کر اس کی طرف دیکھا تو وہ بڑی سنجیدگی سے سلاد کھاتا پاپا جانی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ سمجھ نہیں پائی کہ وہ اس کا مذاق اڑا رہا تھا یا یونہی بول رہا تھا۔ اس نے اپنی پلیٹ میں تھوڑے سے چاول اور سلاد ڈال کر انکل کو خوش کرنے کی کوشش کی تھی۔ کھانا کھا کر وہ فوراً ہی گھر لوٹ آئی تھی۔

☆☆☆

انکل نے واپس آنے کے بعد دوبارہ پارک آنا شروع کر دیا تو اس نے بھی اپنی سابقہ روٹین بحال کر لی۔



اب وہ دونوں پھر پہلے کی طرح روزانہ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ واک کرتے اور دنیا جہاں کے موضوعات پر دل کھول کر اظہار خیال کیا جاتا۔ اسے ان کے گھر گئے ایک مہینہ ہو گیا تھا۔ جب انکل سے پارک میں ملاقات ہو جاتی تھی تو پھر گھر جانے کا کوئی جواز ہی نہ تھا۔ وہ خود چار مرتبہ اسے گھر بلا چکے تھے لیکن وہ گئی نہ تھی۔

اس روز وہ اور انکل پارک سے نکل کر باتیں کرتے ہوئے فٹ پاتھ پر چل رہے تھے۔ اسی وقت ایک گاڑی ان کے پاس آ کر رکی تھی۔ دونوں ہی نے چونک کر دیکھا تھا۔ اپنی طرف کا شیشہ نیچے کرتے اویس ان لوگوں سے مخاطب تھا۔

"کہاں جانا ہے آپ لوگوں کو؟ آیئے میں ڈراپ کر دوں۔" اس کے شرارتی انداز پر وہ بے اختیار مسکرا دی جبکہ انکل بڑی شان بے نیازی سے کہنے لگے۔

"ہم ہرا یرے غیرے سے لفٹ نہیں لیا کرتے۔ جاؤ میاں اپنا راستہ ناپو۔" ان کی بات کو اس نے خوب انجوائے کیا پھر اس سے بولا۔

"آپ کی بھی یہی رائے ہے!" وہ اسے اپنی جانب متوجہ پا کر بے اختیار نفی میں سر ہلا گئی۔

"آپ آج کل ہیں کہاں؟ نظر نہیں آ رہیں۔" اس نے سوال کیا۔

"یہیں ہوں مجھے کہاں جانا ہے۔ انکل سے تو روز ملاقات ہوتی ہے۔" اس نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ انکل گاڑی کی طرف بڑھتے ہوئے اس سے بولے۔

"اجالا اب یہ اتنا اصرار کر رہا ہے تو میرا خیال ہے بیٹھ جانا چاہئے۔ آ جاؤ شاباش۔" وہ اس کے برابر کی نشست سنبھالتے ہوئے اس کے لئے پیچھے کا دروازہ کھول گئے تو اسے بھی گاڑی میں بیٹھنا پڑا۔

"چلو اس بہانے آج اجالا کا گھر بھی دیکھ لیں گے۔ اس بے مروت لڑکی نے تو کبھی اپنے گھر نہیں بلایا۔" گاڑی اس کے گھر جانے والی سڑک پر مڑی تو انکل بولے۔ ان کی بات پر وہ کچھ پریشان سی ہو گئی۔ اپنے گھر کا تصور اس کے لئے اتنا بھیانک تھا کہ وہ خود وہاں بمشکل جایا کرتی تھی اب انہیں لازمی اندر چلنے کی آفر کرنی پڑے گی وہ کچھ بے چین سی ہو گئی۔ گاڑی اس جہنم کے سامنے رکی جسے اس کا گھر ہونے کا اعزاز حاصل تھا وہ بڑی بددلی سے گاڑی سے اترتے ہوئے بولی۔

"آیئے انکل اندر چلئے۔" انداز ایسا تھا جیسے مجبوراً بلا رہی ہو اور وہ جنہیں چہرہ شناسی کا دعویٰ تھا کیسے اس کا چہرہ نہ پڑھ پاتے۔

"پھر کسی وقت آئیں گے انشاءاللہ خدا حافظ۔" انہوں نے پُرشفقت انداز میں مسکرا کر معذرت کی تو اویس نے گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ ان لوگوں کو خدا حافظ کہتی وہ گیٹ میں گھس گئی۔

☆☆☆

وہ اسٹڈی میں بیٹھے اویس سے اپنے آرٹیکلز کمپیوٹر پر ٹائپ کرا رہے تھے۔ وہ تیز رفتاری سے کی بورڈ پر انگلیاں چلا رہا تھا جبکہ وہ کچھ فاصلے پر راکنگ چیئر پر بیٹھے اسے ٹائپ کرتا دیکھنے کے ساتھ مختلف مشوروں سے نواز رہے تھے۔ جہاں کچھ ترمیم کرنی ہوتی تو وہیں بیٹھے بیٹھے کروا دیتے۔ ان دنوں وہ اپنی کتاب کو منظر عام پر لانے کے لئے کام

میں مصروف تھے اور فارغ وقت میں اولیس ان کا بھرپور ساتھ دیا کرتا تھا۔ کوریڈور سے آتی اجالا کی آواز کو ان دونوں ہی نے تعجب کے ساتھ سنا تھا وہ شاید اخلاق سے پوچھ رہی تھی۔

''انکل کہاں ہیں؟'' انہوں نے بے ساختہ وال کلاک کی طرف دیکھا تھا رات کے دس بجے اس کا آنا خاصا تعجب خیز تھا۔ وہ زیادہ تر دن میں یا بہت سے بہت ہوا تو شام میں آیا کرتی تھی۔ اتنے دنوں سے تو وہ ان کے گھر آ بھی نہیں رہی تھی اتنے دنوں بعد آنا وہ بھی رات کے وقت وہ اس کی آمد کی وجہ سوچنے لگے انہیں خیال آیا کہ وہ آج شام پارک بھی نہیں آئی تھی۔ اولیس ان کی فکر و پریشانی سے لاتعلق ٹائپنگ میں مصروف تھا۔ اسی وقت وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی۔

''بیٹا اتنی رات کو آئی ہو سب خیر تو ہے۔'' اسے اندر آتا دیکھ کر سب سے پہلے یہی جملہ ان کے منہ سے نکلا۔ وہ ان کے سوال کا کوئی جواب دیئے بغیر تیزی سے ان کی طرف آئی اور کارپٹ پر ان کے بالکل سامنے بیٹھتے ہوئے ان کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر بولی۔

''میں آپ سے ایک بات پوچھنے آئی ہوں۔'' اتنی تہذیب یافتہ اور شائستہ لڑکی سے وہ یہ توقع کبھی بھی نہیں رکھتے تھے کہ وہ بغیر سلام کئے آتے ہی عجیب لایعنی باتیں شروع کر دے گی۔ انہوں نے غور سے اس کی طرف دیکھا تو وہ انہیں بہت بدلی ہوئی محسوس ہوئی۔ اس کی آنکھوں سے جھانکتی وحشت اور دیوانگی انہیں درحقیقت خوفزدہ کر گئی۔ اولیس کی بورڈ اور مونیٹر سے نظریں ہٹائے اسے ہی دیکھنے لگا تھا مگر وہ اس کی موجودگی سے بے نیاز ان کے گھٹنوں پر اپنے ہاتھوں کی گرفت سخت کرتے ہوئے بولی۔

''آپ مجھ سے محبت کرتے ہیں؟'' انہیں وہ اس وقت کوئی نفسیاتی مریضہ محسوس ہو رہی تھی اس کی حالت انہیں تشویش میں مبتلا کرنے لگی تو وہ اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولے۔

''اجالا کیا بات ہے بیٹا۔ کیا ہو گیا ہے تمہیں۔''

''آپ مجھ سے محبت کرتے ہیں یا نہیں۔'' وہ ان کا سوال نظر انداز کر کے اپنی بات دہرانے لگی تو وہ اس کی ناسمجھ میں آنے والی کیفیت پر پریشان سے ہو کر اولیس کو دیکھنے لگے اس نے آنکھوں آنکھوں میں اشارہ کیا کہ اس کی بات کا جواب دیں۔

''یہ بھی کوئی پوچھنے والی بات ہے۔ ظاہر ہے میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں۔''

''جھوٹ بولتے ہیں آپ۔'' وہ اپنے سر پر رکھا ان کا ہاتھ جھٹک کر بولی۔

''اگر مجھ سے محبت کرتے ہوتے تو میرے بارے میں پوچھتے میں کون ہوں میرے گھر والے کون ہیں اور میں گھر سے بے زار ماری ماری کیوں پھرتی ہوں۔'' وہ ہذیانی انداز میں چیخ کر بولی تھی۔

''نہیں میری جان میں تم سے بہت پیار کرتا ہوں۔ میں تو صرف یہ چاہتا تھا کہ تم خود سے میرے اوپر بھروسہ کر کے مجھے اپنے بارے میں سب کچھ بتاؤ۔'' وہ نرم لہجے میں بولے۔ جس اجالا کو وہ جانتے تھے وہ اس لڑکی سے بہت مختلف تھی جو اس وقت ان کے روبرو تھی اور ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کے ساتھ کس طرح بی ہیو کریں۔

''ابھی جب میں گھر سے گاڑی لے کر نکلی تو میرا دل چاہا کہ سامنے سے آتے ٹرک سے گاڑی ٹکرا دوں میں



ایسا کرنے بھی والی تھی پھر اسی وقت مجھے خیال آیا کہ میرے مرنے پر تو کوئی رونے والا بھی نہیں ہوگا۔ میں نے سوچا آپ سے پوچھ لوں کہ آپ مجھ سے محبت کرتے ہیں یا نہیں شکر ہے اب میرے مرنے پر کوئی تو اداس ہوگا۔ پہلے میں سوچا کرتی تھی کہ آخر لوگ خودکشی کیسے کر لیتے ہیں۔ خود اپنے ہاتھوں اپنی زندگی ختم کر لینا کتنا مشکل کام ہے لیکن یہ کوئی اتنا ناممکن کام بھی نہیں ہے۔ آپ میرے مرنے کے بعد بھی مجھے یاد رکھیں گے ناں۔''

وہ اس وقت قطعاً اپنے حواسوں میں نہیں تھی۔ وہ اس کی باتوں پر دہل کر رہ گئے تھے۔

''اجالا ایسے نہیں کہتے بیٹا۔ مجھے بتاؤ ہوا کیا ہے۔ کسی نے کچھ کہا ہے گھر والوں سے کوئی ناراضگی ہوگئی ہے۔ شاباش مجھے بتاؤ۔'' وہ اسے بچوں کی طرح بہلانے کی کوشش کرنے لگے۔ اپنے ہاتھوں سے اس کے چہرے پر بکھری لٹوں کو سنوارتے ہوئے اسے نارمل کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ اچانک ان کے گھٹنوں پر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی تھی۔

''مجھ سے کوئی پیار نہیں کرتا۔ کسی کو میری ضرورت نہیں۔ میں ان وانٹڈ ہوں اور وہ ماریہ کہہ رہی تھی کہ میری بددعاؤں کی وجہ سے اس کا بچہ مر گیا ہے، میں اس سے جیلس ہوتی ہوں۔ اسے خوش دیکھ کر جلتی رہتی ہوں اور میری وجہ سے اس کی زندگی جہنم بنی ہوئی ہے۔''

وہ بلک بلک کر رو رہی تھی۔ اولیس ایک دم اٹھ کر اس کی طرف آیا تھا۔ وہ اس بات سے ڈر رہا تھا کہ کہیں پاپا جانی کی اپنی حالت اس کے رونے کی وجہ سے خراب نہ ہو جائے۔ یہ لڑکی جس سے وہ بہت پیار کرتے تھے۔ اس کا رونا آخر کیسے برداشت کر سکتے تھے۔ ان کے گھٹنوں پر رکھا اس کا سر اس نے آرام سے اٹھایا تو وہ دھندلی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

پاپا جانی تو چپ سادھے بیٹھے ہوئے بس ایک ٹک اسے دیکھے جا رہے تھے۔ اس کا تو شاید ذہن اور شعوری نظام مکمل طور پر مفلوج ہو گیا تھا اس لئے اسے دیکھ کر بھی نہیں چونکی اور ان سے کہنے لگی۔

''اور وہ سعود آرام سے کھڑا اس کی ساری باتیں سنتا رہا تھا پھر جب میں گاڑی کی چابی لے کر باہر نکلی اس نے مجھے روکا بھی نہیں۔ ہاں ہوتی ہوں میں جیلس۔ مجھ سے کسی کی خوشی برداشت نہیں ہوتی۔ جب میں خوش نہیں ہوں تو کسی اور کو کیا حق پہنچتا ہے خوش ہونے کا۔ میرا دل چاہتا ہے سارے لوگوں سے ان کی خوشیاں چھین لوں میں روؤں تو سب روئیں ہاں میں نے مارا ہے اس کے بچے کو۔'' وہ پھر چیخ چیخ کر رونے لگی تھی۔

''اجالا اس ہوش میں آؤ۔'' اولیس نے اسے جھنجھوڑا۔

''دیکھو تمہاری وجہ سے پاپا جانی کی طبیعت خراب ہو جائے گی۔ اپنا نہیں تو ان کا خیال کرو۔'' اس کی بات پر وہ بے اختیار اس کے سینے پر سر رکھ کر زار و قطار رونے لگی تو وہ بری طرح بوکھلا گیا۔ دو تین منٹ بعد اس نے محسوس کیا کہ رونے کی آواز بند ہو گئی ہے ڈرتے ڈرتے اپنے سینے پر رکھا اس کا سر اٹھایا۔ تو اس کا بے ہوش وجود اس کے ہاتھوں میں جھول کر رہ گیا۔

''اولیس ڈاکٹر کو فون کرو۔ پتہ نہیں اسے کیا ہو گیا ہے۔'' پاپا جانی اسے بے ہوش دیکھ کر سراسیمگی سے بولے۔

''پاپا جانی آپ پریشان نہ ہوں۔ اسے کچھ نہیں ہوا ہے۔'' وہ ان کے پریشان چہرے پر نظر ڈال کر

تسلی دینے لگا۔

''کیسے پریشان نہ ہوں۔ میری بچی ایسے حالوں میں پہنچ جائے اور میں آرام سے رہوں۔'' وہ اپنا غصہ اور پریشانی اس پر نکالنے لگے۔

''ہاتھ پاؤں چھوڑ دینے اور پریشان ہونے سے آج تک تو کوئی مسئلہ حل نہیں ہوا۔'' وہ کچھ ناراضی بھرے لہجے میں کہتا اسے سنبھال کر اور سہارا دے کر کھڑا ہوا۔ اس کے بے ہوش جسم کا سارا بوجھ اس کے کندھوں پر تھا۔ آہستہ قدموں سے چلتا اسے لے کر وہ پاپا جانی کے بیڈ روم میں آ گیا اور بڑے آرام سے احتیاط سے اسے بیڈ پر لٹا دیا۔ اس کے پیچھے وہ بھی کمرے میں داخل ہو گئے تھے اور بیڈ پر اجالا کے برابر میں بیٹھتے ہوئے انہوں نے دو تین سورتیں پڑھ کر اس کے اوپر پھونکی تھیں۔ اویس اس کے چہرے پر پانی کے چھینٹے ڈالتا ہوا اسے آوازیں دے کر بھی اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ دس پندرہ منٹ کی جدوجہد کے بعد بھی جب وہ ہوش میں نہ آئی تو اس نے ایک آخری کوشش کے طور پر اس کے اوپر جھک کر اسے آواز دی۔

''اجالا۔ اٹھو۔'' وہ اب ڈاکٹر کو فون کرنے ہی والا تھا کہ اس کے وجود میں حرکت محسوس کر کے رک گیا۔

اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے کہیں بہت دور سے کوئی اسے آواز دے کر بلا رہا ہے۔ یہ آواز کس کی ہے وہ پہچان نہیں پا رہی تھی۔ بڑی مشکلوں سے اس نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھولیں تو وہاں موجود دونوں ہی افراد نے شکر ادا کیا۔ اپنے بالکل قریب جھک کر کھڑے ہوئے اویس کو دیکھ کر وہ ایک دم اپنے حواسوں میں واپس آ گئی ایک نظر خود پر اور ایک اپنے برابر بیٹھے انکل پر ڈال کر اٹھ بیٹھی۔

دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کو تھامے وہ اپنی کچھ دیر پہلے کی دیوانگی پر شرمسار بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ دونوں اس سے کچھ بھی کہے بغیر خاموشی سے دیکھ رہے تھے۔ ہوش و خرد سے بیگانگی کے عالم میں میں وہ جو کچھ کر گزری تھی وہ اسے اچھی طرح یاد تھا۔ وہ ساری زندگی کبھی کسی کے سامنے نہ کھلی تھی اپنے خول میں بند لوگوں سے دور دور رہی تھی۔ لوگوں کے لئے وہ ہمیشہ ایک بند کتاب کی طرح رہی تھی۔ کیا ہو جاتا جو وہ آج یہاں نہ آتی۔ اس سے تو بہتر تھا کہ وہ گاڑی واقعی کہیں ٹکرا دیتی۔ یوں خود کو بے نقاب کر کے وہ اپنی ہی نظروں میں گر گئی تھی۔ کس حساب میں وہ ان لوگوں کو پریشان کرنے چلی آئی تھی۔ اس کا دل چاہا کہ وہ کہیں غائب ہو جائے ان لوگوں کی نظروں سے چھپ جائے جو پتہ نہیں اس کے بارے میں کیا سوچ رہے ہوں گے۔

''بیٹا دودھ پیو گی؟'' اس نے اپنے برابر بیٹھے انکل کی آواز سنی۔ اس میں اتنی ہمت بھی نہیں تھی کہ انکار میں گردن ہلا سکے۔

''اویس شاہد سے کہو ایک گلاس دودھ لائے۔'' انہوں نے اویس سے کہا تو وہ دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

''میں گھر جاؤں گی۔'' وہ ان دونوں سے نظریں چرائے سر جھکا کر بولی تھی۔ وہ اب مزید ایک لمحہ بھی ان لوگوں کا سامنا نہیں کر سکتی تھی۔ وہ شاید اپنی محبت سے مجبور ہو کر کچھ کہنے والے تھے کہ اویس فوراً ہی واپس اس کی طرف آتا ہوا بولا۔



''چلیں پاپا جانی اجالا کو گھر چھوڑ آتے ہیں۔'' وہ اس حالت میں اسے واپس بھیجنے کے لئے کسی قیمت پر راضی نہیں تھے لیکن اویس آنکھوں میں اصرار لئے کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر درج تاثرات ان سے پکار پکار کر کہہ رہے تھے کہ ابھی اس سے کچھ مت پوچھیں وہ بڑی بے چارگی کے عالم میں بیڈ پر سے اٹھے اور اس سے بولے۔

''چلو تمہیں گھر چھوڑ دیں۔'' وہ اپنے وجود کو بمشکل گھسیٹتی بستر پر سے اتر آئی۔ کھڑے ہوتے ہی اسے پورا کمرہ گھومتا ہوا محسوس ہوا وہ لہرا کر بستر پر گرنے ہی والی تھی جب دائیں طرف سے کھڑے اویس نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے گرنے سے بچایا تھا۔ اس نے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی لیکن اس کے ہاتھوں کی مضبوط گرفت کے آگے اس کی مزاحمت بیکار ثابت ہوئی۔ وہ اسی طرح اس کا ہاتھ پکڑے ہوئے کمرے سے نکل گیا۔ انکل ان دونوں کے پیچھے چلتے کسی سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ گاڑی کا دروازہ کھول کر اویس نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا تو وہ چپ چاپ بیٹھ گئی۔ اویس نے ہاتھ بڑھا کر دروازہ بند کیا اور ڈرائیونگ سیٹ کی طرف بڑھ گیا۔ انکل اس کے برابر والی سیٹ پر براجمان خود کو ایک دم بہت بوڑھا محسوس کرنے لگے تھے۔ وہ کیا کرنے والی تھی یہ تو وہ جان چکے تھے لیکن اب یہاں سے جا کر وہ کیا کرے گی یہ سوچ انہیں شدید پریشان کر رہی تھی۔ گاڑی اسٹارٹ ہو گئی تھی اور اس میں بیٹھے تینوں ہی افراد کسی نہ کسی فکر میں غلطاں تھے۔

''میں آج کے بعد کبھی ان لوگوں سے نہیں ملوں گی۔ کبھی ان کے گھر نہیں آؤں گی۔'' وہ اپنے دل میں مصمم ارادہ کر رہی تھی۔

''لیکن آج کے بعد میں ہوں گی تو کہیں جاؤں گی۔ بس اب اس زندگی کی قید سے چھٹکارا پا لوں گی پھر جس کا جو دل چاہے میرے بارے میں سوچتا رہے۔''

کچھ دیر پہلے جو ایک شرمندگی سی محسوس ہونے لگی تھی وہ ایک دم زائل ہو گئی اور وہ ہلکی پھلکی ہو کر بیٹھ گئی۔ گاڑی اس کے گیٹ کے سامنے رکی تو وہاں کا پرسکون سا ماحول دیکھ کر اس کے لبوں پر استہزائیہ مسکراہٹ بکھر گئی۔ کسی کو کیا پروا کہ وہ کہاں گئی تھی۔ اگر مر نے بھی گئی تھی تو کسی کے پاس اتنا وقت نہیں تھا بیٹھ کر اس کا سوگ مناتا یا اسے ڈھونڈنے کی کوشش کرتا۔ خاموشی سے گاڑی سے اتر گئی اور بغیر ان لوگوں کی طرف دیکھے گیٹ کی طرف بڑھنے لگی۔

''اجالا ایک منٹ رکو۔'' اپنے پیچھے انکل کی آواز سن کر وہ رک گئی۔ گردن موڑ کر پیچھے دیکھا تو وہ گاڑی سے اتر کر اس کے پاس آ رہے تھے۔

''جو سوال تم نے مجھ سے کیا تھا وہی میں تم سے کر رہا ہوں کہ کیا تمہیں مجھ سے محبت ہے؟'' وہ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں پکڑ کر بولے۔ وہ بہت بدتمیزی کے ساتھ انکار کر کے ان کا دل توڑ دینا چاہتی تھی۔ کیا فرق پڑتا تھا جہاں اتنے بہت سے افراد اسے برا سمجھتے تھے اگر ان میں وہ بھی شامل ہو جائیں۔ اس کی صحت پر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا لیکن اپنی سوچ کے برخلاف وہ اثبات میں سر ہلا گئی۔

''پھر میں تمہیں اس محبت کی قسم دے کر کہہ رہا ہوں تم خود کو ہرگز بھی کوئی نقصان نہیں پہنچاؤ گی۔ اجالا میری جان میں اپنوں کو روتے روتے تھک چکا ہوں اب مجھ میں کوئی دکھ، کوئی صدمہ جھیلنے کی ہمت نہیں بچی۔ اس عمر میں مجھے کوئی دکھ نہ دینا۔''

ان کی آنکھوں میں چمکتے آنسو اسے عجیب سے دکھ میں مبتلا کر گئے۔ اولیس گاڑی میں بیٹھا ان دونوں کی باتیں سن رہا تھا۔

"صرف میری خاطر تمہیں زندہ رہنا ہے۔ مجھ سے وعدہ کرو تم کوئی غلط حرکت نہیں کرو گی۔" ان کی محبت اس کے اندر کی سوئی ہوئی اس اجالا کو جگا رہی تھی جو محبتوں کی متلاشی تھی۔ جو یہ چاہتی تھی کہ کوئی تو ہو جو اسے پیار کرے بے حد اور بے حساب۔ جس کے لئے وہ بہت خاص ہو۔ جس کے لئے اس کا ہونا بہت اہمیت رکھتا ہو اور اب وہ ہستی اس کے سامنے کھڑی تھی جس سے اس کا کوئی خونی رشتہ نہیں تھا۔ لیکن خونی رشتوں سے بڑھ کر وہ اسے چاہ رہے تھے۔ وہ کیسے انہیں مایوس کر سکتی تھی۔ بے اختیار اس نے گردن ہلا کر ان سے وعدہ کر لیا تو وہ مطمئن ہو کر گاڑی کی طرف بڑھ گئے۔ جب تک وہ اندر داخل نہیں ہو گئی وہ لوگ وہیں موجود رہے تھے۔

☆☆☆

"میں اپنے ماں باپ کی ان چاہی اولاد ہوں ایک ایسی اولاد جسے اس کے والدین نظر انداز کر دیں جس گھر میں میں نے آنکھ کھولی وہاں کسی کو میری ضرورت نہ تھی۔ میرا وجود وہاں کے مکینوں کے لئے باعث زحمت تھا۔ میرے ڈیڈی ایک پڑھے لکھے اور کلچرڈ انسان تھے۔ لیکن صرف دنیا والوں کے لئے بظاہر یہ کلچرڈ اور مہذب انسان اندر سے وہی روایتی مرد تھا جو عورت کا استحصال کر کے اس پر ظلم کر کے اپنی انا کی تسکین کرتا ہے۔ انہیں دنیا میں اگر کسی سے محبت تھی تو ان کی ماں تھیں۔ ہماری دادی جو پوتے کھلانے کی آرزو میں دن گن گن کر گزار رہی تھیں اپنے اکلوتے بیٹے کا ولی عہد دیکھنا ان کا اولین اور دیرینہ خواب تھا۔ لیکن خدا کی خدائی کے سامنے ان کا کچھ زور نہ چلا تھا اور میرے ڈیڈی کے ہاں پہلی اولاد بیٹی پیدا ہوئی تھی۔ دادی بہت ناراض ہوئی تھیں لیکن ڈیڈی نے انہیں سمجھا بجھا کر منا لیا تھا کہ اگلی بار ضرور ان کے ہاں بیٹا پیدا ہوگا۔ لیکن خدا کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

صبا آپی کے بعد حنا بجو کی پیدائش نے دادی کے ساتھ ساتھ ڈیڈی کو بھی آگ بگولہ کر دیا۔ ان دونوں نے مل کر ممی پر زندگی تنگ کر دی۔ انہیں ہر طرح کی اذیت دی گئی طعنے اور دھمکیاں دی گئیں۔ ڈیڈی کو اپنی دونوں بیٹیوں سے نفرت سی ہو گئی تھی۔ وہ گھر آتے تو بیوی اور بیٹیوں کو برا بھلا کہتے اپنے کمرے میں بند ہو جاتے۔ میری ممی تیسری بار پریگننٹ ہوئیں تو بہت ڈری ہوئی تھیں ان کے اس گھر میں رہنے کا دارومدار اب صرف آنے والے ننھے مہمان پر تھا۔ بیٹی ہونے کی صورت میں انہیں اس گھر سے نکال دیا جانا تھا۔ ڈیڈی چیخ چیخ کر بے شمار مرتبہ انہیں طلاق دے دینے کی دھمکی دے چکے تھے۔ خدا کو بھی شاید ممی کی بے بسی پر ترس آ گیا تھا۔ اس لئے اس بار وہ اپنے شوہر اور ساس کے سامنے سرخرو ہو گئی تھیں۔ ممی نے اس بار جڑواں بچوں کو جنم دیا تھا۔ میں اور میرا بھائی سعود جو مجھ سے تین منٹ چھوٹا تھا۔

میں پیدائشی طور پر بڑی صحت مند اور ہٹی کٹی تھی اور سعود بڑا کمزور مریل اور بیمار سا بچہ ڈاکٹروں نے اس کی حالت دیکھتے ہوئے اس کی زندگی کی طرف سے مایوسی کا اظہار کر دیا تھا۔ تمام گھر والے ہر قیمت پر اس بچے کی جان بچانا چاہتے تھے۔ میری ممی کو اپنا گھر بچانا تھا۔ اس لئے، ڈیڈی کو دادی کو خوش کرنا تھا اس لئے اور دادی کو بیٹے کا وارث دیکھنا تھا اس لئے سب کے پاس اسے توجہ دینے کی معقول وجہ موجود تھی۔

ایسے میں کسی کو بھی اس بچی کا خیال نہ آیا جو ماں کی آغوش سے محروم آیا کے رحم و کرم پر گھر میں تنہا پڑی رہتی تھی۔



ایک مہینہ ہاسپٹل رہ کر جب سعود ڈاکٹروں کی پیشین گوئی کے باوجود صحت یاب ہو کر گھر آ گیا تو گھر میں گویا خوشیوں کا سیلاب اُمنڈ آیا۔ وہ سب ہی کا چہیتا اور لاڈلا تھا۔ لیکن ممی اور دادی کا بالخصوص۔ ممی تو اسے ایک لمحے کو بھی اپنی نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے دیتی تھیں۔ وہ ان کے لئے خوشیوں کا پیغام لے کر آیا تھا اس نے انہیں طلاق جیسے منحوس داغ سے بچا لیا تھا تو وہ کیوں نہ اسے چاہتیں۔ ممی کے پاس میرے لئے کوئی وقت نہ تھا۔ انہیں تو شاید یہ بھی بھول گیا تھا کہ سعود کے ساتھ ساتھ انہوں نے ایک بیٹی کو بھی جنم دیا تھا جس کا انہوں نے ابھی تک نام بھی نہیں رکھا۔

میری پیدائش کے دو ماہ بعد میری نانی کوئٹہ سے آئیں تو انہوں نے ہی میرا نام رکھا "اجالا شہریار" میرا نام تو خود میرے لئے ایک لطیفہ ہے۔ جس کی اپنی زندگی اندھیروں میں ڈوبی ہوئی ہو وہ اجالا کیسے ہو سکتی ہے۔ نانی نے ممی کو ان کی لاپروائی پر سخت سست سنائیں کہ ان کے غفلت کے نتیجے میں بچی بے یار و مددگار آیا کے رحم و کرم پر پڑی ہے اور جسے گھر والوں کی بے توجہی محسوس کر کے آیا بھی اکثر بھول جاتی ہے۔ کئی دفعہ وہ بچی بھوک سے نڈھال ہو کر بلک بلک روتی خود ہی چپ ہو کر سو جاتی ہے اور آیا اس کا دودھ بنانا بھول جاتی ہے۔ ممی نے واضح طور پر اپنی بیزاری کا اظہار کیا اور کہا کہ انہیں اب مزید اولاد کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ پتہ نہیں سعود کے ساتھ یہ بھی کیوں پیدا ہو گئی۔ ممی اور ڈیڈی دونوں ہی نے مجھے نظر انداز کر دیا تو نانی مجھے اپنے ساتھ کوئٹہ لے گئیں۔ نانی وہاں میرے ماموں کے گھر میں رہتی تھیں۔ جسے اس کے ماں باپ نہ چاہیں اس سے کوئی اور کیا پیار کرے گا سو ماموں ممانی کا رویہ کوئی خاص اچھا نہ تھا۔ وہ محض نانی کی مروت میں میری اپنے گھر آمد کو قبول کر گئے تھے۔

ڈیڈی ہر مہینے ایک خطیر رقم میرے اکاؤنٹ میں جمع کروا دیا کرتے تھے اور ممی کسی آتے جاتے بندے کے ہاتھ کپڑے اور کھلونے بھیج کر اپنی محبت کا اظہار کر دیا کرتی تھیں۔ نانی نے وہیں سول میں میرا ایڈمیشن کروا دیا وہ مجھے بہت چاہتی تھیں۔ میرا بہت خیال رکھتی تھیں انہیں بیٹی کی نالائقی اور لاپروائی پر بھی بہت غصہ تھا۔ وقت گزرتا رہا میں آٹھ سال کی ہو گئی۔ اس دوران ممی ڈیڈی کے ہاں ان کے نہ چاہنے کے باوجود بھی دعا پیدا ہو گئی تھی۔ وہ مجھ سے پانچ سال چھوٹی تھی۔ وہ ہو بہو دادی کی کاپی تھی۔ اسی لئے دادی اسے بہت پیار کرتی تھیں۔ اس کے پیدا ہونے کے کچھ ماہ بعد ہی دادی کا انتقال ہو گیا تھا۔

میری آٹھویں سالگرہ کے ٹھیک ایک ہفتے بعد نانی ایک رات ایسی سوئیں کہ پھر اٹھی ہی نہیں۔ مجھ سے محبت کرنے والی واحد ہستی اس دنیا سے رخصت ہو چکی تھی اور میں اکیلی رہ گئی تھی۔ کوئی پرائی اولاد کو کیوں اپنے پاس رکھتا سو ماموں نے مجھے واپس کراچی بھجوا دیا۔ میری واپسی میرے گھر والوں کے لئے صرف اتنی اہمیت رکھتی تھی کہ مجھے ائیر پورٹ پر ریسیو کرنے کے لئے ڈرائیور کو بھیج دیا گیا تھا۔ میری واپسی سے گھر والوں کو کوئی خوشی نہیں ہوئی تھی۔ میں ممی کے گلے لگنا چاہتی تھی ان کی خوشبو محسوس کرنا چاہتی تھی مگر انہوں نے دور سے میرے سلام کا جواب دے کر میری خیریت پوچھی تھی۔ میں جھجک کر رک گئی تھی۔ ڈیڈی اور بہن بھائیوں کا رویہ بھی میرے ساتھ بڑا لیا دیا سا تھا۔ جیسے میں کوئی آؤٹ سائیڈر تھی جو اچانک ان کے گھر آ کر رہنے لگی تھی۔

پتہ نہیں مجھے اپنے ساتھ لے جا کر نانی نے اچھا کیا تھا یا برا اس بات کا فیصلہ میں آج تک نہیں کر سکی۔ اگر وہ

مجھے ساتھ نہ لے جاتیں تو ہوسکتا تھا میری بھی اس گھر میں کوئی جگہ نکل آتی۔ وہ سب اتنے سالوں سے ایک ساتھ رہ رہے تھے وہ سب ایک تھے اور میں بالکل الگ۔ میرے ماں باپ اور بہن بھائی کسی کو میری ضرورت نہ تھی۔ دادی کی وفات کے بعد اب گھر میں ممی کا رعب تھا وہ اب کوئی ڈری سہمی سی عورت نہ تھیں ان کا بیٹا ان کی طاقت تھا۔ وہ سعود سے بے تحاشا محبت کرتی تھیں اس کے آگے ڈیڈی اور ہم بہنوں کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ اگر سعود ان سے کہتا کہ آپ میری خاطر سمندر میں چھلانگ لگا دیں یا آگ میں کود جائیں وہ ایسا کر گزرتیں۔ وہ اس کی محبت میں سب کچھ کر سکتی تھیں اور ڈیڈی اب صرف ایک بزنس مین تھے۔ ہزار کو لاکھ کیسے بنانا ہے اور لاکھ کو کروڑ ان کی سوچ بس یہیں تک محدود تھی۔ انہیں گھر اور بچوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ یہاں تک کہ سعود جس کی خاطر وہ ممی کو طلاق دیتے دیتے رہ گئے تھے انہیں اس سے بھی کوئی دلچسپی نہ تھی۔ ہاں البتہ دعا سے وہ باقیوں کی نسبت پیار کیا کرتے تھے۔ شاید اس لئے کہ وہ دادی جیسی تھی۔

میں گھر والوں میں شامل ہونا چاہتی تھی۔ میں اپنے آپ کو اس گھر کا ایک حصہ بنانا چاہتی تھی اس لئے میں نے سب کا بہت خیال رکھنا شروع کر دیا۔ ڈیڈی کافی کے شوقین تھے میں رات کو سونے سے پہلے اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے کافی بنا کر ان کے لئے لے جایا کرتی تو وہ بغیر کچھ کہے کپ میرے ہاتھ سے لے لیتے تھے۔ ہر بار میں سوچتی کہ آج ضرور ڈیڈی مجھے پیار کریں گے اور کہیں گے میری بیٹی کتنی اچھی ہے اپنے ڈیڈی کا کتنا خیال رکھتی ہے مگر میری یہ خواہش کبھی پوری نہ ہوئی۔

ممی کی محبت حاصل کرنے کے لئے میں نے سعود کا بہت زیادہ خیال رکھنا شروع کر دیا۔ مجھے پتہ تھا سعود میں ان کی جان ہے اور ان کی جان مجھے بہت پیاری تھی۔ میں اپنی ساری پاکٹ منی اور بہت سی چیزیں اسے دے دیا کرتی۔ اس کے جرنل پر ڈائی گرام بنا دیا کرتی کہ وہ مجھ سے خوش ہوگا تو ممی خود بخود خوش ہو جائیں گی۔ اپنی بہنوں کا ہر کام نوکروں سے بھی پہلے دوڑ دوڑ کر کر دیتی کہ وہ مجھ سے باتیں کریں میں ان میں گھل مل جاؤں۔ یہاں میں تھوڑی بہت کامیاب بھی ہوگئی۔ صبا آپی اور حنا بجو مجھ سے کچھ مانوس ہوگئیں اور اکثر مجھ سے باتیں بھی کرنے لگیں۔

دُعا البتہ سب سے مختلف مزاج کی لڑکی تھی۔ وہ صرف شکل ہی میں نہیں بلکہ عادتوں میں بھی دادی جیسی تھی۔ انہیں کی طرح ضدی اور سرکش۔ اس کا دل چاہتا یا کوئی مطلب ہوتا تو مجھ سے بات کرتی ورنہ مجھے اگنور کر دیتی۔

ڈیڈی نے صبا آپی اور حنا بجو کی شادیاں بہت کم عمری میں کر دیں۔ وہ بلا کے اسٹیٹس کونشس بندے تھے اسی لئے ان کے دونوں داماد ان کی طرح ویل آف فیملیز سے تعلق رکھتے تھے۔ ان دونوں کی شادی کے بعد میں کچھ اور اکیلی ہوگئی لیکن میں نے گھر والوں کا خیال رکھنے والا اپنا رویہ ترک نہیں کیا۔ میں ابھی مایوس نہیں ہوئی تھی۔ مجھے اس گھر میں اپنی جگہ بنانی تھی۔ میں اپنی محبت اور خدمت سے سب کے دل جیت لینا چاہتی تھی۔ میری اطاعت گزاری پر دُعا میرا مذاق اڑاتی تھی کہ مجھے کسی مڈل کلاس گھرانے میں پیدا ہونا چاہئے تھا۔ یہ خدمت اور وفا شعاری وغیرہ جیسی لغویات وہاں بہت کارآمد ثابت ہوتی ہیں۔

دن گزرتے رہے میں انٹر کر کے آرٹس اسکول میں آ گئی۔ انہی دنوں سعود کو ہماری چھوٹی خالہ کی ماریہ سے طوفانی قسم کا عشق لاحق ہوگیا۔ ممی تو بیٹے کی خواہش پر دل و جان سے راضی تھیں لیکن ڈیڈی کو خالہ کا مڈل کلاس گھرانہ



اپنے اکلوتے بیٹے کے شایان شان نظر نہ آ رہا تھا۔ لیکن اب ممی کوئی پہلے کی طرح ڈیڈی سے ڈر جانے والی عورت نہ رہی تھیں سو ڈیڈی کے آگے۔ بیٹے کا مقدمہ لڑنے کھڑی ہوگئیں۔ آخر کار ڈیڈی کو ہتھیار ڈالنے پڑ گئے اور اپنے اکلوتے بیٹے کا رشتہ لے کر ایک دس ہزار ماہوار کمانے والے ٹٹ پونجئے کے گھر پہنچ گئے۔ ماریہ اور خالہ اس رشتے پر بہت خوش تھیں۔ سب ہی کو پتہ تھا انہوں نے ہاں کرنی ہے۔ بیٹی کے اس زوردار عشق میں وہ برابر کی شریک تھیں۔ انہیں اپنی بیٹی کے لئے ایسا ہی صاحب جائیداد اور اکلوتا و خوبرو داماد درکار تھا۔ سو انکار کی کوئی گنجائش ہی نہ تھی۔ لیکن ان کے جواب نے سب کو حیران کر دیا تھا وہ ماریہ کا رشتہ صرف اس قیمت پر دینے کو تیار تھیں کہ میرا رشتہ ان کے بیٹے خالد کے ساتھ طے کر دیا جاتا۔ سعود کے لئے ممی اس مقولے پر یقین رکھتی تھیں کہ ''جنگ اور محبت میں سب کچھ جائز ہے۔'' سو انہیں اس سودے بازی میں کوئی برائی نظر نہ آ رہی تھی۔

خالد میکینکل انجینئرنگ کر کے نوکری کی تلاش میں مصروف تھا۔ ایسا داماد ڈیڈی کے لئے کیسے قابل قبول ہو سکتا تھا۔ گھر میں پھر ایک نئی جنگ چھڑ گئی تھی۔ ممی کو خالد میں ہر خوبی اور ڈیڈی کو ہر خامی نظر آ رہی تھی۔ رہ گئی میں تو مجھ سے اس سلسلے میں کچھ بھی پوچھنے کی زحمت گوارا نہیں کی گئی تھی۔ سعود نے ڈیڈی کے انکار پر مشتعل ہو کر گھر چھوڑ دینے کی دھمکی دی تو ممی روتی ہوئی میرے پاس آ گئیں اور کہنے لگیں کہ میں ڈیڈی کے سامنے اس رشتے میں اپنی پسندیدگی کا اظہار کروں اور انہیں مجبور کروں کہ وہ ہاں کر دیں۔

مجھے خالد سے کوئی دلچسپی نہ تھی میری تو اس سے بطور کزن بھی بات چیت نہ تھی لیکن ممی کے دل میں اپنی محبت پیدا کرنے کا یہ موقع میں گنوانا نہیں چاہتی تھی اسی لئے ان کی بات مان کر ڈیڈی کے پاس چلی آئی۔ وہ میری اس بات پر بہت ناراض ہوئے۔ مجھے کلاس ڈفرنس کے عیوب گنوانے لگے۔ مجھے سمجھانے لگے کہ رشتے ناتوں میں کی جانے والی بلیک میلنگ انہیں بالکل پسند نہیں۔ وہ خالد کے متبادل کے طور پر بے شمار لوگوں کے نام میرے سامنے گنوانے لگے جن سے وہ میری شادی کر سکتے تھے اور جو میرے ہم پلہ بھی تھے۔ لیکن میں ان کے سامنے جم کر کھڑی ہوگئی اور جب تک ان سے اپنی بات منوا نہ لی وہاں سے ہٹی نہیں۔

خالہ اس رشتے کے طے ہو جانے پر بہت خوش تھیں۔ سعود کا ماریہ کے ساتھ اور میرا خالد کے ساتھ نکاح کر دیا گیا۔ ماریہ کو تو بیاہ کر ہمارے گھر آنا تھا۔ لیکن ڈیڈی کبھی بھی اپنی بیٹی کو ایک سو بیس گز کے ایک معمولی سے گھر میں رخصت نہیں کر سکتے تھے۔ اس وقت میں اسے ان کی اپنے آپ سے محبت جان کر خوش ہوتی رہی تھی آج سوچتی ہوں تو خیال آتا ہے وہ ان کی مجھ سے نہیں اپنے آپ سے محبت تھی۔ سکندر شہریار خان کی بیٹی کسی معمولی گھر میں بیاہ کر جائے ان کی ناک نیچی نہ ہو جاتی۔ انہوں نے خالد کا اسٹیٹس ہمارے برابر لانے کے لئے فوری طور پر اس کے لئے امریکہ میں اچھی جاب اور رہائش کا بندوبست کیا اور وہاں ایک بہت ہی اچھی فرم میں اس کی نوکری کا انتظام ہوگیا تھا۔ جتنے ڈالرز کی جاب اسے ڈیڈی کے توسط سے ملی تھی وہ تو اس نے کبھی خواب میں بھی نہ دیکھے تھے۔ وہ امریکہ چلا گیا اور خالہ کے گھر کے حالات بتدریج بدلنے لگے۔

ہمارے درمیان نکاح جیسا مضبوط بندھن قائم ہو جانے کے باوجود اس نے کبھی مجھ سے ملنے یا بات کرنے کی کوشش نہ کی۔ میں اس کے سرد و سپاٹ انداز پر حیران ہوا کرتی تھی۔ میرے سامنے ماریہ اور سعود صبح و شام ایک

دوسرے سے ملتے، فون پر لمبی لمبی باتیں ہوتیں اور وہ جس کے ساتھ مجھے زندگی گزارنی تھی میرے وجود سے لاتعلق تھا۔ اس کے اسی رویے کی بدولت میرے دل میں بھی اس کے لئے کچھ خاص قسم کی فیلنگس پیدا نہ ہوسکیں۔ میں ان دنوں اپنے مستقبل سے ڈرنے لگی تھی۔

مجھے لگتا تھا میری زندگی بھی ممی ڈیڈی کی طرح ایک دوسرے کو نیچا دکھانے اور ذلیل کرنے میں گزر جائے گی۔ میں محبتوں کی متلاشی تھی۔ میں بس یہ چاہتی تھی کہ وہ جس کے ساتھ مجھے اپنی زندگی گزارنی ہے چاہے وہ کوئی بھی ہو لیکن مجھ سے بے حد محبت کرتا ہو۔ میرا وجود اس کے لئے خوشی کا باعث ہو۔ وہ بن کہے میرے دل کی ہر بات سمجھ جائے۔ وہ امیر ہو یا غریب لیکن میری عزت کرے مجھے سچا پیار دے اور خالد میں مجھے ایسی کوئی خوبی نظر نہیں آ رہی تھی۔

''میرا B.F.A کمپلیٹ ہوا تو میں نے وقت گزاری کے لئے آرٹس اسکول Join کرلیا۔ انہیں دنوں سعود کے اصرار پر ماریہ رخصت ہوکر ہمارے گھر آ گئی۔ ورنہ ڈیڈی تو ہم دونوں کی ایک ساتھ شادی کرنا چاہتے تھے۔ خالد اتنی جلدی شادی کے لئے آمادہ نہ تھا سو ڈیڈی کو چپ سادھنی پڑی۔ ماریہ ایک بہت ہی سطحی ذہن کی لڑکی تھی۔ اسے تو شاید سعود سے سچی محبت بھی نہیں تھی۔ اس کا خواب تو ایک امیر گھرانے کی بہو بننا تھا۔ دونوں ہاتھوں سے دولت لٹانا اور سیر وتفریح کرنا اس کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ اس کی تمام حرکات کسی نودولتیے جیسی تھیں۔

دعا سے اس کی بالکل بھی نہیں بنتی تھی۔ لیکن وہ ڈیڈی کی چہیتی کو کچھ کہہ بھی نہیں سکتی تھی۔ دعا اس کے نودولتی پن کا دل کھول کر مذاق اڑاتی۔ کھانے کی میز پر بیٹھ کر ندیدوں کی طرح پلیٹ لبالب بھر لینے پر دعا اس کو تمسخرانہ نظروں سے دیکھتی۔ میری البتہ اس سے نہ تو کوئی دوستی تھی نہ دشمنی۔

دن گزرتے رہے ڈیڈی کو میری رخصتی کی فکر کچھ زیادہ ہی ستانے لگی تھی۔ ممی البتہ پرسکون تھیں۔ انہیں دنوں میری زندگی آندھیوں کی زد میں آ گئی۔ میں نے کبھی کسی کے ساتھ برا نہیں کیا تھا کسی کا دل نہیں دکھایا تھا لیکن خود میرے ساتھ اس سب کے صلے میں کیا ہوا؟ میں ساری زندگی اپنوں کی محبت کی طلب میں بھاگتی رہی۔ لوگوں کے دل جیتنے کے لئے خدمت اور فرمانبرداری کے ہتھیار استعمال کرتی رہی اور ایک روز مجھے پتہ چلا کہ میں سراب کے پیچھے بھاگ رہی تھی۔ میں خالی ہاتھ کھڑی سوچ رہی تھی کہ میرے ساتھ یہ سب کیوں ہوا۔ میں ان چاہی تھی اور اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود بھی ان چاہی ہی رہی۔

خالد دو مہینوں کی چھٹی لے کر پاکستان آیا تھا اور جو خبر کسی بم کی طرح میرے اعصاب کو توڑ پھوڑ گئی تھی وہ یہ تھی کہ وہ اپنی چچازاد نزہت سے شادی کر رہا تھا۔ خالہ نے ڈیڈی کے احتجاج سے خود کو لاتعلق ظاہر کر کے اسے بیٹے کی ضد اور بغاوت قرار دیا تھا۔ ڈیڈی کا غصہ آسمان سے باتیں کر رہا تھا۔ انہوں نے خالد کو اس کی اوقات یاد دلانے کی کوشش کی اور بتایا کہ وہ ہے کیا دو ٹکے کا انسان جسے انہوں نے ترس کھا کر اپنے برابر جگہ دی تھی تو اس نے جواباً بڑے آرام اور سکون سے مجھے طلاق دے دی۔

کوئی قصور نہ ہوتے ہوئے بھی میں مصلوب کی جا رہی تھی۔ میں نے جو قدم ممی کو خوش کرنے کے لئے اٹھایا تھا وہ میری بربادی پہ ختم ہوا تھا۔ خالہ کے گھر خالد کی شادی کی تیاریاں زور وشور سے جاری تھیں کل تک جو وہ بیٹے کی ضد اور بغاوت سے ناراض نظر آ رہی تھیں آج بڑے آرام سے اپنی بہو کے استقبال کی تیاریوں میں مصروف تھیں۔



خالہ کے گھر کے کسی بھی فرد کی ہمارے گھر آمد پر مکمل پابندی عائد ہو چکی تھی۔ ڈیڈی ان میں سے کسی کی شکل دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتے تھے۔ ان کے بقول ممی کا مڈل کلاس گھرانہ اس قابل ہی نہ تھا کہ ان سے کوئی تعلق رکھا جائے۔ ڈیڈی کے منہ سے کلاس کا طعنہ ماریہ کو بہت برا لگا تھا۔ اس نے مجھ سے خوامخواہ کا بیر باندھ لیا تھا۔ اصولاً تو مجھے اس سے برا سلوک کرنا چاہئے تھا کہ اس کا بھائی میری بربادی کا ذمہ دار تھا مگر ہمارے گھر الٹی گنگا بہہ رہی تھی۔

سعود کو بھی مجھ میں سو طرح کے عیب نظر آنے شروع ہوگئے۔ ڈیڈی نے ماریہ کے علاوہ کسی کو بھی شادی میں شرکت کی اجازت نہ دی تھی۔ اس رات میں ممی کے لئے چائے لے کر ان کے کمرے کی طرف آئی تو اندر سے آتی مسعود کی آواز نے میرے قدموں کو جکڑ لیا۔ وہ ممی سے ڈیڈی کے رویے پر احتجاج کر رہا تھا۔ براہ راست ڈیڈی سے ٹکر تو وہ لے نہیں سکتا تھا آخر یہ گھر اور تمام کاروبار ڈیڈی کی ملکیت تھا اور سعود ہرگز بھی اتنا بیوقوف نہ تھا۔ کاش اس روز میں نے ممی اور سعود کی باتیں نہ سنی ہوتیں، کم ازکم خود اپنی نظروں میں کچھ تو معتبر رہ جاتی ان کی باتوں سے مجھے پتہ چلا کہ خالد ایک عرصے سے نزہت کو پسند کرتا تھا۔ خود نزہت بھی اس میں انٹرسٹڈ تھی۔ لیکن اسے اپنے ہی جیسے ایک مڈل کلاس گھرانے میں شادی کرنا منظور نہ تھا۔ اسے دولت، رتبہ، عالیشان مکان اور قیمتی گاڑی چاہئے تھی اور وہ سب کچھ خالد کی چھوٹی موٹی نوکری میں ہونا ممکن نہ تھا۔ ہمارے ہاں سے ماریہ کے لئے رشتہ گیا تو خالد کو اپنے مسئلے کا حل میری صورت میں نظر آ گیا۔

وہ جانتا تھا کہ سعود ماریہ کے عشق میں بری طرح گرفتار ہے اور اس سے بھی کڑی شرائط اگر رکھی جائیں وہ تب بھی ماریہ ہی سے شادی کرے گا۔ اس نے خالہ کو اس بات کے لئے آمادہ کیا تو وہ بھی بیٹے کی ہمنوا بن گئیں۔ مجھے خالہ، خالد یا نزہت کسی سے کوئی شکایت نہیں۔ دکھ تو مجھے اپنوں کی بے اعتنائی کا تھا۔ سعود اور ممی دونوں خالد کی نزہت سے محبت کے بارے میں آگاہ تھے۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ مجھے استعمال کیا جا رہا ہے مجھے سونے کی چڑیا سمجھا جا رہا ہے لیکن سعود کے سر پر ماریہ کا عشق سر چڑھ کر بول رہا تھا اور ممی سعود کی محبت میں اپنی بیٹی کی بازی لگانے کو بھی تیار تھیں۔ خالہ اور خالد انہیں لاعلم سمجھتے تھے لیکن یہ ان کی غلط فہمی تھی۔ ممی کا خیال تھا کہ میرے جیسی امیر باپ کی بیٹی سے شادی ہو گی تو خالد خود بخود نزہت کو بھول جائے گا اور سعود کو مجھ سے صرف اتنی دلچسپی تھی کہ میرے ذریعے وہ اپنا مقصد حاصل کر سکے۔ میری سگی ماں جس نے مجھے اپنی کوکھ سے جنم دیا تھا، اتنے آرام سے میرے ارمانوں کا خون کر گئی۔ ان کے لئے واقعی محبت اور جنگ میں سب جائز تھا کیا فرق پڑ گیا اگر اس جنگ میں انہوں نے اپنی بیٹی کو ہار دیا۔

سعود اور ممی دونوں ہی کا خیال تھا کہ ڈیڈی بلاوجہ کے لئے اس بات کو ایشو بنا رہے ہیں۔ میرے لئے رشتوں کی کوئی کمی نہیں ہے۔ میں کوئی مڈل کلاس کی لڑکی نہیں ہوں منگنی ٹوٹ جانے پر یا طلاق ہو جانے پر جس کے لئے زندگی کے دروازے بند ہو جاتے ہیں۔ کل تک جو خود اپنے آپ کو طلاق سے بچانے کے لئے ہر قیمت پر ایک بیٹا چاہتی تھیں آج اپنی بیٹی کی طلاق پر ایک آنسو بہائے بغیر بڑے آرام سے بیٹھی ڈیڈی پر تنقید کر رہی تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ خالد کی غلطی کی سزا ان کی پوری فیملی کو دینا ناانصافی ہے اور پھر اس سے ماریہ کی بھی انسلٹ ہو رہی تھی۔

اس روز میں اپنے کمرے میں آ کر پھوٹ پھوٹ کر روئی تھی خالہ، خالد، نزہت، ماریہ سعود اور ممی سب نے اپنے اپنے مفادات کے لئے مجھے استعمال کیا تھا۔ میں انہیں ان کے مقصد تک پہنچانے کا زینہ تھی۔ میں ایک استعمال

ہونے والی شے تھی جس کے نہ کوئی جذبات ہوتے ہیں نہ احساسات۔ میں ان سب کے لئے ایک Cat`s Paw تھی۔ میری اچھائی میری نیکی اور خدمت کچھ بھی میرے کام نہ آئی تھی۔ مجھ سے اپنا مطلب نکال کر مجھے کسی فالتو چیز کی طرح ڈال دیا گیا تھا۔ ماریہ کا رویہ بالخصوص میرے ساتھ نہایت ہتک آمیز تھا اسے شاید یہ دھڑکا تھا کہ کہیں کسی روز میرے بھائی کی غیرت یا میری ماں کی ممتا نہ جاگ جائے اور اسے اس گھر سے نکال دیا جائے اس لئے وہ میری دشمن ہوگئی تھی۔ میرے لئے دنیا ختم ہوگئی تھی۔

وہ گھر جس میں رہتی تھی میرے لئے ایک جہنم کدہ بن گیا تھا۔ میں آہستہ آہستہ سب سے کٹتی چلی گئی۔ کسی نے میری تبدیلی کی وجہ جاننے کی کوشش نہ کی سب اپنے حال میں مگن خوش تھے۔ انہی دنوں مجھے پارک میں آپ ملے۔ مجھے نہیں پتہ کہ میری کس بات سے متاثر ہوکر آپ میری طرف بڑھے تھے میں جس سے اس کے خونی رشتے کوئی لگاؤ نہ رکھتے تھے اس سے ایک بالکل غیر آدمی بے حد پیار کر رہا تھا۔ پتہ نہیں آپ کی چاہت میں کیا جادو تھا کہ میں آپ کی اسیر ہوتی چلی گئی۔ اپنوں کے دیئے غم بھی مجھے بھولنے لگے۔ میں نے سوچا کہ ہاں کم سے کم آپ تو مجھ سے سچی محبت کرتے ہیں۔ بالکل بے غرض اور کھری۔ میں آپ کی سنگت میں خوش رہتی تھی۔ آہستہ آہستہ مجھ میں تبدیلی آ رہی تھی۔ میں خوش رہنے لگی تھی۔

تین روز پہلے ماریہ نے اپنے پہلے بچے کو جنم دیا۔ اس کا بیٹا جو بہت صحت مند تندرست پیدا ہوا مگر پیدائش کے دو گھنٹے بعد ہی مر گیا۔ کل وہ ہاسپٹل سے ڈسچارج ہوکر گھر آئی تو آتے ہی مرے کمرے میں آکر چلانے لگی کہ میں اس کے بچے کو کھا گئی ہوں۔ میں اس کے بچے کی پھوپھی نہیں ایک ڈائن ہوں جس نے اپنے بھتیجے کو کھا لیا۔ میں اس کی خوشیوں سے جلتی ہوں۔ اسے بددعائیں دیتی ہوں۔ میں کسی آسیب کی طرح اس کی جان کو چمٹ گئی ہوں۔ میری وجہ سے اسے اس گھر میں اس کا جائز مقام نہیں مل رہا اور پتہ نہیں میری جیسی منحوس بلا سے اس کا پیچھا کب چھوٹے گا۔

وہ مجھے اپنے بچے کا قاتل قرار دے رہی تھی اور میرا بھائی میرا ماں جایا خاموش کھڑا سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ دعا اپنے کمرے میں بند میوزک سن رہی تھی اور ممی ڈیڈی کسی ڈنر میں گئے ہوئے تھے۔ وہ ہوتے بھی تو کیا ہو جاتا۔ میں تو پیدا ہی لوگوں کی نفرتیں سہنے کے لئے کی گئی تھی۔ میں ماریہ کا منہ توڑ دینا چاہتی تھی۔ اس دو ٹکے کی لڑکی کو اس کی حیثیت یاد دلانا چاہتی تھی لیکن خاموش کھڑی اس کی ساری بکواس سنتی رہی تھی میرے منہ سے ایک بھی لفظ نہیں نکل سکا تھا۔ پھر جب وہ خاموش ہوئی تو میں گاڑی کی چابی اٹھا کر گھر سے نکل آئی اور پتہ نہیں کیسے آپ کے پاس پہنچ گئی۔"

وہ ان کے کندھے پر سر ٹکائے آنسو برساتے ہوئے اپنا دل ان کے سامنے کھول رہی تھی۔ وہ سارا وقت بغیر اسے ٹوکے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے اس کی ساری بات سنتے رہے تھے۔ صبح انہوں نے ڈرائیور کو بھیج کر اسے بلایا تھا اور وہ بنا چوں چرا کئے چلی آئی تھی۔ وہی کل کے سلوٹ زدہ کپڑوں اور بکھرے بالوں میں وہ لان کے بیڈروم میں بیٹھی انہیں اپنے بارے میں سب کچھ بتا رہی تھی۔ اویس آفس جا چکا تھا۔ کافی دیر بعد جب اس کے آنسو تھم گئے اور دل قدرے ٹھہر گیا تو اس نے انکل کی آواز سنی وہ کہہ رہے تھے۔

"تمہارا مسئلہ صرف اور صرف یہ ہے کہ تم بہت حساس ہو۔ ہر بات کو بڑی شدت سے محسوس کرتی ہو۔ تم لوگوں کے رویوں پر کڑھتی ہو۔ اگر تم غور کرو تو تمہارے ڈیڈی صرف تمہارے ہی ساتھ نہیں بلکہ اپنے کسی بھی بچے سے



ویسی محبت نہیں کرتے جیسی ایک باپ کو کرنی چاہئے۔ تمہاری ممی صرف تمہیں ہی نہیں تمہاری کسی بھی بہن سے کوئی لگاؤ نہیں رکھتیں۔ تمہاری جگہ تمہاری کوئی اور بہن بھی ہوتی وہ اسے بھی سعود کی خاطر یونہی استعمال کرتیں جیسے تمہیں کیا اور تم کیا سمجھتی ہو وہ سعود کو چاہتی ہیں۔ نہیں وہ اس سے محبت نہیں کرتیں۔ وہ دراصل ایک نفسیاتی مریضہ ہیں۔ تمہارے گھر کے کسی بھی فرد کا رویہ نارمل نہیں۔ تمہارا سارا گھرانہ ایک قسم کے Mental Disorder کا شکار ہے۔ تمہارے ساتھ جس کسی نے جو بھی کیا سب بھول جاؤ۔ ایک بار میرے کہنے پر سب کو معاف کر دو۔ اپنے دل کی سچائیوں سے سب کو معاف کر دو۔ تم لوگوں کے رویوں پر کڑھنا چھوڑ دو۔ میری بات کا یقین کرو کہ تم اپنے حصے کے تمام دکھ سہہ چکی ہو اور اب زندگی تم پر مہربان ہونے والی ہے۔ خدا اپنے بندوں پر کبھی بھی ان کی برداشت سے زیادہ آزمائش نہیں ڈالتا۔

تم خود دیکھ لینا زندگی اگلے موڑ پر تمہارے لئے کتنی ساری خوشیاں لئے کھڑی ہے۔ تم دونوں ہاتھوں سے خوشیاں، راحتیں اور محبتیں سمیٹو گی۔" وہ اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں تھام کر بولے تو وہ ان کو بے یقینی سے دیکھ کر رہ گئی۔

"تمہیں مجھ پر اعتبار ہے ناں۔" ان کے بات پر اس نے گردن ہلا دی۔

"تو پھر میری بات پر آنکھیں بند کر کے یقین کر لو۔ تمہیں زندگی میں وہ سب کچھ ملے گا جو تم چاہتی تھیں۔ اس بات کا یقین میں دلا رہا ہوں تمہیں۔" اور ان کی اس بات پر اس نے واقعی آنکھیں بند کر کے یقین کر لیا تھا۔ ان کے آگے اپنا دل کیا کھولا تھا اس کا تمام بوجھ ہی ہلکا ہوگیا تھا۔ وہ خود کو بہت ہلکا بہت مطمئن محسوس کرنے لگی تھی۔

اب وہ پارک میں ادھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بجائے اس سے اس کی اپنی باتیں کیا کرتے۔ وہ اپنے بچپن کی بے شمار چھوٹی چھوٹی باتیں انہیں بتاتی۔ اب اس کے دل پر کوئی بوجھ نہ تھا۔ انہوں نے اس کا بوجھ بانٹ لیا تھا۔ اس نے اپنے سے متعلقہ تمام افراد کو کھلے دل سے معاف کر دیا تھا۔ وہ اس کا ہاتھ تھامے جو کہتے وہ کئے جاتی۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود وہ خود میں ان کے گھر جانے کی ہمت نہیں پاتی تھی۔ اسے اویس کا سامنا کرنے سے شرمندگی کا احساس ہوتا تھا۔ اپنی اس روز کی بے اختیارانہ کیفیت اور دیوانگی اسے اس کے سامنے شرمندہ کرتی تھی۔ انکل کی بات دوسری تھی ان کے سامنے تو وہ کھلی کتاب تھی جو کچھ اس کے دل میں ہوتا وہ فوراً ان سے کہہ دیا کرتی تھی۔ اسی لئے انکل کے کئی دفعہ بلانے پر بھی وہ ان کے گھر نہ گئی تھی۔ اس روز سنڈے تھا جب انکل نے اسے فون کر کے اپنے ساتھ لنچ کرنے کی دعوت دی تھی اور ان کے بے حد اصرار پر بھی وہ آنے کے لئے تیار نہ ہوئی تھی۔ وہ اب بھی اس کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس کے انکار پر انکل نے مایوس ہوکر فون رکھ دیا تھا۔

☆☆☆

گیٹ سے اندر داخل ہوتے وقت وہ یہی دعا کر رہی تھی کہ اس سے سامنا نہ ہو اور وہ سامنے ہی لان میں بیٹھا نظر آ گیا تھا۔ اپنے حساب سے وہ اس وقت آئی تھی جس وقت وہ جمخانہ جایا کرتا تھا مگر وہ لان چیئر پر براجمان ایک ہاتھ میں سگریٹ اور دوسرے میں چائے کا کپ پکڑے گیٹ ہی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ انکل آج پارک نہیں آئے تھے اور وہ کھڑے کھڑے ان کی خیریت دریافت کرنے چلی آئی تھی۔ اب جبکہ اس نے اسے دیکھ بھی لیا تھا تو سیدھے سیدھے اندر چلے جانا بڑی بد اخلاقی کی بات تھی۔ وہ خود میں اس کو فیس کرنے کی جرات پیدا کرتی لان کی طرف چلی آئی۔ اسے اپنی طرف آتا دیکھ کر وہ غیر مقدی انداز میں مسکرایا تھا۔

''کہاں غائب ہو آج کل؟'' اس کے قریب آنے پر وہ مسکرا کر بولا۔ اسے تذبذب میں مبتلا دیکھ کر کرسی کی طرف اشارہ کرتا ہوا بولا۔

''بیٹھو۔''

''انکل کہاں ہیں؟'' وہ بیٹھنے کی آفر نظر انداز کر کے قصداً اس کی طرف دیکھے بغیر بولی۔

''اس گھر میں انکل کے علاوہ میں غریب مسکین سا بندہ بھی رہتا ہوں۔ کم سے کم میری خیریت ہی پوچھ لو۔'' وہ ناراضگی سے بولا۔ وہ مجبوراً کرسی پر ٹک گئی۔ سگریٹ کے کش لیتا وہ دھواں اڑاتا بڑے غور سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''اپنے حساب سے تو میں نے آج تک ایسی کوئی بات تم سے نہیں کی جس پر تم مجھ سے ناراض ہو جاؤ۔'' وہ حیران ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگی تو وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہنے لگے۔

''پھر بھی اگر تمہارے خیال سے میں نے کچھ غلط کیا ہے تو مجھے بتاؤ۔ اگر مجھے اپنی کوتاہی محسوس ہوئی تو میں تم سے ایکسکیوز کر لوں گا۔''

''میں آپ سے ناراض نہیں ہوں۔'' وہ سر جھکا کر دھیرے سے بولی۔

''پھر تم مجھے نظر انداز کیوں کر رہی ہو؟'' وہ اس کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔

''ایسی کوئی بات نہیں ہے آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔'' وہ اس کی آنکھوں میں دیکھنے سے ڈر رہی تھی اسی لئے سر جھکا کر بولی۔

''میں پاگل نہیں ہوں جو یہ بات محسوس نہ کر سکوں کہ تم میری وجہ سے یہاں آنے سے کتراتی ہو۔ اس وقت بھی تم اس خیال سے آ گئی تھیں کہ میں گھر پر نہیں ہوں گا۔'' وہ اس کی بات پر دھک سے رہ گئی۔ اسے اس کے دل کے حال کی خبر کیسے ہو گئی۔ وہ بری طرح پریشان ہو گئی تھی۔ اس بے تحاشا ذہین بندے کے سامنے جھوٹ نہیں بولا جا سکتا یہ بات اس کی سمجھ میں آ چکی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہے۔ اچانک ہی خود بخود اس کے ہونٹوں سے یہ جملہ پھسل گیا۔

''مجھے آپ کے سامنے آنے سے شرمندگی ہوتی ہے۔ میرے اس دن کے ابنارمل بی ہیو پر آپ نے میرے بارے میں کیا سوچا ہو گا۔'' وہ جو بڑی سنجیدگی سے اس کی طرف نظریں جمائے بیٹھا تھا اچانک ہی قہقہہ لگا کر ہنس پڑا تھا۔ اس نے بڑی حیرت سے اسے قہقہہ لگاتے دیکھا تھا۔ وہ لوگوں سے فاصلہ رکھ کر ملنے والا جو اپنے اور مقابل کے بیچ ایک لکیر کھینچ کر رکھتا تھا اس وقت بڑی بے فکری سے ہنس رہا تھا۔

''تمہیں یہ خوش فہمی کیوں ہے کہ میں ہر وقت تمہارے ہی بارے میں سوچتا رہتا ہوں۔'' اس نے جیسے اس کی بات کو بہت انجوائے کیا تھا۔ وہ اپنے بے اختیاری میں منہ سے نکل جانے والے جملے پر شرمندگی سے سر جھکا کر رہ گئی تھی۔ وہ مسکراتی نظروں سے اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

اچانک ہی اسے شدید قسم کا غصہ آنا شروع ہو گیا۔ اسے کس نے حق دیا ہے کہ وہ اس کا مذاق اڑائے وہ کرسی پر سے اٹھ گئی اور آگے بڑھنے ہی لگی تھی کہ اس نے اپنا پیر درمیان میں حائل کر کے گویا اسے جانے سے روکا۔



''میں نے ابھی تمہیں جانے کے لئے نہیں کہا۔'' وہ تنبیہی انداز میں بولا۔

''مجھے کہیں جانے کے لئے آپ کی اجازت کی ضرورت نہیں ہے۔'' وہ خفا خفا سی اس پر نظر ڈالے بغیر بولی۔

''تم شرافت سے بیٹھ رہی ہو یا میں ہاتھ پکڑ کر بٹھاؤں۔'' وہ غرایا۔

''مجھے آپ سے کوئی بات نہیں کرنی میں انکل سے ملنے آئی ہوں۔'' اس نے ہاتھ پکڑ کر اسے کرسی پر دھکیلا اور بولا۔

''اپنے سے پچاس سال بڑے انکل تمہیں دوستی کرنے کے لئے بڑے موزوں لگتے ہیں اور صرف پانچ چھ سال بڑے بندے سے تم بات کرنا بھی گوارا نہیں کر رہیں۔ ایسی ان میں کیا بات ہے جو مجھ میں نہیں۔ کیا ہم اچھے دوست نہیں بن سکتے؟'' اس بات پر اجالا نے چونک کر اس کی طرف دیکھا تھا اس کا بے تکلف انداز اجالا کو حیران کر رہا تھا۔ وہ مسکراتا ہوا اس کی طرف دیکھ رہا تھا پھر وہ قدرے سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے اس سے بولا۔

''مجھے نہیں معلوم تھا تم اس وجہ سے مجھ سے کترا رہی ہو۔ ایک دم بیوقوف ہو تم۔ انسان اپنی تکلیف میں، پریشانی یا غم میں اسی کے پاس جاتا ہے جس پر اسے بھروسہ ہوتا ہے جس کو وہ اپنا سمجھتا ہے اگر تم ہمیں اپنا سمجھ کر ہمارے پاس آئی تھیں تو میں کیوں تمہارے بارے میں کوئی فضول بات سوچوں گا۔ ایسا ہر احمقانہ خیال اپنے دل سے نکال دو اور ایک دوست کی حیثیت سے میں تمہیں مشورہ دینا چاہتا ہوں کہ برداشت، تحمل، رواداری اور اخلاق وغیرہ اچھی چیزیں ہیں لیکن بعض لوگوں پر ان کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ ایسے لوگوں پر ان جذبوں کو لٹانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ جو چپ چاپ ظلم سہتا رہے وہ خود سب سے بڑا ظالم ہوتا ہے۔ اپنے اندر ہمت پیدا کرو۔ کوئی تمہیں تکلیف دے یا ستائے تو تم اس کا منہ توڑ دو۔

مجھ سے دوستی کر کے دیکھو میں تمہیں بالکل اپنے جیسا بنا دوں گا۔ کوئی میرے ساتھ زیادتی کرنے کی جرأت تو کیا ایسا کرنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا کیونکہ ایسا کرنے والے کو اپنا انجام پتہ ہوتا ہے۔''

وہ بڑی سنجیدگی اور بردباری سے اس کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا بول رہا تھا۔ شاید انکل اسے اس کے بارے میں سب کچھ بتا چکے تھے۔ اس کے بات کرنے کا انداز اتنا اچھا تھا کہ وہ اپنا آپ اس کے سامنے ظاہر ہونے پر کوئی پریشانی محسوس کئے بغیر بولی۔

''لیکن انکل تو کہتے ہیں کہ سب کو معاف کر دو۔''

''ہر جگہ معافی تلافی سے کام نہیں چلتا۔ ٹھیک ہے ابھی تم نے معاف کر دیا لیکن پھر سے کوئی تمہیں دکھ دے تو زیادہ نیک پروین بننے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اپنا حق چھین لو۔ کسی کو اپنا استحصال نہ کرنے دو۔ خاموشی سے بیٹھ کر آنسو بہانے اور سپر سینسٹو ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔''

وہ اسے ایک بہت ہی مختلف سبق پڑھا رہا تھا۔

''کچھ آیا سمجھ میں یا سر کے اوپر گزر گیا۔'' وہ اسے بغور اپنی طرف دیکھتا پا کر مسکراتا ہوا بولا۔ اس نے کوئی جواب دیئے بغیر اس پر سے اپنی نظریں ہٹا لیں اور سامنے کیاری میں بہار دکھاتے للّی اور چائنا روز پر نظریں مرکوز کر دیں۔

''ویسے آپ کے انکل اپنے جگری دوست فاروقی صاحب کے ہاں گئے ہوئے ہیں اور وہاں یقیناً شطرنج کی

بساط بچھی ہوگی۔ رات سے پہلے ان کی واپسی کا کوئی امکان نہیں ہے۔'' وہ اس کے جواب نہ دینے کا برا مانے بغیر انکل کے بارے میں بتانے لگا تو اسے اپنی یہاں موجودگی بڑی فضول لگی۔

''اچھا پھر میں چلتی ہوں۔''

''بیٹھی رہو ابھی سکون سے۔ جانے کی جلدی تو ایسے مچاتی ہو جیسے مسئلہ کشمیر و افغانستان تمہارے ہی ہاتھوں آج ہی حل ہونا ہے۔'' اس نے جھڑکنے والے انداز میں کہا تو وہ پہلو بدل کر رہ گئی

''کل پاپا جانی کا برتھ ڈے ہے اور میں اس میں تمہیں انوائٹ کر رہا ہوں۔'' اس کی بات پر وہ خوش ہو کر بولی تھی۔

''آپ لوگ کیا کوئی فنکشن وغیرہ کرتے ہیں۔''

''نہیں خالی میں اور پاپا جانی ہم دونوں ہمیشہ ہی ایک دوسرے کی سالگرہ سیلیبریٹ کرتے ہیں۔ ہم دونوں کے علاوہ اس میں کوئی تیسرا نہیں ہوتا۔ اس مرتبہ میں تمہیں دعوت دے رہا ہوں۔ ویسے سالگرہ میری ہو یا پاپا جانی کی ڈنر ہوتا انہیں کی طرف سے ہے۔ انہیں اپنے سے چھوٹوں سے تحفہ لینا پسند نہیں ہے اس لئے گفٹ لانے کی زحمت مت کرنا۔ میں بھی تمہاری طرح خالی ہاتھ شرکت کروں گا۔ پھر تم آ رہی ہو۔'' اس کی بات پر اس نے پرزور انداز میں گردن ہلا کر حامی بھری تھی۔

''کیک میں بیک کر کے لاؤں گی اس پر تو وہ ناراض نہیں ہوں گے۔'' اس کی بات پر وہ ہنستے ہوئے بولا۔

''ڈیپینڈ کرتا ہے کہ وہ کیک بنا ہوا کیسا ہے۔ اگر اچھا ہوا تو یقیناً ناراض نہیں ہوں گے۔'' اس بات پر اس کے لبوں پر بھی مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔

''اب آپ چاہیں تو جا سکتی ہیں میری بات ختم ہو گئی ہے۔'' وہ فوراً ایسے کھڑی ہوئی جیسے اس سے پہلے کسی نے باندھ کر بٹھایا ہوا تھا اور خدا حافظ کہتی گیٹ کی طرف بڑھ گئی تھی۔ وہ بڑے غور سے اسے جاتا ہوا دیکھ رہا تھا۔

☆☆☆

رات اس نے دو گھنٹے صرف کر کے بڑی محنت اور لگن سے ایک خوبصورت سا برتھ ڈے کارڈ بنایا پھر اگلے روز صبح ہی بڑے اہتمام سے کچن میں گھس گئی۔ ان کا من پسند کیک بیک کیا اسے بڑی خوبصورتی سے سجایا درمیان میں Many Happy returns of th day لکھا۔ اس کام سے فارغ ہو کر اس نے اپنے آج کے پہننے کے لئے کپڑوں کا انتخاب کیا۔ آج ایک طویل عرصے بعد اس کا بہت اچھی طرح سے ڈریس اپ ہونے کا دل چاہ رہا تھا۔ آخر یہ سالگرہ اس ہستی کی تھی جسے وہ بے حد پیار کرتی تھی تو کیوں نہ اہتمام کرتی۔ آف وائٹ کاٹن کی قمیض شلوار جس کی شرٹ پر ہم رنگ کڑھائی اور شیشے کا بڑا نفیس اور نازک سا کام بنا ہوا تھا ساتھ خوب لمبا سا آف وائٹ دوپٹہ پہن کر اس نے سوٹ سے مناسبت رکھتی ہلکی سی جیولری پہنی۔ بہت عرصے بعد میک اپ کیا اور شانوں تک آتے بالوں کو جنہیں وہ زیادہ تر کلپ یا بینڈ میں جکڑ کر رکھتی تھی برش کر کے یونہی کھلا چھوڑ دیا۔

ان کے گھر جانے کے لئے نکلی تو پہلے ایک فلاور شاپ سے پھولوں کا ایک حسین سا گلدستہ خریدا پھر اس کے بعد ان کے گھر چلی آئی۔



انکل لاؤنج میں بیٹھے کسی سے فون پر بات کر رہے تھے۔ اسے اتنی سج دھج کے ساتھ ایک ہاتھ میں بکے اور دوسرے میں کیک اٹھا کر لاتے دیکھ کر وہ اپنی اگلی بات بھول گئے۔ ایک آدھ سیکنڈ کے سکتے کے بعد انہوں نے جلدی سے فون خدا حافظ کہہ کر بند کیا اور اس کی سمت توجہ کی۔ وہ ان کی حیرت پر مسکراتی ہوئی ان کے قریب چلی آئی اور کیک ٹیبل پر رکھ کر ان کے گلے میں اپنی بانہیں ڈال کر گنگناتی۔

"Happy Birthday to you" وہ اس کا ماتھا چومتے ہوئے ہنس کر بولے۔

''لیکن خاتون آپ ہیں کون اور اتنی بے تکلفی سے ہمارے گھر میں کہاں پھر رہی ہیں۔'' وہ ان کی شرارت پر ہنس پڑی اور بولی۔

''میں اچھی لگ رہی ہوں ناں۔''

''مجھے تم ہمیشہ ہی اچھی لگتی ہو۔ ہاں البتہ آج پہچانی نہیں جا رہیں۔ ویسے تمہیں آج کے دن کا پتہ کیسے چلا۔'' وہ اس کے کندھے کے گرد اپنا ہاتھ پھیلاتے ہوئے بولے۔

''مجھے اویس نے بتایا تھا بلکہ انہوں نے ہی مجھے انوائٹ کیا تھا۔'' وہ ان کے ہاتھ میں بکے اور کارڈ پکڑاتے ہوئے بولی۔

''بہت ہی خوبصورت پھول ہیں۔'' انہوں نے پھولوں کی خوشبو محسوس کی پھر اس کے بعد اس کے بنائے ہوئے کارڈ کو خوب غور و فکر سے دیکھ کر اسے آرٹ کا نادر نمونہ قرار دیا اور کارڈ اور کارڈ بنانے والی دونوں کی شان میں زمین آسمان کے قلابے ملائے۔

''تمہیں بلا کر وہ حضرت خود تو ابھی تک گھر سے غائب ہیں۔'' انکل نے ان کی غیر موجودگی کے بارے میں بتایا۔ اس نے کیک کھول کر نکال کر رکھا۔ پھر کچن سے جا کر پلیٹیں، چمچے اور بٹر نائف لا کر وہیں ٹیبل کے اوپر رکھ دی اور وہ خاموشی سے بیٹھے اس کی تمام کارروائی دیکھ رہے تھے۔ وہ کیک کے اوپر کینڈلز لگا رہی تھی جب اویس نے لاؤنج میں قدم رکھا۔ بلیک سوٹ پہنے ایک ہاتھ میں بریف کیس اور دوسرے میں موبائل تھامے وہ پاپا جانی کو سلام کرتے کرتے ٹھٹک کر رک گیا۔ اسے اندر آتا دیکھ کر وہ بھی کینڈل سے توجہ ہٹا کر اسی کی طرف دیکھنے لگی تھی۔ اپنے چہرے پر ایک لمحے کے لئے پھیلنے والے ستائشی تاثرات کو فوراً چھپاتے ہوئے وہ بڑے نارمل طریقے سے پاپا جانی اور اس سے سلام دعا کرتا اپنے کمرے میں چلا گیا۔

دس پندرہ منٹ بعد وہ کپڑے چینج کر کے آ گیا تو انکل نے کیک کاٹا۔ اپنے ہاتھ سے پہلے اسے اور پھر اویس کو کیک کھلایا۔

''چلو اجالا اب تم کیک سرو کرو۔'' انکل نے اسے ہدایت دی تو وہ سلیقے سے پلیٹس میں کیک نکال کر انکل اور اسے پلیٹ دینے کے بعد اپنی پلیٹ لئے انکل کے پاس ہی بیٹھ گئی۔ اویس ٹیبل کے اوپر رکھے ہوئے کارڈ کو دیکھ کر کہنے لگا۔

''یہ تم نے بنایا ہے؟'' اس نے گردن ہلا دی۔

''کتنا خوبصورت کارڈ بنایا ہے اجالا نے دیکھو میں ایسے ہی اس کی تعریف نہیں کرتا۔'' انکل نے اویس کو

مخاطب کیا تو وہ مسکرا کر رہ گیا۔ وہ خاموشی سے کیک کھانے میں مصروف تھی۔

"ابھی اجالا مجھ سے پوچھ رہی تھی کہ یہ کیسی لگ رہی ہے۔" وہ پھر اویس سے مخاطب ہوئے تھے۔

"اُف یہ انکل کبھی کبھی کتنی بری طرح شرمندہ کروا دیتے ہیں۔ اس کے سامنے یہ بولنے کی کیا ضرورت تھی۔" اویس نے ایک تفصیلی نظر اس کے چہرے پر ڈالی پھر ان سے مخاطب ہوا۔

"پھر آپ نے کیا جواب دیا؟" وہ اس طرح پوچھ رہا تھا جیسے یہ کوئی بہت ہی اہم اور سنجیدہ سا مسئلہ ہے جس کا حل کیا جانا بے حد ضروری ہے۔

"میں نے کیا کہنا تھا ظاہر ہے وہ ہے ہی اچھی بہت اچھی خوبصورت، ذہین، گریس فل اسے مزید کسی تعریف کی کیا ضرورت ہے۔" وہ انکل کی اتنی خوبصورت تعریف پر بے ساختہ مسکرا اُٹھی۔ اسی وقت لاؤنج میں رکھے فون کی بیل بجی۔ اویس نے ریسیور اٹھایا تو انکل کے کسی جاننے والے کی کال تھی۔ وہ اٹھ کر فون پر بات کرنے لگے تو اویس اس سے بولا۔

"میں بھی سوچ رہا ہوں کہ گندا میلا رہنا شروع کر دیتا ہوں۔ پھر جب اچانک کسی دن نہا دھو کر صاف ستھرے حلئے میں نظر آؤں گا تو میرے اوپر بھی تعریفوں کے پھول نچھاور کئے جائیں گے۔" اس نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا تو وہ مسکراتا ہوا اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

"ویسے یہ کس بیچارے بیکر کی کاوشوں کو اپنے نام سے پیش کیا جا رہا ہے۔" اس کی بات پر وہ بری طرح چڑ گئی۔

"کیا مطلب ہے آپ کا؟ میں کیا یہ کیک کسی بیکری سے لائی ہوں۔"

"میں نے یہ کب کہا۔" وہ معصومیت سے بولا۔ اس کی ناراضگی سے بھرپور شکل دیکھ کر کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

"کیا میری سالگرہ پر تم میرے لئے بھی اپنے ہاتھ سے بنا کر کارڈ اور کیک لاؤ گی؟" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا بولا۔

"ہاں اور پھر یہ سنوں گی کہ یہ کیک کس بیکری سے اور کارڈ کسی آرٹسٹ سے بنوا کر اپنے نام سے دے رہی ہوں۔" وہ اس کی الزام تراشی پر ناراض ہو کر بیٹھ گئی تھی۔ وہ مستقل مسکرائے جا رہا تھا۔ انکل فون کر کے فارغ ہو گئے تو بولے۔

"چلو ڈنر کے لئے چلیں۔ آج اجالا کی پسند کی جگہ ہم لوگ ڈنر کریں گے۔" کچھ دیر بعد وہ لوگ گاڑی میں بیٹھے میریٹ جا رہے تھے۔ راستے میں وہ انکل سے اپنے بزنس سے متعلق امور ڈسکس کرنے لگا تو وہ خاموشی سے بیٹھی اردگرد کا جائزہ لینے لگی۔ ہوٹل پہنچ کر وہ تینوں ایک ساتھ چلتے ہوئے اندر داخل ہوئے۔ اپنے لئے میز منتخب کر کے بیٹھ گئے تو ویٹر آرڈر لینے آ گیا۔ انکل نے ان دونوں کو آرڈر کرنے کے لئے کہا اس نے اپنی پسند کی دو تین چیزیں بتا دیں اور اویس نے اپنی پسندیدہ ڈشز یعنی مختلف سلاد اور جھینگے وغیرہ کا آرڈر کر دیا۔

"یہ تم اتنے تکلف سے کیوں کھا رہی ہو۔" انکل اسے تھوڑے سے چاول پلیٹ میں ڈالے دیکھ کر ٹوکنے لگے۔ "آپ بے فکر رہیں انکل میں تکلف نہیں کر رہی۔" وہ انہیں اطمینان دلانے لگی۔



"میرا خیال ہے اجالا تکلف نہیں بلکہ ڈائٹنگ کر رہی ہے۔" اویس نے کولڈ ڈرنک کا سپ لیتے ہوئے کہا۔

"میں اکثر سوچتا تھا کہ یہ اتنی سوکھی تنکا سی کیوں ہے۔ اب پتہ چلا یہ سب ڈائٹنگ کا کرشمہ ہے۔" اس کی بات پر اجالا نے سر اٹھا کر براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھا اور بولی۔

"آپ ہر وقت میرے بارے میں کیوں سوچتے رہتے ہیں۔ دنیا میں میرے علاوہ اور بھی بہت سے غور طلب مسائل ہیں۔" انکل نے اپنی پلیٹ سے توجہ ہٹا کر ایک نظر اجالا کو اور ایک نظر اویس کو دیکھا۔ ایک طرف کسی پرانی بات کا بدلہ چکا لینے کی خوشی تھی تو دوسری طرف ایک محظوظ سی مسکراہٹ۔ وہاں اس وقت کسی گزری ہوئی بات کے حوالے سے جملہ اچھالا گیا تھا جس سے وہ قطعاً لاعلم تھے۔ کمال ہے بچوں نے اتنی ترقی کر لی اور مجھے پتہ بھی نہیں چلا انہوں نے خود کو ڈپٹا۔ جو بھی تھا ان دونوں کی ایک دوسرے سے بے تکلف بات چیت انہیں خوش کر رہی تھی۔ جن دو لوگوں کو وہ ساری دنیا میں سب سے زیادہ چاہتے تھے اور ان کے حوالے سے انہوں نے کتنے ہی خواب دیکھ ڈالے تھے ان کی یہ نوک جھونک انہیں مسرت بخش رہی تھی۔

وہ خاموشی سے کھانا کھانے لگا تھا لیکن اس کی آنکھوں سے جھانکتی شرارت اور لبوں کی مسکراہٹ بتا رہی تھی کہ وہ کسی بات کو بہت انجوائے کر رہا ہے۔ اپنے خیال سے اس نے اسے شرمندہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن اس کی مسلسل شوخ سی مسکراہٹ اسے کوفت میں مبتلا کرنے لگی۔ وہ تو چڑنے کے بجائے بڑا خوش نظر آ رہا تھا۔ واپسی میں وہ گاڑی چلاتا بیک ویو مرر کے ذریعے ایک آدھ نظر اس کے پھولے ہوئے منہ پر بھی ڈال لیتا اور خوامخواہ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل جاتی۔ گاڑی اس کے گیٹ کے سامنے رکی تو وہ دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔ اسی وقت سامنے ایک اور گاڑی کی ہیڈ لائٹس چمکی تھیں۔ اجالا نے سامنے دیکھا تو سعود اور ماریہ بیٹھے نظر آئے۔ چوکیدار نے گاڑی کا ہارن سن کر گیٹ کھول دیا تھا لیکن وہ گاڑی اندر لے جانے کے بجائے وہیں روک کر گاڑی سے اتر کر ان لوگوں کی طرف چلا آیا۔ اس کی چال میں بہت تیزی اور عجلت نظر آ رہی تھی۔ وہ سیدھا ڈرائیونگ سیٹ کے نزدیک پہنچ گیا اور بڑی گرم جوشی اور سرخوشی کے عالم میں اویس سے مخاطب ہوا۔

"آہا اویس لودھی اور ہمارے گھر۔" اویس گاڑی سے اتر کر اس سے ہاتھ ملانے لگا۔ شوہر کو کسی کے ساتھ اتنی خوشگواری سے ملتے دیکھ کر ماریہ بھی ادھر ہی چلی گئی۔

"یہ اتنے ہینڈسم بندے کے ساتھ اجالا کا کیا کام۔" اس کے چہرے کی حیرت اور ناگواری چھپائے نہ چھپ رہی تھی۔ اویس کا سعود کی گرم جوشی کے جواب میں دبی لیا دیا اور فارمل سا انداز تھا۔ اس کا وہی مخصوص انداز جس کی بدولت سامنے والا اس سے بے تکلف ہونے کی ہمت نہیں کر پاتا تھا۔ کوئی کہہ نہیں سکتا تھا کہ کچھ دیر پہلے یہ بندہ اتنی بے تکلفی سے جملے کستا مسکرا رہا تھا۔

"یہ اجالا تو بڑی ہی بد اخلاق ہے۔ آپ لوگوں کو اندر آنے کے لئے بھی نہیں کہا۔" اویس کے آگے تقریباً بچھتا ہوا سعود اسے اس وقت ہمیشہ سے بھی زیادہ برا لگا۔ "کاش سعود تم اتنے کمینے نہ ہوتے اور اگر ایسے ہی تھے تو کم از کم میرے بھائی نہ ہوتے۔" اس کا خوشامدانہ اور چاپلوس انداز اجالا کا حلق کڑوا کر رہا تھا۔ اسی وقت سعود کی نظر برابر کی سیٹ پر بیٹھے انکل پر پڑی تو اویس نے بڑے عام سے انداز میں تعارف کروا دیا۔

''میرے گرینڈ فادر سید مبشر لودھی'' سعود اب ان سے جھک جھک کر سلام دعا کر رہا تھا۔ ان کی قیمتی گاڑی اور شاندار پرسنیلٹی سے ماریہ یہ اندازہ تو لگا چکی تھی کہ شوہر کسی غلط آدمی پر فدا نہیں ہو رہا اس لئے خود بھی اپنی ساڑھی کا پلو سنبھالتی مسکراتی ہوئی کھڑی تھی۔ سعود کے بے حد اصرار سے اندر بلانے پر ان لوگوں نے معذرت کرتے ہوئے اجازت چاہی تھی۔

اویس نے ایک گہری نظر اس کے ناراض اور کوفت زدہ چہرے پر ڈالی اور گاڑی سٹارٹ کر دی تھی۔ اندر آتے ہی سعود نے اس سے پوچھا تھا۔

''تم اویس کو کیسے جانتی ہو؟''

''میری ان لوگوں سے فرینڈ شپ ہے۔'' وہ مختصر جواب دے کر اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔ انکل کی ہدایت کی بدولت اس نے سب کے ساتھ نارمل طریقے سے بات چیت شروع کر دی تھی۔ ناشتے اور کھانے کی میز پر بھی گھر والوں کے ساتھ بیٹھنے لگی تھی۔

''تم مبشر لودھی کی فیملی کو کب سے جانتی ہو۔'' صبح ناشتے کی میز پر ڈیڈی نے پتہ نہیں کتنے عرصے بعد اسے براہ راست مخاطب کیا تھا۔

''بہت عرصے سے۔'' وہ سعود کے اتنی جلدی خبر پہچانے پر حیران تھی۔ یہ سعود تو B.B.C اور روائس آف امریکہ سے بھی کہیں آگے ہے۔ وہ دل ہی دل میں اسے سراہنے لگی۔ ڈیڈی اب ممی سے مخاطب تھے۔

''بہت بڑے گروپ آف انڈسٹریز کا تنہا وارث ہے یہ اویس لودھی۔ آج کل بزنس سرکل میں سب سے ہاٹ ایشو اس کی شادی بنی ہوئی ہے۔ ایسے لوگوں سے تو خالی دوستی ہونا بھی کسی فائدے سے خالی نہیں۔ کتنے ہی بڑے بڑے خاندان اپنی بیٹیوں کا رشتہ اس سے طے کرنا چاہتے ہیں مگر اس کا خود کا انٹرسٹ کس طرف ہے یہ واضح نہیں ہو پا رہا۔''

ماریہ نے بڑی جیلس نظروں سے اس کی طرف دیکھا تو اس کا خوامخواہ قہقہہ لگا کر ہنسنے کو دل چاہنے لگا۔

''یہیں فیز فائیو میں گھر ہے اس کا ایسا کرو اجالا ان لوگوں کو اس سنڈے کو ڈنر پر انوائٹ کر لو۔'' ڈیڈی نے پہلے ممی اور بعد میں اسے مخاطب کیا تھا۔ وہ ایک دم میز پر بیٹھے تمام لوگوں کو اپنے سے اونچی کوئی خاص چیز لگنے لگی تھی۔ وہ مرکز نگاہ بنی تھی تمام کیمروں کا رخ اس کی طرف تھا۔ سوائے دعا کے اس وقت ٹیبل پر گھر کے تمام افراد موجود تھے۔

''آپ لوگ نفع نقصان سے قطع نظر بھی انسان کو انسان سمجھ کر کیوں نہیں ملتے۔ اس سے ملو یہاں سے فائدہ ہوگا۔ اس سے نہ ملو کوئی فائدہ نہیں۔ اسے کچلتے ہوئے گزر جاؤ۔ اسے دھکیل کر اپنے لئے راستہ بناؤ۔ اس کے سر پر سوار ہو کر اونچے ہو جاؤ آپ لوگ اتنے گھٹیا کیوں ہیں۔'' وہ دل ہی دل میں سب سے مخاطب تھی۔ ڈیڈی کو اس نے جواب دینے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔

''میں اس جنہم میں انہیں کبھی بھی نہ بلاؤں۔ یہ رشتے اور محبتیں میں نے بڑی مشکلوں سے حاصل کئے ہیں میں آپ لوگوں کی خود غرضی کی بھینٹ نہیں چڑھنے دوں گی انہیں۔'' وہ عزم مصمم کر چکی تھی۔ سعود ڈیڈی سے کہہ رہا تھا۔

''اپنے آپ پر بڑا غرور ہے اسے۔ اپنے سامنے کسی کو کچھ نہیں سمجھتا۔''



سعود کی بات پر وہ اس کی طرف غور سے دیکھنے لگی تھی۔ ''کل اسی مغرور ہستی کے سامنے تم بچھ بچھ جا رہے تھے۔ تمہارا بس نہیں چل رہا تھا کہ اس کے آگے لیٹ جاؤ اور کہو کہ سر آیئے میرے اوپر سے گزر کر جایئے۔'' وہ دل ہی دل میں اس سے کہہ رہی تھی۔

''وہ جیسا بھی ہے تم لوگوں کی طرح منافق اور دغا باز نہیں ہے۔'' وہ ناشتے کی ٹیبل پر سے اٹھ گئی تھی۔

وہ اب انکل سے کوئی بات نہیں چھپاتی تھی انہوں نے اس سے وعدہ لیا تھا کہ وہ چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی ہر بات انہیں بتائے گی۔ کبھی بھی ان سے کچھ سیکرٹ رکھنے کی کوشش نہیں کرے گی اسی لئے وہ انہیں اپنے گھر والوں کے تازہ ترین رویے کے بارے میں بتانے کے لئے بے چین تھی۔ اسی بنا پر وہ اگلے روز شام کے وقت ان کے گھر چلی آئی تھی۔ گو آج چھٹی کا دن تھا لیکن اب اسے اویس کا سامنا ہونے پر کسی قسم کی شرمندگی محسوس نہیں ہوتی تھی۔ وہاں پہنچی تو پتہ چلا کہ انکل کے کچھ مہمان آئے ہوئے ہیں اور وہ ڈرائنگ روم میں بیٹھے ان کے ساتھ گپ شپ میں مصروف ہیں۔ وہ ان کے فارغ ہونے کا انتظار کرنے لگی۔ اکیلے لاؤنج میں بیٹھے بوریت ہونے لگی تو وہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آ گئی۔ ارادہ تو یہ تھا کہ اسٹڈی میں بیٹھ کر کسی کتاب کا مطالعہ ہی کر لیا جائے لیکن کوریڈور سے گزرتے سامنے والے کمرے سے آتی بڑی خوبصورت سی موسیقی کی آواز نے اسے اپنی گرفت میں لے لیا۔ گٹار پر بڑی خوبصورت سی دھن بجائی جا رہی تھی۔ بے اختیار آگے بڑھ کر اس نے کمرے کا دروازہ کھولا تو سامنے فلور کشن پر بیٹھے اویس کو دیکھ کر وہ حیران رہ گئی۔ وہ بڑے مگن سے انداز میں اپنے اردگرد سے غافل گٹار بجا رہا تھا۔ وہ فوراً ہی دروازے سے پلٹ جانا چاہتی تھی کہ اویس کی نظر اس پر پڑی۔

''اجالا''۔ وہ اسے دیکھ کر کچھ حیران ہوا تھا۔

''آئی ایم سوری مجھے پتہ نہیں تھا یہ آپ کا بیڈ روم ہے۔'' وہ اپنی بدتہذیبی پر شرمندہ ہوتی فوراً وہاں سے چلی جانا چاہتی تھی۔ کسی کے کمرے میں بغیر ناک کئے جانا یقیناً کوئی قابل تعریف فعل نہیں تھا۔ لیکن کمرے کا مالک اس کے اس طرح آنے کا برا مانے بغیر بولا۔

''کم آن اجالا یہ تم اتنی فارمل کب سے ہو گئی ہو اور اب اگر آ ہی گئی ہو تو اندر تو آ جاؤ۔'' وہ اندر آنے میں ہچکچاہٹ محسوس کر رہی تھی۔

''اب آ بھی چکو۔'' وہ دوبارہ اصرار کرنے لگا تو وہ کچھ شرمندگی کے عالم میں اندر آ گئی اور اس کے سامنے رکھے فلور کشن پر بیٹھ گئی۔

''تم کب آئیں۔ مجھے پتہ نہیں چلا۔'' وہ پوچھنے لگا تو وہ جواب میں بولی۔

''ابھی تھوڑی دیر ہوئی ہے۔ انکل کے مہمان آئے ہوئے ہیں۔ میں نے سوچا کہ سٹڈی میں کوئی کتاب پڑھ لوں گی۔ یہاں سے گزرتے ہوئے گٹار کی اتنی اچھی اور خوبصورت دھن کی آواز آئی تو میں ادھر آ گئی۔'' اس کی بات پر وہ ہنس پڑا۔

''تمہیں میوزک میں انٹرسٹ ہے۔'' وہ گٹار سائیڈ میں رکھتا اس سے بولا تو اس نے گردن ہلا دی۔

''ارے نہیں بھئی یہ تو بس یونہی شوقیہ بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ یہ میرا بچپن کا شوق ہے۔ کالج اور پھر

یونیورسٹی کے زمانے میں دوستوں کی محفل میں بیٹھ کر انہیں گٹار پر اپنی پسندیدہ دھنیں سنایا کرتا تھا۔ آج تو کئی سالوں کے بعد اچانک ہی میرا دل چاہا تو گٹار نکال کر خود کو چیک کر رہا تھا کہ مجھے بجانا یاد بھی ہے یا بھول گیا۔''

''لیکن آپ کا اسٹائل تو بڑا پرفیکٹ بلکہ پروفیشنل قسم کا ہے۔'' اس کی بات پر وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا تھا۔

''بس میری اور تعریف مت کرنا ورنہ میں واقعی آسمان پر چڑھ جاؤں گا۔'' جواب میں وہ بھی ہنس پڑی تھی۔ بے اختیار کھلکھلا کر ہنستے اس نے اسے پہلی بار دیکھا تھا۔

''تم ہنستے ہوئے اچھی لگتی ہو۔'' فوراً ہی اس کی ہنسی کو بریک لگ گئے تھے۔ وہ اس کی کنفیوژ سی شکل کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہنے لگا۔

''اگر یہاں تمہاری جگہ کوئی اور لڑکی ہوتی تو اپنی تعریف پر خوش ہوتی اور مجھے تھینکس تو ضرور ہی کہتی۔'' وہ اس سے نظریں ملانے کی ہمت نہیں کر پا رہی تھی۔ اس کا دل چاہا جلدی سے اٹھ کر یہاں سے بھاگ جائے۔ ''میں اتنے سال پڑھائی کی وجہ سے یہاں سے دور رہا لیکن ہمیشہ ہی سنتا تھا کہ ہمارے ہاں لڑکیاں بڑی شرمیلی اور مشرقی قسم کی ہوتی ہیں۔ جب واپس آیا تو پتہ چلا کہ دور کے ڈھول سہانے ہوتے ہیں۔ ہمارے ہاں کی لڑکیوں نے تو یورپ اور امریکہ کی خواتین کو بھی پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ ایسے میں تم جیسی چیزیں شاید اللہ تعالیٰ نے مثال دینے کے لئے چھوڑ دی ہیں۔'' وہ اس کے چہرے پر نظریں جمائے ہوئے بول رہا تھا۔

''ویسے تم ہو کیا چیز۔ مجھے تو تم چودہویں یا پندرہویں صدی کی کوئی بھٹکی ہوئی روح معلوم ہوتی ہو۔ اس زمانے میں تمہارا کیا کام؟'' اس کی بات پر وہ کچھ ناراض سے لہجے میں بولی۔

''میں نے آپ سے اپنے بارے میں کوئی رائے تو نہیں مانگی۔ میں جیسی ہوں ٹھیک ہوں۔'' وہ اس کی ناراضگی کو خاطر میں لائے بغیر کہنے لگا۔

''پاپا جانی مجھ سے کہہ رہے تھے کہ میں جان کر اجالا کے ساتھ الٹی سیدھی بکواس کرتا ہوں صرف اس کا شرم سے لال گلابی ہوتا چہرہ دیکھنے کے لئے۔''

وہ اس کی نظریں اپنے چہرے پر محسوس کر کے قصداً کمرے میں ادھر اُدھر نظریں دوڑانے لگی۔ وہ کچھ دیر بڑے غور سے اس کے چہرے کو دیکھتا رہا پھر ہنستے ہوئے کہنے لگا۔

''میں نے تمہاری کوئی خاطر مدارت تو کی نہیں۔ آخر تم پہلی مرتبہ میرے کمرے میں آئی ہو۔'' اس کے جواب کا انتظار کئے بغیر وہ اٹھا اور بیڈ روم ریفریجریٹر سے پیپسی کے دو کین نکال لایا۔ ایک اس کے ہاتھ میں پکڑا کر دوسرا خود لے کر بیٹھ گیا۔ اپنے سامنے رکھی ڈرائی فروٹس کی پلیٹ بھی اس کی طرف کھسکا دی ''لو۔ آؤ میں تمہیں اپنی پسندیدہ دھن سناؤں؟'' وہ صرف اپنے گلے پڑے شرمیلے پن کا لیبل اتارنے کے لئے گردن ہلا گئی۔ وہ دو تین گھونٹ میں پیپسی ختم کرتا گٹار اٹھا کر بجانے لگا اور جس وجہ سے وہ کھینچی ہوئی اس کمرے تک چلی آئی تھی وہ کچھ ایسی بے جا بھی نہیں تھی۔ وہ اتنا اچھا گٹار بجا رہا تھا کہ وہ بڑی دلچسپی اور شوق سے گٹار بجتا سنتی رہی اس نے اپنی پسندیدہ دھن مکمل بجا لی تو وہ بے اختیار بول اٹھی۔

''بہت خوب۔''



''تمہیں اچھا لگا۔'' وہ مسکراتے ہوئے پوچھنے لگا۔

''بہت اچھا۔'' وہ کھلے دل سے تعریف کر گئی۔ وہ کچھ کہے بغیر ایک اور دھن بجانے لگا۔ وہ خاموشی سے بیٹھی گٹار کے تاروں کو چھوتے اس کے ہاتھوں کو دیکھ رہی تھی۔ وہ پوری طرح کھوئی ہوئی اسے سن رہی تھی۔

''تمہیں کس قسم کا میوزک پسند ہے؟'' وہ دوسری دھن بجا چکا تو اس سے پوچھنے لگا۔

''مجھے آپ کی طرح میوزک کی زیادہ سمجھ تو نہیں ہے لیکن بس جو بھی کانوں کو اچھا لگے۔ تیز تیز اچھلتے کودتے گانے مجھے اچھے نہیں لگتے۔ سلو اور لائٹ میوزک اچھا لگتا ہے۔'' وہ اپنی پسند بتانے لگی۔

''اچھا تمہارے فیورٹ گلوکار کون کون ہیں۔'' اس کی بات پر وہ فوراً بولی۔

''پاکستانی سنگرز میں مجھے نیرہ نور اور جنید جمشید بہت پسند ہیں۔''

''چلو تو پھر تمہیں تمہارے فیورٹ سنگرز کا کچھ سناتے ہیں۔'' وہ یوں بول رہا تھا جیسے وہ بطور خاص صرف اس کا گٹار سننے یہاں آئی تھی اور وہ خود بھی بڑی فرصت کے ساتھ سنانے کے لئے کب سے تیار بیٹھا تھا۔ پھر وہ جنید جمشید کا ''اعتبار بھی آ ہی جائے گا۔ چلو تو سہی'' بجانے لگا۔ اس کے بعد ''تیرے لئے ہے میرا دل میری جان۔'' بجانے لگا۔ وہ بڑی محویت کے ساتھ اس کے ردھم میں کھوئی ہوئی تھی جب دروازے پر دستک ہوئی۔ اویس نے گٹار روک کر ''یس کم ان'' کہا تو اخلاق اندر آ گیا۔ اس پر نظر پڑی تو کہنے لگا۔

''صاحب اور میں دونوں مل کر آپ کو پورے گھر میں ڈھونڈ رہے تھے۔ اب میں اویس بھائی سے آپ کا پوچھنے آیا تھا۔'' اس کی بات سن کر وہ فوراً کھڑی ہو گئی۔

''انکل کے مہمان چلے گئے۔''

''جی کب کے اب تو وہ ہم لوگوں کو ڈانٹتے ڈپٹتے آپ کو تلاش کر رہے ہیں۔'' وہ دانت نکال کر بولا۔ وہ جلدی سے کمرے سے باہر نکل آئی۔ انکل سامنے سے آتے ہوئے نظر آئے تو ان کی طرف چلی آئی۔

''کہاں غائب ہو گئی تھیں۔ میں پریشان ہو گیا کہ اجالا آخر مجھ سے ملے بغیر اور کچھ کہے بغیر کیسے چلی گئی۔'' وہ اپنے اتنی دیر تک وہاں بیٹھنے پر کچھ شرمندگی محسوس کرتے ہوئے کہنے لگی۔

''میں یہیں تھی۔''

''یہیں کہاں تھیں یہ بھی تو بتاؤ۔''

''آپ تو اپنے مہمانوں میں مصروف تھے اور میں آپ کی لاڈلی کو کمپنی دے رہا تھا۔'' اس نے اپنے پیچھے اویس کی آواز سنی۔ انکل اسے دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہنے لگے۔

''کمپنی کس طرح دے رہے تھے لطیفے تو تمہیں آتے نہیں اور باتیں تم اتنی بور کرتے ہو کہ وہ میں ہی بمشکل برداشت کرتا ہوں۔''

''پوچھ لیں اس سے۔ بتاؤ اجالا میری کمپنی بور ہے۔'' وہ اسے درمیان میں گھسیٹنے لگا تو وہ انکل سے کہنے لگی ''نہیں انہوں نے مجھے بالکل بھی بور نہیں ہونے دیا۔'' آخر اس نے اتنی دیر تک کسی پروفیشنل گٹار بجانے والے کی طرح اسے لائیو اپنے شو سے محظوظ کیا تھا وہ اس کی برائی کیسے کر سکتی تھی۔

"تم اس کی کچھ زیادہ ہی فیور نہیں کرنے لگیں۔" انکل نے اسے بغور دیکھتے کہا تو وہ کچھ دیر پہلے سنے گئے کمنٹس کو بھلائے دوبارہ کچھ نروس سی ہوگئی۔ صحیح کہتی ہے دعا میں کسی مڈل کلاس بلکہ لوئر مڈل کلاس گھرانے کے لئے بڑی سوٹ ایبل تھی۔ وہ خود کو برا بھلا کہہ رہی تھی

"حق بات آپ کو فیور لگ رہی ہے۔ وہ بچی ہے اس لئے سچائی کا ساتھ دے رہی ہے۔" اسے مشکل میں پڑتا محسوس کر کے وہ فوراً میدان میں اتر آیا۔

"اوہو تو آپ بھی......" انکل کی بات پر اویس تو بڑی بے فکری سے ہنس پڑا تھا جبکہ وہ ان آؤٹ اسپوکن دادا پوتا کے بیچ سینڈوچ بنی کھڑی تھی۔

"چلو نیچے لاؤنج میں چل کر بیٹھتے ہیں پھر آرام سے باتیں کریں گے۔" وہ اب مزید اسی طرح کی باتیں سننا نہیں چاہتی تھی لیکن اس طرح اٹھ کر جا بھی نہیں سکتی تھی اس لئے نیچے ان لوگوں کے ساتھ آکر بیٹھ گئی اویس کو اپنے کسی دوست سے ملنے جانا تھا سو وہ پانچ دس منٹ بعد ہی ایکسکیوز کرتا چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد انکل بھی اپنی معنی خیز گفتگو سے باز آگئے تو اس نے سکون کا سانس لیا اور انہیں اپنی آمد کی وجہ بتانے لگی۔

☆☆☆

وہ تھکی ہاری ابھی ابھی گھر پہنچی تھی۔ ان دنوں فائنل ایئر کے تھیسس ڈیپلے کی وجہ سے وہ بہت مصروف تھی۔ اس وقت بھی شام کے چھ بجے اس کی واپسی ہوئی تھی۔ وہ سیڑھیاں چڑھتی اپنے کمرے میں جا رہی تھی جب اس نے اپنے پیچھے دعا کی آواز سنی۔

"اجالا تمہارا فون ہے۔" وہ لاؤنج میں کھڑی ریسیور ہاتھ میں لئے اس سے بولی تو وہ واپس سیڑھیاں اتر کر لاؤنج میں آگئی۔ دعا ریسیور اس کے ہاتھ میں پکڑا کر وہیں لاؤنج میں بیٹھ کر میگزین دیکھنے لگی۔ اس نے ریسیور کان سے لگایا تو دوسری طرف سے آتی اویس کی آواز کو سن کر وہ حیران رہ گئی۔

"آپ تو نیویارک گئے ہوئے تھے۔"

"ساری زندگی کے لئے نہیں گیا تھا۔ آخر کار مجھے واپس بھی آنا تھا۔" وہ بڑا چڑ کر بولا تو وہ اس کے فون کرنے کی وجہ سوچتے ہوئے کہنے لگی۔

"سب خیریت تو ہے ناں انکل کیسے ہیں۔"

"آپ کے انکل آپ کی جدائی میں آہیں بھر رہے ہیں کہ میں نے اپنی لاڈلی کی شکل تین دن سے نہیں دیکھی۔ تم آج کل ہو کہاں۔" وہ ناراضی سے کہہ رہا تھا۔

"فائنل ایئر کے تھیسس ڈیپلے کی وجہ سے مصروفیت بہت زیادہ ہے۔ لیکن میری کل تو انکل سے فون پر بات ہوئی تھی۔" وہ اپنی مصروفیت کی وجہ بتانے لگی۔

"پانچ دن ہو گئے ہیں مجھے آئے ہوئے تمہیں اتنی توفیق بھی نہیں ہوئی کہ آکر خیریت ہی پوچھ لو۔" وہ اس کے شکوے پر ہنستے ہوئے بولی۔

"آپ کون سا دو سال بعد آئے ہیں۔ صرف دس دن میں تو آگئے ہیں اور اس طرح کے بزنس ٹورز تو آپ



کے مہینے میں پتہ نہیں کتنی بار ہوتے ہیں۔ اس میں خیریت پوچھنے والی کون سی بات ہے۔"

"تم بس میرا دل جلایا کرو۔ کل پوری شام یہ سوچ کر کہیں نہیں گیا کہ شاید محترمہ آجائیں۔ اچھا دیکھو میں تمہارے لئے دو چار چیزیں لایا تھا۔ تم نے تو نہ آنے کی قسم کھائی ہے شاید اسی لئے میں ڈرائیور کے ہاتھ وہ چیزیں بھجوا رہا ہوں۔" وہ خفگی بھرے انداز میں بولا تو وہ اس کے اپنائیت بھرے شکوہ شکایت پر کچھ حیرت زدہ ہوتی ہوئی بولی۔

"آپ نے خوامخواہ تکلیف کی۔" وہ اس کی بات کاٹتا ہوا غرایا۔

"میں نے اس کی کیا ضرورت تھی اور آپ کو زحمت ہوئی جیسی باتیں سننے کے لئے فون نہیں کیا تھا صرف یہ بتانے کے لئے فون کیا ہے وہ چیزیں قبول کر کے میرے اوپر احسان عظیم کر دو۔ خدا حافظ" وہ اپنی بات مکمل کرتے ہی فون رکھ چکا تھا وہ بھی جواب میں ایک گہری سانس لیتی ہوئی فون رکھ کر پلٹنے لگی تو دعا میگزین سے نظریں ہٹا کر بولی۔

"یہ اویس وہی لودھی گروپ آف انڈسٹری والا ہی ہے ناں۔" وہ اس کی بات پر ہنستے ہوئے بولی۔ "کمال ہے یہ اویس اتنی مشہور و معروف شخصیت کب سے ہو گیا کہ لوگ اسے نام سے پہچاننے لگے۔" دعا اسکی بات نظر انداز کر کے کہنے لگی۔

"کیا اسی کو ڈنر پر انوائٹ کرنے کی بات ڈیڈی کل تمہیں یاد کروا رہے تھے۔" ڈیڈی نے اس روز کے بعد دو تین مرتبہ اسے یاد دہانی کروائی تھی کہ وہ ان لوگوں کو کھانے پر بلائے۔ اس نے دعا کی بات پر سر ہلا دیا "وہ تو بڑا مغرور سا بندہ ہے۔ تمہارے ساتھ اس کے کس قسم کے تعلقات ہیں۔" وہ اس کی طرف بڑے غور سے دیکھتے ہوئے پوچھنے لگی۔

"ہم اچھے دوست ہیں۔" اس نے کچھ اور بھی کہنا چاہتی تھی کہ اسی وقت ملازم ایک شوپر ہاتھ میں لئے اس کی طرف آتا نظر آیا تو چپ ہو گئی۔ وہ اس کے ہاتھ سے بیگ لیتی اپنے کمرے میں آگئی۔ اس کی بھیجی ہوئی تمام چیزیں بستر پر پھیلائے وہ سوچ رہی تھی کہ کیا میں اتنی اہم ہوں کہ کوئی مجھے یاد رکھے۔ اپنی مصروفیت میں بھی اسے میرا دھیان رہے۔ اس نے کہیں پڑھا تھا کہ "اہم ہونا خوبصورت ہے، خوبصورت ہونا اہم نہیں" اور آج اس جملے کا مطلب اس کی سمجھ میں مکمل طور پر آ گیا تھا۔ کیا میں بھی کسی کے لئے اسپیشل ہو سکتی ہوں۔ وہ شخص جو اپنے آگے اچھے اچھوں کو خاطر میں نہیں لاتا اسے میری پروا ہے۔ انکل آپ نے بالکل ٹھیک کہا تھا کہ زندگی اگلے موڑ پر میرے لئے بہت سی خوشیاں لئے کھڑی ہے۔ اس وقت میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ میری خوشیوں کا ہر در آپ ہی کے گھر میں کھلتا ہے۔ مجھے شاید اب زندگی میں وہ سب کچھ ملنے والا ہے جو میں چاہتی تھی سچی محبت، خلوص اور اپنائیت۔"

اس نے اپنی زندگی کی چھبیس سال محبتوں کی تلاش میں گزارے تھے اور اب اچانک ہی اس پر چاروں طرف سے محبتوں اور چاہتوں کے پھول برسنے لگے۔ انکل کی شفقت اور محبت کے ساتھ ساتھ ایک بالکل ہی مختلف قسم کی محبت سے وہ پہلی بار روشناس ہوئی تھی۔

☆☆☆

اگلے روز وہ اپنی تمام تر تھکن اور مصروفیت کے باوجود ان کے گھر چلی آئی تھی۔ وہ کسی ڈنر میں گیا ہوا تھا۔ کچھ دیر انکل سے گپ شپ لگا کر وہ اس کے لئے اپنے ہاتھوں سے بنایا ہوا تھینک یو کا کارڈ اس کے کمرے میں جا کر میز پر رکھ آئی تھی۔

ناشتے کی میز پر وہ تمام گھر والوں کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی جب حمید نے اسے بتایا کہ اس کا فون ہے۔ وہ مسکراتی ہوئی کرسی پر سے کھڑی ہوگئی۔ فون اٹینڈ کئے بغیر بھی وہ جانتی تھی کہ دوسری طرف کون ہے۔ اس کے ہیلو کے جواب میں وہ ہنستے ہوئے کہہ رہا تھا۔

''تمہارے Thanks کا Thanks۔'' اس کی بات پر وہ بھی ہنس پڑی تھی ''رات کو میں دیر سے آیا تھا ورنہ اسی وقت تمہیں فون کرتا۔ ابھی بھی آفس جانے کی تیاری کرنے کے ساتھ ساتھ تمہیں فون کر رہا ہوں۔ کیا تم یقین کرو گی کہ میں اس وقت ٹائی باندھتا ہوا تم سے بات کر رہا ہوں۔'' اس بات پر وہ حیرت سے بولی۔

''ایک ہاتھ سے ٹائی باندھ رہے ہیں؟''

''نہیں باندھ تو دونوں ہاتھوں سے رہا ہوں۔ موبائل میں نے کندھے کے سہارے کان سے لگایا ہوا ہے۔'' وہ اپنی کیفیت کا خود ہی مزہ لیتے ہوئے بتا رہا تھا۔

''چیک کر لیجئے گا کہ کہیں بات کرنے میں ناٹ صحیح نہ بنی ہو اور آفس پہنچتے پر آپ کی خوبصورت سی سیکرٹری صحیح ٹائی نہ باندھنے پر آپ کے اوپر ہنسنے لگے۔'' وہ شرارتی انداز میں بولی تو وہ کہنے لگا۔

''تمہیں کیسے پتہ چلا کہ میری سیکرٹری بہت خوبصورت ہے۔'' بڑا سنجیدہ سا لہجہ تھا۔

''میں نے صرف خوبصورت کہا تھا۔ بہت کا اضافہ آپ نے خود کیا ہے۔'' وہ اس کی بات پر قہقہہ لگا کر ہنس پڑا تھا۔

''اچھا میں اپنے جملے میں سے لفظ بہت کو ہٹا رہا ہوں۔ وہ صرف خوبصورت ہے۔'' اسی وقت اس نے دوسری جانب اخلاق کی آواز سنی تھی وہ اسے ناشتے کے لئے بلانے آیا تھا۔

''پاپا جانی ناشتے پر میرا انتظار کر رہے ہیں اس لئے خدا حافظ۔'' وہ عجلت بھرے انداز میں بولا تو وہ بھی خدا حافظ کہہ کر فون بند کرنے لگی کہ اچانک وہ بول پڑا تھا۔

''کل سنڈے ہے اور تم نے کل ہر قیمت پر گھر آنا ہے اور اگر تم نہیں آئیں تو میں تم سے اچھی طرح سمجھ لوں گا۔'' اس کی دھمکی پر وہ مسکراتے ہوئے بولی تھی۔

''دیکھوں گی اگر ٹائم ملا تو آؤں گی۔'' پھر اس کا جواب سنے بغیر اس نے لائن منقطع کر دی تھی۔

''کس کا فون تھا؟'' وہ واپس ٹیبل پر آئی تو دعا اس سے پوچھنے لگی۔ باقی تمام لوگ ناشتہ کر کے اٹھ چکے تھے۔ اسے یہ بلاوجہ کی پوچھ کچھ پسند نہ آئی۔ جب میں ان لوگوں کے معاملات میں مداخلت نہیں کرتی تو انہیں بھی کوئی حق نہیں پہنچتا کہ میرے ذاتی معاملات میں انوالو ہوں۔

''اویس کا تھا۔'' اس نے اپنی ناگواری چھپانے کی کوشش نہ کی تھی اسی لئے لہجہ بڑا روڈ اور بدتمیز سا تھا۔

''تم اسے پسند کرتی ہو؟'' دعا نے آملیٹ کھاتے ہوئے پوچھا تو وہ بڑے غصے سے بولی۔

''میرا اس سے جو بھی تعلق ہے۔ تمہیں اس کی فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ پلیز مائنڈ یور اون بزنس۔''

''تم خوامخواہ ناراض ہو رہی ہو۔ میں اسے پہلے سے جانتی ہوں اس لئے اتنا انٹرسٹ شو کر رہی تھی۔ وہ ہمارے انسٹیٹیوٹ میں ایکسٹینشن لیکچر دینے آیا ایک مرتبہ میں تب سے اسے جانتی ہوں۔ اس کی کزن فائزہ میری کلاس



فیلو ہے۔ وہ اکثر اس کے بارے میں باتیں کرتی رہتی ہے۔ پھر ایک مرتبہ سر علوی کی دی ہوئی اسائنمنٹ کے سلسلے میں کچھ گائیڈنس لینے کے لئے بھی میں اور فائزہ اس کے آفس گئے تھے۔ فائزہ بتا رہی تھی کہ اوپر اوپر سے بڑا لیا دیا اور سوبر نظر آتا ہے اندر سے ایک نمبر کا فلرٹ ہے یہ، اوپر سے دولت اور شکل صورت بھی خدا نے کچھ زیادہ ہی اچھی دے دی ہے اس لئے اسے خوب اچھی طرح کیش کراتا ہے۔'' وہ اس کی بات کا بھی کوئی نوٹس لئے بغیر ناشتہ کرتی رہی تو وہ بھی چپ ہوگئی۔

''ان فائزہ صاحبہ کو اس نے منہ نہیں لگایا ہوگا اس لئے اس کے بارے میں الٹا سیدھا پروپیگنڈا کرتی پھر رہی ہیں۔'' اسکول جاتے ہوئے گاڑی ڈرائیو کرتے اس نے سوچا تھا۔ وہ اتنا ڈیسنٹ ہے اتنا کلچرڈ اور وہ کبھی ایسی کوئی حرکت نہیں کر سکتا۔ اس نے حتمی طور پر یہی سوچا تھا۔

☆☆☆

وہ ان کے گھر پہنچی تو دن کے گیارہ بج رہے تھے۔ انکل اور اویس دونوں ہی لاؤنج میں بیٹھے ٹی وی دیکھ رہے تھے۔ اویس اسے دیکھ کر بڑے بھرپور انداز میں مسکرایا تھا۔

''یہ سورج آج کدھر سے نکلا ہے۔ اتنی معروف شخصیت ہمارے گھر آئی ہے۔'' انکل نے اسے پیار کرتے ہوئے کہا۔

''پرسوں شام میں تو آئی تھی انکل آپ کی یادداشت کو کیا ہو گیا ہے۔''

''کل کیوں نہیں آئیں۔'' میں پارک میں بھی انتظار کرتا رہا۔ انہوں نے شکوہ کیا۔

''کل میں اتنے دنوں کی تھکن اتار رہی تھی۔'' وہ صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ٹی وی پر آتے کرکٹ میچ کو دیکھ کر اس نے برا سا منہ بنایا۔

''یہ کیا بور چیز دیکھ رہے ہیں آپ؟''

''ارے بڑا زبردست میچ آ رہا ہے۔ پاکستان اور ساؤتھ افریقہ کا فائنل ہے۔ پاکستان نے بڑا اچھا ٹارگٹ دیا ہے۔ دو سو نوے کا ٹارگٹ وہ مشکل ہی کر پائیں گے۔ اوپر سے پاکستان کا مضبوط باؤلنگ اٹیک۔'' انکل نے سکرین پر نظریں جمائے ہوئے کہا۔

''یہ مصیبت سارا سال ہی پیچھے پڑی رہتی ہے اور ہماری قوم کو تو کہیں کا نہیں چھوڑا اس کرکٹ فوبیا نے۔'' اس نے اپنی ناپسندیدگی کا واضح اظہار کیا۔

''تم لڑکیوں کے تو بڑے فیورٹ ہوتے ہی یہ کرکٹرز بلکہ تم ہی لوگ انہیں آسمان پر چڑھا کر کوئی خلائی مخلوق بنانے میں پیش پیش ہوتی ہو۔ میں نے کل ہی پڑھا کہ ایک بیچارے کرکٹر نے لڑکیوں کی فون کالوں سے تنگ آ کر پندرہویں دفعہ اپنا موبائل نمبر اور بیسویں دفعہ گھر کا فون نمبر تبدیل کروایا ہے۔'' اویس نے سکرین پر سے نظریں ہٹا کر اسے دیکھا۔

''صرف چند بیوقوف اور نیم پڑھی لکھی لڑکیوں کی حرکتوں کی وجہ سے آپ تمام لڑکیوں کو ایسا نہیں کہہ سکتے۔ زیادہ تر لڑکیاں پڑھے لکھے اور ذہین لوگوں کو اپنا آئیڈیل بناتی ہیں۔'' وہ خاصا برا مان کر بولی تھی۔

''یعنی میرے جیسوں کو۔'' وہ اپنی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ انکل ان دونوں کی بات چیت سے محظوظ ہوتے مسکرا رہے تھے۔

''بڑی خوش فہمی ہے آپ کو اپنے بارے میں۔'' سنجیدگی سے بولی۔

''پھر تمہاری ڈکشنری میں پڑھا لکھا اور ذہین کیسا شخص ہے؟''

وہ غصے سے بولا تو وہ اس کے غصے کو خاطر میں لائے بغیر کہنے لگی۔

''انکل جیسا، اس لئے کہ وہ خود کو ذہین پوز نہیں کرتے بلکہ وہ ہیں ہی ذہین۔'' اس کی بات پر انکل قہقہہ لگا کر ہنس پڑے تھے۔ ''بھئی میری بیٹی نے صبح صبح دل خوش کر دیا۔'' وہ اس کی بات کو خوب انجوائے کر رہے تھے۔ اسی وقت ساؤتھ افریقہ کا اوپنر آؤٹ ہو گیا تو انکل اور اویس دوبارہ ٹی وی کی جانب توجہ مبذول کر گئے۔ وہ کچھ بور ہو کر پاس رکھا اخبار اٹھا کر دیکھنے لگی۔ وہ دونوں بڑے انہماک سے میچ دیکھ رہے تھے۔ انکل سائیڈ میں رکھے سنگل صوفے پر بیٹھے تھے جبکہ وہ اور اویس برابر والے صوفے پر بیٹھے تھے۔ اس کے اور اویس کے درمیان ڈھیر سارے اخبارات رکھے ہوئے تھے۔ شاید اسے چھٹی والے دن بہت سے اخبارات کا مطالعہ کرنا اچھا لگتا تھا۔ وہ اخبار میں اپنے پسندیدہ صفحے پر موجود مختلف پزلز حل کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ وہ لفظ Preconceive کے Alphabet سے بننے والے دوسرے الفاظ بنانے کی کوشش کرنے لگی۔ بڑی کوششوں کے بعد بھی صرف پندرہ لفظ ہی بن پائے تو وہ اویس سے بولی۔

''Preconceive میں سے بننے والے کوئی الفاظ بتائیں۔''

''اپنے جینئس انکل سے پوچھو۔'' وہ اس کی طرف نظر ڈالے بغیر بولا تو وہ ہنستے ہوئے کہنے لگی۔

''آپ انکل سے جیلس ہو رہے ہیں؟'' وہ اس کی بات کے جواب میں دانت پیستا ہوا دھیمی آواز میں بولا۔

''تمہیں تو میں بعد میں بتاؤں گا۔'' انکل ان دونوں کی سرگوشیانہ گفتگو سے لاتعلق میچ دیکھنے میں مگن تھے۔ ان دونوں کی میچ میں اتنی دلچسپی دیکھ کر وہ وہاں سے کھڑی ہو گئی اور یونہی چہل قدمی کرتے ہوئے کچن تک آ گئی۔ یہاں آ کر خیال آیا بور ہونے سے بہتر ہے کچھ پکا لیا جائے۔ دوپہر کے کھانے کی تیاری کرتا شاہد جلدی جلدی کام نمٹانے کی کوشش کر رہا تھا۔ شاہد کو کچن سے فارغ کیا اور خود کچھ پکانے کے بارے میں سوچنے لگی۔ چکن کڑھائی کے لئے پیاز کاٹتے ہوئے وہ زور و شور سے آنسو بہا رہی تھی جب اویس کچن میں داخل ہوا۔

''کیا ہوا؟'' وہ ایک دم تشویش میں مبتلا ہو کر اس کی طرف بڑھا تھا۔

''کچھ نہیں ہوا، پیاز کاٹ رہی ہوں۔'' وہ شرٹ کی آستین سے آنسو صاف کرتے ہوئے بولی۔

''اتنے اسٹوپڈ کام کرنے کی ضرورت کیا ہے۔ چھوڑ دا سے۔'' وہ اس کے ہاتھ سے پیاز لے کر رکھنے لگا۔

''کیا ہے، خود تو میچ دیکھ رہے ہیں۔ میں اکیلی بور ہو رہی ہوں۔'' وہ ناراضگی سے بولی۔

''اچھا تم آؤ تو سہی۔ اب بور نہیں ہونے دوں گا۔ آؤ تمہیں Preconceive سے بہت سے لفظ بنواؤں۔'' وہ اسے اصرار سے چلنے کے لئے کہنے لگا۔

''اب میرا موڈ کھانا پکانے کا بن چکا ہے اور اب میں یہاں سے چکن کڑھائی پکا کر ہی نکلوں گی آپ جائیں۔''



وہ فیصلہ کن انداز میں بولی تو وہ کندھے اچکا کر اسے اس کے حال پر چھوڑ کر واپس لاؤنج میں چلا گیا۔ چکن چڑھ گئی تو وہ کل ہی ایک اٹالین شیف کی ٹی وی پر سکھائی گئی اٹالین اسٹائل کی سلاد بنانے لگی۔ لاؤنج سے تھوڑی دیر بعد انکل اور اویس کی آوازیں بھی آ رہی تھیں وہ میچ پر رواں تبصرہ کر رہے تھے۔

وہ تمام کاموں سے فارغ ہوئی تو دو بج رہے تھے۔ ان لوگوں کو تو شاید کرکٹ کی دھن میں کھانا، کھانا بھول گیا تھا لیکن خود اسے بڑی سخت بھوک لگ رہی تھی اس لئے جلدی جلدی کھانا، لگانا شروع کر دیا۔ کھانا لگ گیا تو انہیں بلانے کے لئے آ گئی ''کیا پک رہا ہے بھئی بڑی زبردست خوشبو آ رہی ہے۔'' انکل نے اسے دیکھ کر کہا۔

''آپ کھا کر بتائیے گا۔'' وہ باہر ہوتی ہوئی بارش دیکھ کر دروازے کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔ دو تین منٹ تک باہر کا نظارہ کرنے کے بعد ان سے بولی۔

''انکل مجھے بھوک لگ رہی ہے۔'' وہ اسے چمکارتے ہوئے کہنے لگے۔

''شاہد سے کہو کھانا لگانے کے لئے۔'' اس کی طرف دیکھے بغیر انہوں نے جواب دیا تو وہ بری طرح چڑ کر آگے بڑھی اور ٹی وی آف کر دیا۔ اس کی اس حرکت پر انکل ہنستے ہوئے کھڑے ہو گئے۔ اویس تو پہلے ہی اٹھ کر شاید ہاتھ دھونے جا چکا تھا۔ ڈائننگ ٹیبل پر کرسیاں سنبھال کر انکل نے حیرت کا اظہار کیا۔

''اتنی جلدی تم نے اتنی چیزیں بنا لیں یہ چکن کڑھائی، سلاد اور ویجی ٹیبل رائس۔''

''جی ہاں دیکھ لیں میں کتنی سگھڑ اور سلیقہ مند ہوں۔'' وہ اپنی تعریف کرنے لگی۔ اویس اس ستائش نامے سے بے نیاز اپنی پلیٹ میں سلاد ڈال کر کھانا شروع ہو گیا تھا۔ اس نے اور انکل نے بھی کھانا شروع کر دیا۔ اویس پلیٹ میں چاول ڈالنے لگا تو انکل اسے ٹوکتے ہوئے بولے۔

''سلاد اور لو بے چاری نے اتنی محنت سے تمہاری وجہ سے بنائی ہے۔'' ان کی آنکھوں سے جھانکتی شرارت اسے حسب معمول نروس کرنے کے لئے کافی تھی۔ اویس نے ایک نظر اس کے چہرے پر ڈالی اور ان سے بولا۔

''شکر ہے کچھ تو میرے لئے بھی ہے۔ ورنہ یہاں تو ہر بات انکل سے شروع ہو کر انکل ہی پر ختم ہو جاتی ہے۔'' اس کی بات کے جواب میں ان کا قہقہہ بڑا بے ساختہ تھا۔

''اجالا کچھ جلنے کی بو نہیں آ رہی آس پاس سے؟'' انہوں نے اس گفتگو میں اسے بھی شامل کرنے کی کوشش کی۔ وہ ان دونوں کی نظریں اپنے چہرے پر مرکوز محسوس کر کے کچھ جھنجھلا گئی۔ ایک تو یہ ان دادا پوتے کی بہت بری عادت ہے کہ دونوں ہی بلا کے منہ پھٹ ہیں۔ ''جلنے کی نہیں بیک ہونے کی آ رہی ہے۔ میں اوون میں Brownies بیک ہونے کے لئے رکھ کر آئی ہوں۔'' اس نے اپنے چہرے کے تاثرات کو سنجیدہ بناتے ہوئے کچھ دیر پہلے کی معنی خیز فضا کا تاثر ختم کرنے کی کوشش کی۔ انکل بے اختیار ہنس پڑے تھے جبکہ اویس نے صرف مسکرانے پر اکتفا کیا تھا۔ کھانے سے فارغ ہو کر انکل نے اس سے کافی فرمائش کی۔ کافی اور براؤنیز ٹرے میں رکھ کر لائی تو وہ دونوں آپس میں کچھ بات چیت کر رہے تھے۔

براؤنیز چکھنے کے بعد انکل اس سے کہنے لگے ''تم اچھی طرح ہماری عادتیں خراب کروا دو۔ پہلے ہی شاہد کے پکائے ہوئے کھانے کچھ اتنے اچھے نہیں لگتے تھے لیکن اب تو برداشت سے باہر ہو گئے ہیں۔''

''آپ اگر معقول معاوضہ دینے کا وعدہ کریں تو میں شاہد کو کھانا پکانا سکھا کر آپ کا یہ مسئلہ حل کر سکتی ہوں۔''
اس نے جواب میں آفر کی۔

''اس مسئلے کا میں نے ایک اور حل سوچ رکھا ہے جس میں یہ معاوضے وغیرہ جیسی زحمت بھی نہیں اٹھانی پڑے گی۔'' انہوں نے سنجیدگی سے کہا۔ وہ سکون سے بیٹھی بغیر ان کی بات پر کوئی ردعمل ظاہر کیے کافی پیتی رہی۔ انکل اس کے سنجیدہ چہرے پہ نظر ڈال کر مسکرا دیئے۔ اویس بڑی خاموشی سے کافی کے سپ لے رہا تھا۔ اپنا کپ خالی کر کے وہ اٹھتے ہوئے بولی ''اچھا میں چلتی ہوں انکل۔''

''اتنی جلدی ابھی کچھ دیر تو اور رکو۔'' وہ اصرار کرنے لگے۔

''جلدی کہاں تین بج گئے ہیں۔'' وہ گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

''گاڑی لائی ہو؟'' انکل نے اس خیال سے پوچھ لیا کہ وہ اکثر پیدل بھی آجایا کرتی تھی۔

''نہیں! اتنا اچھا موسم ہو رہا تھا میں واک کرتے ہوئے آئی تھی۔'' اویس اس کی طرف دیکھتا ہوا کھڑا ہو کر بولا۔

''بارش ہو رہی ہے میں چھوڑ آتا ہوں۔'' وہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر شاید گاڑی کی چابی لینے اپنے کمرے میں گیا تھا۔ وہ اس کی آفر کے جواب میں دوبارہ انکل کے برابر میں بیٹھ گئی۔

''تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ کوئی بھی بات مجھ سے نہیں چھپاؤ گی۔'' انکل نے اسے مخاطب کیا تو فوراً بول پڑی۔

''میں نے آپ سے کوئی بات نہیں چھپائی۔''

''اچھا کھاؤ قسم کہ تم نے مجھ سے کوئی بات نہیں چھپائی۔'' اس کا دل بہت تیز دھڑکنے لگا تھا۔ انکل کے سامنے ایسی کسی بات کا اقرار کرنا اس کے لئے جان جوکھوں کا کام تھا۔ وہ اس کے چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے کچھ روٹھے لہجے میں بولے۔

''اگرچہ کہ یہ میرے دل کی دیرینہ خواہش تھی۔ مگر تم نے اسے مجھ سے سیکرٹ رکھ کر میرا دل دکھایا ہے۔''

''انکل پلیز ناراض مت ہوں۔'' وہ انہیں ناراض کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اس کے پریشان حال چہرے پر نظر پڑی تو کچھ نرم پڑتے ہوئے بولے۔

''اویس اچھا ہے ناں، سب سے اچھا۔'' اور جواب میں اس نے گردن ہلا دی تھی۔ اسی وقت وہ واپس آ گیا تھا۔ انکل کو خدا حافظ کہہ کر وہ اس کے ساتھ باہر نکلی تو بارش کچھ ہلکی ہو چکی تھی۔ وہ موسم کی خوبصورتی اور رعنائی محسوس کرتے ہوئے اس سے بولی۔

''اتنا اچھا موسم ہو رہا ہے۔ آپ رہنے دیں میں پیدل ہی چلی جاؤں گی۔'' وہ گاڑی کا لاک کھولتا ہوا اس کی طرف گھوما۔

''محترمہ یہ دسمبر کی بارش ہے۔ بیمار پڑنے کا زیادہ ہی شوق ہو رہا ہے۔''

''کوئی نہیں میں بیمار ہوتی۔ اس موسم کو انجوائے نہ کرنا اعلیٰ درجے کی بدذوقی ہے۔'' وہ اس کی تردید کرتی



پرزور انداز میں بولی تھی۔ ''آپ بڑے نازک مزاج ہیں۔ میں تو کبھی بارش میں بھیگ کر بیمار نہیں ہوئی۔'' اپنے لئے نازک مزاجی کے طعنے پر وہ ہنس پڑا تھا۔

''میں تو تمہاری وجہ سے کہہ رہا تھا۔ خیر جیسی تمہاری مرضی۔'' وہ گاڑی کا دروازہ واپس بند کرتا ہوا گیٹ کی طرف بڑھا۔ اس کے ساتھ وہ بھی گیٹ سے نکل آیا اور اس کی حیرت سے جواب میں بولا۔

''آخر مجھے ظاہر بھی تو کرنا ہے کہ میں نازک مزاج نہیں ہوں۔'' اس کی بات پر وہ ہنس پڑی۔ بارش میں بھیگتے ہوئے قدم سے قدم ملائے وہ دونوں خاموشی سے چل رہے تھے۔ پاس سے گزرتے Walls والے کو دیکھ کر وہ بولی۔

''اتنی سردی میں آئس کریم کون کھائے گا۔''

''اسی موسم میں تو آئس کریم کھانے کا مزہ ہے۔'' اس نے فوراً تردید کی تھی۔ پھر اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''آئس کریم کھاؤ گی؟'' اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر اس نے Walls والے کو روک کر ایک Cornetto خرید لی۔ وہ خاموشی سے اسے دیکھ رہی تھی۔

''گھر سے چلتے ہوئے والٹ لینا یاد ہی نہیں رہا۔ افسوس میری جیب میں صرف اتنے روپے ہی تھے کہ ایک ہی آئس کریم خریدی جا سکے۔ وہ اس کے غربت بھرے بیان سے متاثر ہوتے بولی۔

''میرے پاس ہیں پیسے۔ ایک اور لے لیں۔''

''اب میں اتنا گیا گزرا بھی نہیں ہوں کہ تمہیں پچیس تیس روپے کی آئس کریم بھی تمہارے ہی پیسوں سے کھلواؤں۔'' وہ کچھ برا مان کر بولا۔ پھر کون اس کے ہاتھ میں پکڑاتا ہوا بولا۔

''لو کھاؤ۔'' اس کے ہاتھ سے کون لے کر وہ ایسے ہی چلتی رہی تو وہ ٹوک کر بولا۔

''تم کھا کیوں نہیں رہی۔ پگھل جائے گی۔'' اس نے ریپر اتار کر کون کھانی شروع کی۔ وہ اپنے چہرے پر سے بارش کا پانی صاف کرتا ہوا بولا۔

''یہ صرف آپ کے لئے نہیں خریدی ہے۔ اسے ہم دونوں نے شیئر کرنا ہے۔ اتنی دیر سے انتظار کر رہا ہوں کہ اب مجھے دو گی اب دو گی۔'' اس کی بات پر وہ ہونق ہو کر اس کی شکل دیکھنے لگی جبکہ وہ اس کے ہاتھ سے کون لے کر آرام سے کھانے لگا۔ دو تین بائٹس لے کر کون واپس اس کے ہاتھ میں پکڑانے لگا تو وہ کچھ جھجک کر بولی۔

''آپ کھا لیں میرا تو ویسے بھی زیادہ دل نہیں چاہ رہا تھا۔'' اس کی اس حرکت پر وہ بہت عجیب سا محسوس کر رہی تھی۔ وہ کوئی جواب دیئے بغیر کون اس کی طرف بڑھائے چلتے چلتے رک گیا۔ اسے رکتا دیکھ کر وہ بھی رک گئی۔ اس کے مسلسل بڑھے ہوئے ہاتھ کو دیکھ کر اس نے خاموشی سے کون پکڑ لی تو وہ دوبارہ چلنے لگا۔

''مجھے کوئی چھوت کی بیماری نہیں ہے جو میرا جھوٹا کھانے سے آپ کو بھی لگ جائے۔'' اس کے نہ کھانے پر وہ چڑ کر بولا۔

اس کی ناراضگی سے ڈر کر اس نے ایک بائٹ لے لی۔ تھوڑی دیر بعد اویس نے خود ہی اس کے ہاتھ سے

کون لے لی اور تھوڑی سی کھا کر واپس اس کے ہاتھ میں پکڑائی تو سر جھکا کر بنا کچھ کہے اس نے کون لے لی۔ سارے راستے یہی تماشا ہوتا رہا۔ اس کے ہاتھ سے کون لے کر تھوڑی سی کھاتا اور پھر اسے پکڑا دیتا۔ وہ مجبوراً سر جھکا کر ایک آدھ بائٹ لے لیتی۔ آج کا موسم انجوائے کرنا اسے خاصا مہنگا پڑا تھا۔ اس کے گھر کی سڑک پر مڑے تو اللہ اللہ کر کے کون ختم ہوئی اور اس نے دل ہی دل میں شکر ادا کیا۔ وہ چپ چاپ سر جھکائے چل رہی تھی۔ گیٹ کے سامنے رکے تو وہ اس سے بولا۔

''چیونگ گم کھاؤ گی؟'' وہ فوراً انکار میں گردن ہلا گئی۔ کیا پتہ اسے بھی شیئر کرنا پڑے۔ وہ اس کے فوراً انکار کرنے پر ہنس پڑا تھا۔ ''نہیں اسے شیئر نہیں کرنا۔ وہ پوری کی پوری تمہاری ہے۔'' پھر اس کے جواب کا انتظار کئے بغیر اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر اپنا والٹ نکالا تو وہ ساری شرم و حیا بالائے طاق رکھ کر چلائی۔

''آپ نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا۔''

وہ مسکراتے ہوئے سر ہلا گیا۔ ''آئندہ میں آپ کی کسی بات کا یقین نہیں کروں گی۔'' وہ اس کے ہاتھ میں پکڑی چیونگم کو نظر انداز کرتے گیٹ میں گھسنے لگی تو وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر بولا۔

''تمہاری خاطر اتنی دور تک پیدل چل کر بھیگتا ہوا آیا ہوں اور تم......'' وہ اس کی بات کاٹ کر ناراض لہجے میں بولی۔

''میں انکل سے آپ کی شکایت کروں گی۔'' اس کے بے ساختہ قہقہے نے اپنی حماقت کا احساس دلایا تو وہ بغیر کچھ کہے گیٹ میں گھس گئی۔

☆☆☆

رات وہ سونے کے لئے لیٹنے لگی جب دستک دے کر دعا اندر چلی آئی۔ دعا کو اپنے کمرے میں آتا دیکھ کر وہ بری طرح حیران ہوئی تھی۔ دعا کے اور اس کے کبھی بھی دوستانہ تعلقات نہیں رہے تھے۔ گو وہ آپس میں لڑی بھی نہیں تھیں مگر ان کے بیچ صرف اجنبیت اور غیریت کا رشتہ تھا۔

''تم سو تو نہیں رہی تھیں؟'' وہ اس کے سامنے کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

''ہاں! اب سوچ رہی تھی کہ سو جاؤں لیکن خیر تم بتاؤ کوئی کام ہے مجھ سے؟'' وہ اپنی حیرت چھپانے کی کوشش کئے بغیر بولی۔ دعا بڑے غور سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اسے دعا کے اس طرح دیکھنے کے انداز پر کچھ کوفت محسوس ہونے لگی۔ وہ اپنی آنکھیں اس پر جمائے پتہ نہیں اس کے چہرے پر موجود کیا چیز پڑھ لینا چاہتی تھی۔

''تمہاری نالج میں یقیناً یہ بات ہوگی کہ اویس کا پرپوزل آیا ہے تمہارے لئے۔'' دعا کے اس جملے پر اس کا دل بڑی بے ترتیبی سے دھڑکنے لگا۔ بے اختیار اس کا سر جھک گیا تھا۔ اسے دعا کے سامنے کسی سولہ سترہ سال کی کمر عمر دوشیزہ کی طرح شرمانا لجانا اچھا نہیں لگ رہا تھا لیکن یہ خبر اتنی اچانک تھی کہ وہ اپنے تاثرات چھپا نہیں پا رہی تھی۔ دعا بڑی سنجیدگی کے ساتھ اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''تمہارے تاثرات سے تو ایسا لگ رہا ہے جیسے تمہیں اس بات کا پہلے سے پتہ نہیں تھا۔'' وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔



''ہاں! انکل نے مجھ سے اس بارے میں کچھ بھی نہیں کہا تھا۔ کب آئے تھے انکل۔'' وہ اپنی عادت کے برخلاف اپنے گھر کے کسی فرد کے ساتھ تفصیلی گفتگو کرنے کے موڈ میں نظر آ رہی تھی۔

''آج آئے تھے شام میں۔ تم اس وقت گھر پر نہیں تھیں۔ ممی ڈیڈی تو اس پرپوزل پر بہت خوش ہیں۔ جسے صرف ڈنر پہ انوائٹ کرنے کے لئے ڈیڈی اتنے بے تاب تھے اس سے رشتے داری پر تو وہ خوشی سے پاگل ہو رہے ہیں۔'' وہ اپنی خوشی میں مگن دعا کے استہزائیہ انداز پر کچھ خاص توجہ نہ دے سکی۔

''بڑے بے ایمان ہیں انکل، کل مجھے ملے تھے اور بتایا بھی نہیں کہ آج آنے والے ہیں اگر پتہ دیتے تو میں گھر پر رک جاتی۔'' وہ چہرے پر حیا آلود تبسم لئے سوچ رہی تھی۔ دعا کچھ دیر خاموشی سے بیٹھی اس کی طرف دیکھتی رہی پھر بولی۔

''پتہ نہیں مجھے یہ بات تمہیں بتانی چاہئے یا نہیں لیکن میں تمہیں اس طرح بیوقوف بنتا ہوا مزید نہیں دیکھ سکتی۔ تم مانو یا نہ مانو آفٹر آل تم میری بہن ہو اور کوئی تمہاری انسلٹ کرے یہ میں برداشت نہیں کر سکتی۔'' دعا کے سنجیدہ لہجے پر وہ پہلی بار چونکی تھی۔ اس کے استفہامیہ انداز پر وہ کچھ افسوس بھرے انداز میں بولی۔

''میں نے تمہیں پہلے بھی بتانا چاہا تھا لیکن تم نے میری بات سننا گوارا نہیں کی تھی۔ اب بھی تمہاری مرضی ہے چاہو تو میری بات پر یقین کرو چاہو تو مت کرو۔ میرے اندر کی بے چینی تو ختم ہو جائے گی کہ میں نے تمہیں اصل حالات سے آگاہ نہیں کیا۔'' وہ اس کے انداز پر اندر ہی اندر کچھ خائف ہوتی ہوئی بولی۔

''تم کیا کہنا چاہتی ہو صاف صاف کہو۔ پہیلیاں بجھوانے کی کوشش مت کرو۔'' دعا کی اس بات پر اس کا غصے کے مارے برا حال ہو گیا۔

''جو بیوقوف بناتے ہیں غالباً وہ گھر پر رشتہ نہیں بھجواتے۔'' وہ بڑے طنزیہ انداز میں بولی تھی۔

''اگر تمہیں اسی قسم کی بکواس کر کے مجھے اویس سے بدظن کرنے کی کوئی بیہودہ کوشش کرنی ہے تو پلیز اپنا وقت برباد مت کرو۔'' اس کی بات پر دعا کرسی پر سے کھڑی ہو گئی۔

''یہ رشتہ اس کی مرضی سے نہیں آیا تمہاری طرح اس کے گرینڈ فادر کو بھی یہ غلط فہمی ہو گئی تھی کہ وہ تمہیں پسند کرتا ہے۔ آج ان کے آنے کے بعد میں اویس سے ملی اور اس سے بہت لڑی تھی کہ تمہیں ساری دنیا میں فلرٹ کرنے کے لئے میری ہی بہن ملی تھی تو وہ کہنے لگا کہ اسے اس پرپوزل کا کچھ نہیں پتہ تھا اور وہ تو صرف مجھے جلانے کے لئے تم سے اتنی بے تکلفی سے ملتا تھا۔ میں نے تمہیں بتایا تھا ناں کہ میں اسے پہلے سے جانتی ہوں۔ جب ہی ہماری اچھی خاصی انڈرسٹینڈنگ ہو گئی تھی۔ پھر مجھے اس کے بارے میں فائزہ سے اور کچھ دوسرے لوگوں سے اس قسم کی معلومات ملیں کہ وہ فلرٹ ہے تو اس سے دور ہو گئی۔ اس نے مجھ سے ملنے اور بات کرنے کی بہت کوشش کی لیکن میں نے انکار کر دیا۔ انہیں دنوں میں نے تمہیں اس کے ساتھ فون پر بات کرتے دیکھا تو میں حیران رہ گئی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ تم میں اتنی دلچسپی کیوں لے رہا ہے۔ تمہیں گفٹ بھجوائے جا رہے ہیں، تمہیں بارش میں بھیگتے ہوئے یہاں چھوڑ کر جایا جا رہا ہے لیکن میں چپ رہی۔ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی تھی کہ وہ ایسا مجھے جیلس کرنے کے لئے کر رہا ہے۔ آج پرپوزل والی بات پر میں بہت ہی غصے میں اس سے ملی تو وہ پرپوزل کے بارے میں لاعلمی کا اظہار کر کے کہنے لگا کہ

اسے ایک طلاق یافتہ لڑکی جسے اس کے کزن نے چھوڑ دیا ہو سے کوئی دلچسپی نہیں اور وہ اپنے گرینڈ فادر کو فورس کرے گا کہ وہ اس پرپوزل کو واپس لیں اور میرے لئے بات کریں۔ دونوں دادا پوتے میں اچھا خاصا جھگڑا ہوا ہے۔ دونوں میں...... خاصی بحث ہوئی ہے اس بات پر۔ پتہ نہیں اب یہ جھگڑا کیا صورت اختیار کرے۔" دعا بڑے پرسکون انداز میں اپنی بات مکمل کر کے اس کی طرف ایک سرسری سی نگاہ ڈالتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔

وہ کچھ گم سم سی سکتے کی کیفیت میں بیٹھی ہوئی تھی۔ "وہ کبھی بھی میرے بارے میں اس طرح کی بات نہیں کہہ سکتا۔ "طلاق یافتہ لڑکی جسے اس کے کزن نے چھوڑ دیا ہو۔" دعا کے منہ سے سنے گئے ان تکلیف دہ الفاظ کے بارے میں وہ کبھی بھی ماننے کے لئے تیار نہ تھی کہ ایسی بات وہ کہہ سکتا ہے۔ اس کی آنکھیں کبھی بھی جھوٹ نہیں بول سکتیں۔ میں نے ان میں ہمیشہ اپنے لئے عزت اور محبت دیکھی ہے۔ کچھ جذبے ایسے ہوتے ہیں جنہیں کسی اظہار کی ضرورت نہیں ہوتی جو بنا کہے سمجھ لئے جاتے ہیں۔ اگر اس نے مجھ سے براہ راست محبت کا اظہار نہیں کیا تو کیا میں بغیر کہے اتنا بھی نہیں سمجھ سکتی کہ وہ مجھ سے محبت کرتا ہے۔ میں اس کے لئے بہت اہم ہوں۔ دعا کی کسی بھی بکواس پر میں ہرگز بھی یقین نہیں کروں گی بلکہ مجھے اس کی اتنی فضول باتوں پر خاموشی اختیار کرنے کے بجائے اس کا دماغ ٹھیک کر دینا چاہئے تھا۔ آخر کیا سمجھ کر وہ مجھے اویس کے بارے میں بدگمان کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ سونے سے پہلے تک وہ اسی قسم کی باتیں سوچتی رہی تھی۔

☆☆☆

دعا کی کسی بھی بات پر یقین نہ کرنے کے عزم کے باوجود اسے ایک عجیب سی بے چینی لاحق تھی۔ سارا دن ایک اضطراب اور مسلسل پریشانی کے عالم میں گزار کر وہ بالآخر شام میں ان کے گھر چلی آئی۔ اسے نہیں پتہ تھا کہ وہ اپنی پریشانی کا اظہار اویس یا انکل کے سامنے کس طرح کرے گی لیکن وہ یہ بھی جانتی تھی کہ اسی گھر کے مکینوں نے اب تک اس کی ہر پریشانی اور دکھ میں اس کا ساتھ دیا ہے اور ان کے سوا وہ دنیا میں کسی پر بھی اعتبار نہیں کر سکتی۔ گاڑی گیٹ سے باہر ہی چھوڑ کر وہ اندر چلی آئی۔ لان میں بیٹھے اویس اور دعا کو دیکھ کر وہ ایک لمحہ کو اپنی جگہ سن ہو کر رہ گئی۔ لان چیئرز پر بیٹھے وہ دونوں آپس میں کچھ بات کر رہے تھے۔ اویس کی اس طرح پشت تھی جبکہ دعا کا منہ اسی طرف تھا لیکن باتوں میں مگن اس نے اسے اس طرف آتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ وہ جیسے کسی طاقت کے زیر اثر چلتی ہوئی اسی طرف بڑھ رہی تھی۔ ان دونوں میں سے کسی نے بھی اس کے قدموں کی چاپ نہیں سنی تھی۔ دعا بڑے جذبے سے کہہ رہی تھی۔

"مجھے آپ اسی دن سے اچھے لگتے ہیں جب آپ آئی بی اے میں ہم لوگوں کو لیکچر دینے آئے تھے۔ حالانکہ کتنے ہی لوگ مجھ سے دوستی کرنے اور بات کرنے کے لئے ترستے رہتے ہیں مگر میں ان میں سے کسی کو بھی لفٹ نہیں کراتی۔ آپ تو سب سے مختلف ہیں لیکن پتہ نہیں یہ اجالا ہمارے درمیان کہاں سے آ گئی تھی۔" اس کی بات کے جواب میں کچھ کہنے کے لئے لب کھولتے ہوئے اسے کسی کی موجودگی کا احساس ہوا تو فوراً سر گھما کر پیچھے کی طرف نظر ڈالی۔ چند قدموں کے فاصلے پر کھڑی اجالا کو دیکھ کر وہ ایک دم سے کھڑا ہوتا ہوا بولا۔

"اجالا! تم۔ آؤ بیٹھو، کھڑی کیوں ہو؟" کسی قسم کے احساس ندامت شرمندگی کے بغیر وہ اس سے مخاطب تھا۔ اس کے چہرے پر نہ تو بوکھلاہٹ نظر آ رہی تھی نہ اپنا آپ ظاہر ہو جانے پر وہ نروس ہوتا ہوا یا گھبرایا ہوا نظر آ رہا تھا۔



اسے اپنے یہاں زندہ سلامت کھڑے رہنے پر خود پر حیرت ہو رہی تھی۔ وہ اس کی بات کے جواب میں کچھ بھی کہے بغیر الٹے قدموں پیچھے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ منہ پر ہاتھ رکھے جیسے اپنی چیخ کی آواز کو دبا لینا چاہتی ہو۔ وہ اس کے چہرے پر موجود تاثرات سے کچھ خائف ہوتا ہوا تیزی سے اس کی طرف بڑھا تو وہ پوری رفتار سے بھاگتی ہوئی گیٹ کی طرف جانے لگی۔

"اجالا رکو میری بات سنو۔" وہ بے اختیار اسے پکارتا ہوا اس کے پیچھے لپکا۔ وہ اپنے تعاقب میں آتی اس آواز کو اب زندگی میں دوبارہ کبھی سننا نہیں چاہتی تھی۔ آنسو ایک تواتر سے بہہ رہے تھے اور وہ اپنی سسکیوں کو دباتی اندھا دھند بھاگ رہی تھی۔ دو چار لمبے لمبے قدم اٹھاتا وہ اس تک پہنچ گیا تھا اور ایک جھٹکے سے اس کا رخ اپنی طرف کر کے بولا تھا۔

"کیا ہو گیا ہے تمہیں؟"

"Don`t touch me" اس کا ہاتھ نفرت سے جھٹکتے ہوئے وہ غصے سے پھنکاری تھی۔ دعا بھی اٹھ کر ان دونوں کے پیچھے چلی آئی تھی اور بڑی خاموشی سے الگ تھلگ کھڑی یہ تماشا دیکھ رہی تھی۔

"میں تم سے دوستی کر لوں تم مجھے اپنے جیسا بنا دو گے یہی کہا تھا تم نے۔ افسوس میں کبھی بھی تم لوگوں جیسی نہیں بن سکی۔ یہ دنیا میرے جیسے لوگوں کے لئے نہیں بنی۔ یہ تمہارے، خالد، سعود اور دعا جیسے لوگوں کے لئے ہے۔ میں تو یہاں مس فٹ ہوں۔" وہ آنسو بہاتے ہوئے چیختی تھی۔

"اجالا تمہیں پتہ نہیں کیا غلط فہمی ہو رہی ہے۔ پلیز آرام سے بیٹھ کر میری بات سنو۔" وہ اس کے ہاتھ تھامتا ہوا بڑی بے بسی سے بولا تھا۔

"کیا سنوں یہی کہ مجھے ایک مرتبہ پھر استعمال کیا گیا ہے۔ تم نے میرے ساتھ وہی سب کیا جو اوروں نے کیا تھا۔ تم نے بھی مجھے ایک Cat, spaw ہی سمجھا۔ کیوں آخر کیوں میں نے تمہارا کیا بگاڑا تھا۔ کیا برا کیا تھا میں نے جس کی مجھے یہ سزا ملی۔" وہ اس کا ہاتھ ہٹاتے ہوئے ہسٹریک ہو کر چلائی تھی۔

"اجالا تم مجھے ہرٹ کر رہی ہو۔ تمہیں کوئی حق نہیں پہنچتا کہ تم میرے جذبوں کا یوں مذاق اڑاؤ۔ میں نے ہمیشہ تم سے محبت کی ہے، تمہاری عزت کی ہے۔" وہ ناراضگی بھرے انداز میں اسے دیکھتا ہوا بولا تھا۔ اس کی آنکھوں سے جھلکتی خفگی اور ناراضگی کو کوئی اہمیت دیئے بغیر وہ اپنے آنسوؤں کو بے دردی سے صاف کرتے ہوئے ہنسی تھی۔

"محبت اور وہ بھی ایک طلاق یافتہ لڑکی سے۔ جسے اس کے کزن نے ٹھکرا دیا ہو۔ جھوٹ ایسا تو بولو جو ہضم ہو جائے۔ یہ کہو کہ تم نے میرے ساتھ فلرٹ کیا تھا۔ مجھے استعمال کیا تھا۔ دعا تک پہنچنے کے لئے مجھے استعمال کیا تھا۔"

"تم میرے ساتھ زیادتی کر رہی ہو۔ مجھے بولنے کا موقع دیئے بغیر تم میرے اوپر اتنے واہیات الزام لگا رہی ہو۔ اپنے کردار پر کوئی بات چاہے وہ تم ہی کیوں نہ کر رہی ہو میں کبھی بھی برداشت نہیں کروں گا۔" اب کے وہ بھی چلایا تھا۔

"کردار؟ تمہارا کوئی کردار ہے بھی۔" وہ طنزیہ انداز میں بولی تھی۔ اور بے اختیار اسے تھپڑ مارنے کے لئے اپنا ہاتھ اٹھاتے اٹھاتے اس نے خود کو بمشکل روکا تھا۔ وہ اس کے غیظ و غضب سے معمور چہرے پر نظر ڈالتے

ہوئے بولی تھی۔

''مجھے نہیں پتہ تم نے اور دعا نے میرے ساتھ کیا گیم کھیلا ہے لیکن بس اتنا ہوا ہے کہ آج کے بعد میں کبھی بھی کسی پر اعتبار نہیں کروں گی۔ بہت مان تھا مجھے خود پر کہ میں انسانوں کو پرکھ سکتی ہوں۔ مجھے سچ اور جھوٹ میں تمیز کرنی آتی ہے لیکن تم نے اویس لودھی آج مجھے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے میری اپنی ہی نظروں میں گرا دیا ہے۔ تم تو میری محبت کیا نفرت کے قابل بھی نہیں ہو۔'' وہ لب بھینچے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی تمام بات کے جواب میں وہ کچھ بھی نہیں بولا تھا۔ بس ایک ٹک اس کی طرف دیکھتا رہا تھا۔ کچھ دیر پہلے کہ غضبناک تاثرات کی جگہ دکھ اور صدمے نے لے لی تھی۔ وہ بڑی مایوسی اور افسردگی سے کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ ایک نظر اس پر اور ایک دعا پر ڈال کر گیٹ سے باہر نکل گئی تھی۔ اویس نے اسے روکنے یا اس کے پیچھے جانے کی کوئی کوشش نہ کی تھی۔ وہ ویسے ہی چپ چاپ کھڑا ہوا تھا۔

☆☆☆

وہ پتہ نہیں کس طرح گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے گھر پہنچی تھی۔ اسے اپنے اعصاب کی اس مضبوطی پر حیرت ہو رہی تھی۔ اپنا آپ بڑا ہلکا اور بے وقعت محسوس ہو رہا تھا۔ اپنے کمرے میں بند وہ بلک بلک کر اپنی ذلت پر آنسو بہا رہی تھی۔ کیا وہ اتنی ارزاں تھی کہ اتنی آسانی سے کسی کے ہاتھوں 'بے وقوف' بنتی رہی۔ وہ اس کے ساتھ کھیلتا رہا اور وہ اپنے تئیں خود کو بہت سمجھدار اور دانا سمجھتے ہوئے اس کے ہاتھوں اپنی انسلٹ کرواتی رہی۔ اور اس وقت وہ میری خوش فہمیوں پر دل ہی دل میں کتنا محظوظ ہوتا ہوگا۔ میں ان لوگوں میں سے ہوں جو کبھی بھی نہیں سنبھلتے ہیں۔ ہر بار ٹھوکر کھا کر زخمی ہوتے ہیں چیختے چلاتے ہیں اور پھر دوبارہ ٹھوکر کھانے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ کیوں آنکھیں بند کر کے میں اس کا یقین کرتی رہی۔ کیوں میں نے خود کو یوں گرایا۔ آخر کیوں کیوں میں یہ بات بھول گئی کہ میں اور میری تقدیر کبھی نہیں بدل سکتی۔ زندگی تو پہلے بھی سہل نہیں تھی لیکن اب جیسی مشکل بھی نہیں تھی اسے میں نے خود اپنے ہاتھوں اتنا مشکل اور نا قابل قبول کیوں بنالیا۔'' وہ بستر پر اوندھی پڑی سسک رہی تھی۔

''تم ہنستے ہوئے اچھی لگتی ہو۔'' اسے اپنے پاس ایک سرگوشی سنائی دی تو وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

''اوپر سے بڑا سوبر اور لیا دیا نظر آتا ہے۔ اندر سے ایک نمبر کا فلرٹ ہے۔'' ایک اور آواز سنائی دی تھی۔

''تم اپنے حصے کے تمام دکھ سہہ چکی ہو اور اب زندگی تم پر مہربان ہونے والی ہے۔'' ایک مہربان آواز نے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ پھر اچانک ایک اور بازگشت سنائی دی تھی۔

''کیا ہم اچھے دوست نہیں بن سکتے۔ کوئی تمہیں تکلیف دے یا ستائے تو تم اس کا منہ توڑ دو۔ مجھ سے دوستی کر کے دیکھو میں تمہیں بالکل اپنے جیسا بنا دوں گا۔''

''تمہاری طرح اس کے گرینڈ فادر کو بھی یہ غلط فہمی ہو گئی تھی کہ وہ تمہیں پسند کرتا ہے۔ وہ تو صرف مجھے جلانے کے لئے تم سے اتنی بے تکلفی سے ملتا تھا۔'' وہ کانوں پر دونوں ہاتھ رکھے ان آوازوں سے پیچھا چھڑا لینا چاہتی تھی لیکن یہ آوازیں کسی آسیب کی طرح اس کی طرف بڑھ رہی تھیں۔

''شکر ہے کچھ تو میرے لئے بھی ہو اور نہ یہاں تو ہر بات انکل سے شروع ہو کر انکل ہی پر ختم ہو جاتی ہے۔''



''اویس اچھا ہے ناں سب سے اچھا۔''

''اسے ایک طلاق یافتہ لڑکی جسے اس کے کزن نے چھوڑ دیا ہو سے کوئی دلچسپی نہیں۔''

''خدا کے لئے میرا پیچھا چھوڑ دو'' وہ چلائی تھی اور پھر دوبارہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔

☆☆☆

وہ پوری رات اور اگلا پورا دن اپنے کمرے میں بند رہی تھی۔ ملازمہ آ کر ناک کر کے کھانے کے لئے بلا کر گئی تھی مگر وہ کوئی جواب دیئے بغیر ویسے ہی پڑی رہی تھی۔ شام میں ممی اس کے بیڈ روم میں آئی تھیں۔ ان کے...... آواز دینے پر اس نے اٹھ کر کمرے کا لاک کھولا تھا۔

''کیا بات ہے تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے۔ اسکول بھی نہیں گئیں اور کھانے کے لئے بھی نہیں آئیں۔'' وہ اس کے ستے ہوئے چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے بولیں۔

''جی کچھ بخار تھا اس لئے۔'' وہ سر جھکا کر جواب دیتی دوبارہ بیڈ پر بیٹھ گئی تو وہ بھی اس کے سامنے بیڈ پر بیٹھتے ہوئے بولیں۔

''کوئی دوا لی۔'' وہ اپنے لئے ان کی تشویش پر تعجب سے ان کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''میں ٹھیک ہوں آپ فکر مت کریں۔''

''کیسے فکر نہ کروں تم اتنی چپ چپ اور سب سے الگ تھلگ جو رہتی ہو۔ بیٹا گھر والوں کے ساتھ گھل مل کر اور ایک ساتھ رہا کرو۔'' وہ اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے بولی تھیں۔ اس کے چہرے پر موجود تاثرات سے نظریں چراتے ہوئے وہ کچھ شرمندگی سے بولیں۔

''مجھے پتہ ہے تم مجھ سے ناراض ہو۔ تم سمجھتی ہو میں نے جان بوجھ کر تمہارا خالد سے نکاح کروایا تھا۔ بلیو می سوئٹ ہارٹ میں تمہاری ماں ہوں میں نے کبھی بھی تمہارا برا نہیں چاہا۔ جو کچھ ہوا میں نے ایسا کبھی نہیں چاہا تھا۔ کیا میں نے تمہیں اپنی کوکھ سے جنم نہیں دیا۔ مجھے تم بھی اتنی ہی عزیز ہو جتنے تمہارے باقی بہن بھائی۔ ہاں! میں تمہیں کبھی زیادہ توجہ نہ دے سکی۔ یہ بات میں مانتی ہوں لیکن مجھے تم سے بہت پیار ہے۔ تم تو میری بہت پیاری بیٹی ہو۔'' وہ اس کا سر اپنے کندھے سے لگاتے ہوئے بولی تھیں۔

بعض محبتیں ہمیں زندگی میں اس وقت ملتی ہیں جب ہمیں ان کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔ ممی کتنی بھی چاہت ظاہر کریں کیا ان کی چاہت اس آٹھ سال کی معصوم بچی کو واپس لا سکتی ہے جو ان کی ایک نگاہ التفات کے لئے کچھ بھی کر گزرنے کو تیار رہا کرتی تھی۔ کچھ خوشیاں جب اپنے وقت پر نہیں ملتیں تو پھر بعد میں وہ ملیں نہ ملیں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

وہ سپاٹ چہرے کے ساتھ ان کا والہانہ انداز دیکھ رہی تھی جبکہ بڑی خوشگوار مسکراہٹ چہرے پر لاتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

''تمہارے لئے اویس لودھی کا پرپوزل آیا ہے۔ مبشر صاحب خود بنفس نفیس یہاں آئے اور بڑی چاہت سے تمہارا رشتہ مانگا ہے۔ وہ خالد کم ظرف ہرگز بھی تمہارے لائق نہ تھا۔ میری بیٹی کا جوڑ تو اویس جیسے ہینڈسم اور

کوالیفائیڈ شخص کے ساتھ جچتا ہے۔ تمہارے ڈیڈی چاہے کسی بھی وجہ سے اس رشتے کے حامی ہوں لیکن میں صرف تمہاری ماں ہونے کے ناطے اس رشتے پر خوش ہوں۔ میری بیٹی سکھی رہے اسے قدر دان لوگ ملیں بس میری خوشی صرف یہی ہے۔ مجھے پتہ ہے تم بہت حساس ہو اور مبشر لودھی کا گھرانہ تمہارے شایان شان ہے۔ وہ لوگ تمہیں بہت خوش رکھیں گے۔'' وہ ان کے کندھے پر سے اپنا سر اٹھاتے ہوئے بڑے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔

''ممی اس رشتے سے انکار کر دیں۔ میں اویس سے شادی نہیں کرنا چاہتی۔'' وہ اس کی بات پر حیرت سے گنگ رہ گئی تھی۔

''پلیز ممی ابھی ابھی آپ نے کہا تھا کہ آپ میری ماں ہونے کے ناطے اس رشتے پر خوش ہیں اور اگر میں اس رشتے سے انکار کر رہی ہوں وہاں میری مرضی اور خوشی نہیں ہے تو ایک ماں ہونے کے ناطے آپ کو میری بات ماننی چاہئے۔'' وہ دوٹوک انداز میں بولی تھی۔

''لیکن اجالا اویس بہت اچھا ہے۔ میرا تو خیال تھا کہ تم بھی وہاں انٹرسٹڈ ہو۔'' ممی نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تو وہ ان کی بات کاٹ کر فیصلہ کن انداز میں بولی۔

''میں آپ سے زندگی میں پہلی بار کچھ مانگ رہی ہوں۔ پلیز مجھے مجبور مت کریں۔'' وہ اس کے انداز پر چپ ہو گئی تھیں۔ پھر کتنی ہی دیر انہوں نے اسے اس رشتے کی اچھائیاں گنوائی تھیں لیکن وہ اپنے فیصلے میں اٹل تھی۔ آخر کار ممی ہار مانتے ہوئے بولی تھیں۔

''ٹھیک ہے جیسی تمہاری مرضی۔ مجھے تمہاری خوشی ہر چیز سے زیادہ مقدم ہے۔ تم خوش رہو میں بس صرف یہی چاہتی ہوں۔'' وہ اس کے ماتھے کو چومتے ہوئے کمرے سے نکل گئی تھیں۔

☆☆☆

اس نے اس بات کو جاننے کی کوئی کوشش نہیں کی تھی۔ وہاں انکار کہلوا دیا گیا ہے یا نہیں۔ وہ اپنے آپ میں الجھی ہوئی سارا سارا دن کمرے میں گزار دیتی تھی۔ ممی کے بلانے پر گھر والوں کے ساتھ کھانا کھانے کے علاوہ اس کا تمام وقت کمرے میں گزرتا تھا۔ اسکول سے لونگ لیو لے کر وہ ان دنوں ساری دنیا سے کٹی ہوئی تھی۔ دعا نے اس سے اس دن کے حوالے سے کوئی بات کرنے کی کوشش نہیں کی تھی اور وہ خود بھی اب زندگی بھر دعا سے کبھی کوئی بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اسے ممی کو انکار کیے چوتھا دن تھا۔ جب حمیدہ نے کارڈلیس اس کے ہاتھ میں پکڑا کر کہا تھا ''آپ کا فون ہے۔'' اور وہ ان دنوں کسی سے بھی کوئی بات کرنا نہیں چاہتی تھی، اس لئے بغیر بات کیے لائن ڈس کنیکٹ کر دی تھی۔ پھر اس دن دو مرتبہ اور اگلے تین چار مرتبہ اسے پیغام ملا کہ انکل کا فون ہے۔ لیکن اس نے بے مروتی اور بدتمیزی کی حد کرتے ہوئے ان سے بات کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

''مجھے معاف کر دیں انکل لیکن میں اَب آپ سے بھی کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتی۔'' وہ بعد میں روتے ہوئے اپنے آپ سے بولی تھی۔ اگلے روز دوپہر میں ممی نے اسے کمرے میں آ کر اطلاع دی کہ انکل اس سے ملنے آئے ہیں۔ وہ اپنے گھر میں ان سے ملنے سے انکار کبھی بھی نہیں کر سکتی تھی، اس لئے فوراً ہی اٹھ کر ڈرائنگ روم میں آ گئی۔ سامنے ہی صوفے پر بیٹھے ہوئے انکل کو دیکھ کر اس کا بے ساختہ دل چاہا کہ ان کے گلے لگ جائے اور خوب سارا رونے کے



بعد ان سے اویس کی، دعا کی اور پتہ نہیں کس کس کی شکایتیں کرے۔ لیکن اپنے دل کی اس خواہش کو نظر انداز کرتی وہ انہیں سلام کرتے ہوئے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئی۔

''کیسی ہے میری بٹی؟'' وہ خود ہی اٹھ کر اس کے برابر میں آ کر بیٹھ گئے اور بڑے پیار سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔

''میں ٹھیک ہوں۔ آپ کیسے ہیں انکل۔'' وہ آنسوؤں پر بند باندھتی مضبوط لہجے میں بولی۔

''اپنی بیٹی کے بغیر میں ٹھیک کیسے ہو سکتا ہوں۔ تم تو میرے لئے آکسیجن کی طرح اہم ہو اتنے دن سے تمہیں دیکھا نہیں تو دل بری طرح اداس ہے۔ میری جان انکل سے کس بات کی ناراضگی ہے۔'' وہ اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں تھامتے ہوئے محبتوں سے چور لہجے میں بولے تھے۔ وہ اس لمحے کمزور نہیں پڑنا چاہتی تھی۔ اس کی محبت اسے پھر سے کمزور کر رہی تھی اور وہ ان کی طرف کھنچنے لگی تھی۔ خود کو سنبھالتے ہوئے وہ سر جھکا کر بولی۔

''میری آپ سے کوئی ناراضگی نہیں ہے انکل۔''

''پھر کیا بات ہے بیٹا! دیکھو جو بھی بات ہے کہہ دو۔ بات کرنے سے اپنے دل کا حال کہہ دینے سے انسان بہت سے مصائب سے بچ جاتا ہے۔ تمہارے اور اویس کے درمیان جو بھی مس انڈرسٹینڈنگ ہوئی ہے مجھے بتاؤ۔ اگر اس کی غلطی ہوئی تو میں اسے چھوڑوں گا نہیں لیکن مجھے بتاؤ تو سہی۔'' وہ بڑی بے چارگی سے بولے تھے۔

''کوئی مس انڈرسٹینڈنگ نہیں ہے انکل۔ آپ پلیز اس ٹاپک کو مت چھیڑیں۔ مجھے آپ کی محبت پر کوئی شک نہیں ہے۔ میں جانتی ہوں آپ مجھے بہت چاہتے ہیں لیکن پلیز اس بات کو رہنے دیں۔'' وہ کھڑی ہوتی ہوئی بولی۔ ''آپ کا بہت شکریہ آپ نے مجھے اس قابل سمجھا کہ میرے لئے اپنے پوتے کا رشتہ لائے۔ لیکن اسے میری جیسی لڑکی سوٹ نہیں کرتی۔ آپ اس کے لئے دعا کا یا اس سے ملتی جلتی کسی لڑکی کا انتخاب کریں۔'' وہ بڑے سکون سے اپنی بات مکمل کر کے کھڑی ہوئی تھی۔ وہ اس کے چہرے پر گہری نگاہ ڈالتے ہوئے کھڑے ہو گئے۔

''اس وقت تم ڈیپریسڈ لگ رہی ہو۔ میں بعد میں آؤں گا۔ پھر تم سے بہت ساری باتیں کروں گا۔'' وہ اس کی طرف بغور دیکھتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھ گئے تو وہ بھی ان کے پیچھے چلتی انہیں گیٹ تک چھوڑنے آئی تھی۔

''اجالا میں اور اویس تم سے بہت پیار کرتے ہیں۔ اس بات پر ہمیشہ یقین رکھنا۔'' وہ گیٹ سے نکلتے ہوئے اس سے بولے تھے اور وہ خاموش کھڑی انہیں جاتا دیکھتی رہی تھی۔

☆☆☆

وہ بڑے نڈھال اور تھکے ہوئے گھر میں داخل ہوئے تو لاؤنج میں بیٹھے اویس کو دیکھ کر کہنے لگے۔

''خیریت آج جلدی آ گئے؟''

''جی کچھ کام تھا اس لئے جلدی آ گیا۔'' وہ ان کی طرف بڑے غور سے دیکھتا ہوا بولا۔

''کہاں سے آ رہے ہیں؟''

''میرا خیال ہے تمہیں اس سوال کا جواب معلوم ہے اسی لئے یہاں بیٹھ کر میرا انتظار کر رہے تھے۔ یقیناً اخلاق نے تمہیں بتا دیا ہو گا کہ میں اجالا سے ملنے گیا تھا۔'' وہ بڑے سکون سے جواب دیتے ہوئے اس کے سامنے

والے صوفے پر بیٹھ گئے۔

"آپ وہاں کیوں گئے تھے؟" وہ خفگی بھرے انداز میں بولا۔

"کیا مجھے نہیں جانا چاہئے تھا؟" وہ اس کے سوال کے جواب میں سوال کرنے لگے تھے۔ "ہرگز نہیں جانا چاہئے تھا۔ وہ خود کو سمجھتی کیا ہے کہ آپ اس کی منتیں کرنے اس کے گھر پہنچ رہے ہیں۔" وہ اپنا غصہ کنٹرول کرنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا تھا۔

"اولیں وہ نادان ہے تو کیا ہم بھی جذباتی ہو کر بیوقوفانہ حرکتیں شروع کر دیں۔ تمہیں اس سے محبت کا دعویٰ ہے تو اس کی فیلنگس کو سمجھنے کی کوشش بھی کرو۔ وہ جس طرح کے حالات کا شکار رہی ہے تو ایسے میں اسے اسی طرح ری ایکٹ کرنا چاہئے۔ اس نے ہمیشہ لوگوں کی دھوکہ دہی۔ جھوٹ اور منافقت دیکھی ہے اسی لئے اس کا رشتوں پر سے محبتوں پر سے اعتبار اٹھ گیا ہے۔ ہمیں اس کا اعتبار بحال کرنا ہے۔ مجھ سے بہتر تو یہ کام تم کر سکتے ہو۔ تمہیں چاہئے کہ اس سے ملو اسے یقین دلاؤ کہ تم اس کے ساتھ مخلص ہو اس کا کھویا ہوا اعتماد اور اعتبار اسے واپس دلاؤ۔" وہ اسے سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے بولے تو وہ اپنی ناراضگی چھپائے بغیر بولا تھا۔

"سوری پاپا جانی میں ایسا نہیں کر سکتا۔ میں نے ساری زندگی کبھی کسی کے سامنے وضاحتیں دی ہیں نہ اب دوں گا۔ اگر میں درست ہوں تو ہوں مجھے کسی کے سامنے اپنی پوزیشن کلیئر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میرا دل میرا ضمیر مطمئن ہے۔ میں نے کچھ غلط نہیں کیا تو میں اس کے پیچھے کیوں جاؤں۔ اس نے مجھے گھٹیا ترین افراد کی فہرست میں بڑے آرام سے شامل کر دیا بغیر مجھ سے وضاحت چاہے۔ اب چاہے دنیا ادھر کے ادھر ہو جائے میں اس سے نہیں ملوں گا۔ مجھے محبت سے زیادہ اپنی عزت اور انا عزیز ہے اور آج کے بعد اگر آپ بھی اس سے ایسے کسی سلسلے میں ملے تو میں آپ سے ناراض ہو جاؤں گا۔ وہ ایک Suspicious لڑکی ہے اور اس کی اس بیماری کا علاج دنیا کے کسی حکیم کے پاس نہیں ہے۔ اس نے میری انسلٹ کی ہے اور میں اسے کبھی بھی معاف نہیں کر سکتا۔ "I will never forgive her" وہ اپنی بات ختم کر کے لاؤنج سے چلا گیا تھا اور وہ اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھامے بڑی بے بسی سے بیٹھے کچھ سوچ رہے تھے۔

ان کے اجالا سے ملنے جانے پر اس کا موڈ اتنی بری طرح آف ہوا تھا کہ وہ دوبارہ آفس جانے کا ارادہ ترک کر کے جوتوں سمیت ہی بستر پر لیٹ گیا تھا۔

"تم کوئی دنیا کی آخری اچھی لڑکی تو نہیں ہو جو میں تمہارے لئے جوگ لوں گا۔ اس دنیا میں تم سے کہیں بہتر اور اچھی لڑکیاں بھی موجود ہیں۔" وہ بڑے غصے سے سوچ رہا تھا۔ "مگر وہ اجالا شہریار تو نہیں ہوں گی۔" کوئی اس کے اندر سے بولا تھا۔ "کتنی بری طرح تم نے مجھے Let down کیا ہے" وہ اپنے اندر سے ابھرتی اس آواز کو نظر انداز کر کے وہ خود سے بولا تھا۔ "میں تمہارے لئے کیا کیا سوچتا تھا اور تم! تم نے مجھ سے محبت تو کر لی مگر میرا اعتبار نہیں کیا۔ اور ایسی محبت جس میں ایک دوسرے پر بھروسہ اور یقین نہ ہو میرے نزدیک بیکار ترین شے ہے۔ تمہارے خلاف اگر ساری دنیا بھی اکٹھی ہو کر میرے سامنے آ کھڑی ہوتی اور تمہارے خلاف گواہی دیتی۔ میں تب بھی کسی بات کا یقین نہ کرتا کیونکہ مجھے تم پر اعتبار تھا۔ کتنے آرام سے تم نے وہ بدترین الفاظ اپنی زبان سے استعمال کئے تھے بغیر یہ سوچے کہ یہ



الفاظ مجھے کتنا دکھ دے رہے ہیں۔ کیا جو زبان سے بڑے بڑے دعوے کرے صرف وہی سچا ہوتا ہے جو اپنے منہ سے کہے کہ میں تمہارے لئے جان دے سکتا ہوں آسمان کے چاند تارے لا سکتا ہوں تمہارے نزدیک صرف وہی سچا ہے۔ تم نے کبھی میری آنکھوں میں اپنے لئے چاہتوں کا آباد جہان دیکھنے کی زحمت ہی نہیں کی۔ میں تمہارے لئے کچھ بھی کر سکتا تھا۔ تمہیں خوش دیکھنے کے لئے تمہارے آرام اور سکون کی خاطر میں اپنی جان کی پروا کئے بغیر کچھ بھی کر سکتا تھا لیکن تم نے مجھ پر بھروسہ نہ کیا۔ تمہارے نزدیک وہ تمہارے آزمائے ہوئے بدترین رشتے دار مجھ سے زیادہ معتبر ٹھہرے اور میں معتوب قرار پایا۔

اور وہ پاپا جانی کہتے ہیں کہ میں تمہارے پاس جا کر اپنی صفائیاں پیش کروں۔ نیور ایسا کبھی بھی نہیں ہوگا۔ تمہارے خلاف ماریہ فون پر مجھ سے الٹی سیدھی بکواس کرتی ہے کہ میرے بھائی نے اسے اس کی بعض بری عادتوں کی وجہ سے چھوڑ دیا تو میں اسے جھڑک کر اور آئندہ فون نہ کرنے کا کہہ کر ریسیور پٹخ دیتا ہوں۔ اور تمہارے اوپر افسوس کرتا ہوں کہ تم اتنے گھٹیا لوگوں کے بیچ رہتی ہو۔ جس روز یہاں سے پرپوزل گیا تھا اسی رات ماریہ نے فون کیا تھا اور میں نے اسے بری طرح ڈانٹ دیا تھا۔ میرا دل چاہا تھا کہ اتنے برے لوگوں کے درمیان سے تمہیں جلد سے جلد نکال لاؤں۔ وہ جہنم تمہارے رہنے کی جگہ تو نہیں۔ پھر دعا سامنے آتی ہے۔ دعا شہریار جسے میں ایک ڈیڑھ سال سے جانتا ہوں۔ MBA کی سٹوڈنٹس کو لیکچر دینے گیا تو وہیں وہ کسی بلا کی طرح میرے پیچھے پڑ گئی۔ ایک دو مرتبہ فائزہ کے ساتھ اپنے کسی اسائنمنٹ کے سلسلے میں مدد لینے میرے آفس آئی تو میں نے فائزہ کی مروت میں خوش اخلاقی سے بات کر لی۔ مگر وہ محترمہ کسی طرح پیچھا چھوڑنے پر آمادہ ہی نہ ہوئیں۔ اس کے بعد فائزہ کے بغیر ہی اپنی پڑھائی کا کوئی نہ کوئی بہانہ کر کے آفس آنے لگی تو میں نے اسے اگنور کرنا شروع کر دیا۔ ساری کرٹسی ایک طرف رکھ کر میں نے بد اخلاقی ظاہر کی تو اس نے میرا پیچھا چھوڑا۔

پھر اس روز پاپا جانی کی برتھ ڈے پر تمہیں چھوڑنے گیا تو ٹیرس پر کھڑی دعا کو دیکھ کر مجھے پتہ چلا کہ وہ تمہاری بہن ہے۔ اور میں کتنا حیران بھی ہوا تھا کہ کہاں تم مشرقی روایات کی آئینہ دار شرمائی ہوئی سی لڑکی اور کہاں وہ بے تحاشا بولڈ اور آؤٹ اسپوکن دعا۔ اس سے اگلے ہی دن وہ میرے آفس چلی آئی اور تمہارے خلاف وہی خالد کا قصہ سنانے کے لئے بیٹھ گئی تو میں نے اس کی بہت انسلٹ کی اور اسے اپنے آفس سے بہت بری طرح ڈانٹ کر نکال دیا۔ اس واقعے کے بعد وہ دوبارہ میرے پاس نہیں آئی میں نے تم سے بھی ایسی کسی بات کا کوئی تذکرہ نہیں کیا۔ میں تمہیں ہرٹ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ پھر اس روز جب تم مجھ سے لڑ جھگڑ کر گئی تھیں دعا تمہارے آنے سے چند لمحے پہلے ہی آئی تھی اور یہ اتفاق ہی تھا کہ میں وہاں لان میں بیٹھا ہوا تھا اسے دیکھ کر میرا منہ بن گیا تھا لیکن وہ میرے منہ بنانے کی پروا کئے بغیر میرے سامنے کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئی تو میں نے بھی سوچا کہ آج اس کا دماغ ہمیشہ کے لئے درست کر دینا چاہئے تاکہ یہ میرا پیچھا چھوڑ دے۔ اس نے بات کرنی شروع ہی کی تھی کہ تم وہاں آ گئیں اور تم نے اس ساری سچویشن کے بہت ہی غلط معنی نکالے۔ میں نے تمہارے خلاف کسی کی بات کا کوئی یقین نہیں کیا۔ تو جواب میں مجھے اپنے لئے بھی ایسی ہی عزت چاہئے تھے۔

تم نے میرے ساتھ بہت برا کیا ہے اجالا بہت برا۔ میں تمہارے راستوں کے پتھر ہٹا رہا تھا۔ تمہاری

راہوں کے خار سمیٹ رہا تھا۔ تم تک پہنچنے کے لئے میں نے درست راستے کا انتخاب کیا تھا۔ تم جس کی میں نے ہمیشہ عزت کی۔ اپنے گھر میں آنے والے ایک مہمان اور پاپا جانی کو عزیز ہونے کے ناطے۔ مگر اس روز جب تم میرے سینے پر سر رکھ کر روئی تھیں پتہ نہیں مجھے ایک دم کیا ہوا تھا۔ میں اس ایک لمحہ میں مکمل طور پر بدل گیا تھا۔ اپنی اس کیفیت پر میں خود بھی حیران رہ گیا تھا۔ میرا دل چاہا تھا کہ ان تمام لوگوں کو سرعام پھانسی دلواؤں جنہوں نے تمہیں دکھ دیئے۔ میں نے اس وقت یہی سوچا تھا کہ میں تمہیں اتنی خوشیاں دوں گا کہ تم گزشتہ تمام غموں اور بدصورت یادوں کو بھول جاؤ گی۔ کوئی خالد تمہارا نصیب کیسے ہو سکتا تھا۔ تمہیں تو خدا نے میرے لئے بنایا تھا۔

میرا دل چاہتا تھا کہ تمہیں بتاؤں کہ تم کتنی خوبصورت ہو سب سے منفرد تمہارا احتیاط اور شرمایا ہوا انداز تمہیں سب سے الگ کرتا ہے۔ تم لوگوں کے رویوں سے مایوس ہو کر اپنے بارے میں احساس کمتری کا شکار ہو گئی تھیں۔ میں تمہیں بتانا چاہتا تھا کہ تمہیں کسی نے ریجیکٹ نہیں کیا بلکہ تمہیں میرے لئے مجھ سے ملنے کے لئے شاید ان تمام حالات سے گزرنا پڑا۔ شاید ہمیں کچھ دیر سے ملنا تھا۔ مگر افسوس میں تمہیں کچھ بھی نہیں بتا سکا۔ یہ بھی نہیں کہ تم اس روز پاپا جانی کی برتھ ڈے پر بہت حسین لگ رہی تھیں اتنی کہ میرا دل چاہ رہا تھا کہ بس تمہیں ہی دیکھتا رہوں اور یہ بھی نہیں بتا سکا تمہارے ہاتھ کتنے حسین ہیں۔ تمہاری مسکراہٹ کتنی دل فریب ہے۔ میں تمہیں کچھ بھی نہیں بتا سکا۔ وہ تمام باتیں جو میں نے سوچی ہوئی تھیں کہ ہماری شادی کے دن تم سے کروں گا شاید اب کبھی نہ کہہ سکوں اس لئے کہ ایسا کوئی دن ہماری زندگی میں آنے والا ہی نہیں ہے۔ تمہاری بے اعتباری مجھے بہت دکھ دے رہی ہے۔ تم ایک بار مجھے موقع تو دیتیں۔ رک کر میری بات سن تو لیتیں۔ کیوں اجالا تم نے میرے ساتھ ایسا کیوں کیا؟ میں تمہارے لئے First String بننا چاہتا تھا لیکن تم نے مجھے آسمان سے اٹھا کر زمین پر پٹخ دیا۔ وہ سازشی مجھ سے زیادہ قابل اعتبار قرار پائے۔" وہ اپنے بستر پر لیٹا بڑے دکھ سے سوچ رہا تھا۔

☆☆☆

وہ نماز پڑھ کر اٹھی تھی جب حمیدہ نے اسے اخلاق کے فون کی بابت بتایا۔ بات کرنے سے انکار کرتے کرتے وہ اچانک ہی رک گئی تھی۔ آخر ایسی کیا بات ہو گئی کہ اخلاق نے فون کیا ہے۔ وہ سوچتے ہوئے کارڈلیس اس کے ہاتھ سے لے کر بات کرنے کے لئے آمادہ ہو گئی۔ دوسری طرف اخلاق کی روتی ہوئی آواز سن کر اس کے اوسان خطا ہو گئے تھے۔ وہ روتے ہوئے انکل کی طبیعت کی خرابی کی اطلاع دے رہا تھا۔

"میں کمرے میں کھانا لے کر گیا تو وہ کارپٹ پر بے ہوش پڑے ہوئے تھے۔ طبیعت تو ان کی دو تین روز سے ہی خراب چل رہی تھی۔ میری تو فوراً کچھ سمجھ نہیں آیا کہ کیا کروں۔ پھر اویس بھائی کو فون کیا اور وہ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی صاحب کو ہاسپٹل لے کر گئے ہیں۔" وہ ان کی طبیعت کا سن کر خود ایسی بری طرح پریشان ہوئی تھی کہ ڈھنگ سے اسے تسلی بھی نہیں دے سکی۔ اس سے ہاسپٹل کا نام پوچھ کر وہ جس حلیئے میں تھی اسی میں گاڑی کی چابی اٹھا کر پورچ کی طرف آئی تھی۔ گاڑی انتہائی تیز رفتاری سے دوڑاتے ہوئے وہ ان کی صحت اور طویل عمری کے لئے دعائیں کرتی ہوئی ہاسپٹل کے احاطے میں داخل ہوئی تھی۔ ایک ایک قدم کئی من وزنی معلوم ہو رہا تھا۔

"انکل آپ کو زندہ رہنا ہے میرے لئے پلیز مجھے اکیلا مت کیجئے گا۔" وہ دل ہی دل میں ان سے مخاطب



حواس باختہ ریسیپشن تک پہنچی تھی۔ اسی ہاسپٹل میں وہ ایک مرتبہ پہلے بھی اس سے ملنے آئی تھی۔ مگر تب میں اور اب میں بہت فرق تھا۔ کچھ ہی دیر میں ایک کمرے کے باہر کھڑی خود کو اندر جانے کا حوصلہ دے رہی تھی۔ دروازے پر ہلکے سے دستک دے کر وہ اندر داخل ہوئی تو ڈاکٹر ثروت حسین بخاری سے باتیں کرتے ہوئے اویس نے گردن موڑ کر اسے دیکھا تھا۔ اس پر نظر پڑتے ہی اس نے اپنا رخ دوبارہ ڈاکٹر بخاری کی طرف کر لیا تھا۔ اس کی سرد و سپاٹ نگاہوں سے اندر ہی اندر خائف ہوتی وہ انکل کی طرف متوجہ ہوئی تھی۔ وہ آنکھیں موندے کمبل اوڑھ کر گہری نیند سوئے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر بخاری نے نووارد کو بڑی گہری نگاہوں سے دیکھا تھا اور پھر دوبارہ اویس سے مخاطب ہو گئے تھے۔

"فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔ تم پریشان مت ہو۔ بس یہ ہے کہ ان کا بلڈ پریشر خطرناک حد تک تجاوز کر گیا تھا اور پھر سب سے بڑی بات ایج فیکٹر بھی ہے اس ایج میں انسان کے نروس بہت کمزور ہو جاتے ہیں مجھے ایسا لگتا ہے ان دنوں وہ کسی پریشانی میں مبتلا تھے۔ تمہیں ان کے خلاف مزاج کچھ بھی نہیں کرنا چاہئے۔ ہارٹ پیشنٹ کے نروس کے لئے کسی بھی قسم کا Stress نقصان دہ ہوتا ہے۔ کوشش کرو کہ وہ خوش رہیں۔ ان کی مرضی اور خواہشات کے مطابق ہر چیز ہو۔" وہ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بہت مخلصانہ انداز میں اس سے بات کر رہے تھے۔ وہ بھی چند قدموں کے فاصلے پر کھڑی ان کی بات بڑے غور سے سن رہی تھی۔

وہ خود ان کی پریشانی کا سب سے بڑا سبب ہے یہ بات اسے بری طرح نادم کر رہی تھی۔ انہوں نے ہمیشہ مجھ سے پیار کیا میرا خیال رکھا اور میں نے جواب میں انہیں ذہنی الجھن اور بیماری دی۔ وہ سر جھکائے سوچ رہی تھی، ڈاکٹر بخاری اویس کو تسلی دے کر باہر جا چکے تھے۔ ان کے جانے کے بعد وہ اس کی طرف نگاہ ڈالے بغیر انکل کی طرف بڑھ گیا تھا۔ اور پاس رکھی کرسی پر بیٹھ کر ان کا چہرہ دیکھنے لگا تھا۔ اجالا نے ایک چور نگاہ اس کے چہرے پر ڈالی تھی تو وہ بہت پریشان اور الجھا ہوا نظر آیا۔ کچھ دیر کھڑے رہنے کے بعد وہ سامنے رکھے صوفے پر بیٹھ گئی۔ اس نے نہ اس کے کھڑے رہنے کا کوئی نوٹس لیا تھا اور نہ ہی بیٹھنے کا۔

اس کا اسٹائل ایسا تھا جیسے اس وقت یہاں صرف وہ اور پاپا جانی ہی موجود ہیں۔ کسی تیسرے فرد کی موجودگی سے اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ایک گھنٹہ اسی طرح گزر گیا تھا۔ وہ دونوں ہی سارا وقت انکل پر نظریں جمائے بیٹھے رہے تھے۔ ان کے جسم میں ذرا سی حرکت محسوس ہوئی اور آنکھوں کے پپوٹے ہلتے ہوئے لگے تو وہ فوراً ہی اپنی جگہ سے اٹھ کر ان کے پاس آ گئی اویس نے ان کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام کر انہیں آواز دی تھی۔

"پاپا جانی آپ کیسے ہیں؟" انہوں نے بمشکل آنکھیں کھول کر اسے دیکھا اور بڑی پست آواز میں جواب دیا۔

"ٹھیک ہوں۔" ایسا لگ رہا تھا کہ بولنے کے لئے انہیں خاصی محنت اور طاقت صرف کرنی پڑی ہے۔ انہیں اس حال میں دیکھ کر وہ بے اختیار سسک اٹھی تھی۔ وہ جو اسے جواب دے کر دوبارہ آنکھیں بند کر چکے تھے ایک دم آنکھیں کھول کر اپنے بائیں طرف سر گھما کر دیکھا تھا اور اسے دیکھ کر بدقت مسکراتے ہوئے بولے تھے۔

"چلو میرے بیمار ہونے کا کچھ تو فائدہ ہوا۔ میری اجالا انکل سے ناراضگی ختم کر کے آ گئی۔ اگر مجھے پتہ ہوتا تو پہلے ہی بیمار ہو جاتا۔" ان کی بات پر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔ انہوں نے اس کا ہاتھ تھاما تو وہ روتے ہوئے ان کے بستر پر ہی بیٹھ گئی۔

"آپ بس جلدی سے ٹھیک ہو جائیں۔ آپ نے پرامس کیا تھا کہ میری برتھ ڈے پر مجھے میری پسند کا گفٹ دیں گے۔ میری برتھ ڈے سے پہلے آپ کو ٹھیک ہونا ہے۔" وہ روتے ہوئے بولی تھی اور اس کی اس بات پر وہ مسکرا نہیں رہے تھے۔ اویس بڑی خاموشی سے وہاں سے اٹھ کر جانے لگا تو انکل نے اس کا بازو تھام لیا۔

"تم کہاں جا رہے ہو؟" وہ اسے سوالیہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

"کہیں نہیں۔ ابھی تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔" وہ اپنے بازو چھڑاتے ہوئے کچھ بیزار سے انداز میں بولا تو اجالا نے پہلی بار چونک کر اس کی طرف دیکھا تھا۔ اسے مکمل طور پر نظر انداز کئے وہ ہر قیمت پر یہاں سے چلے جانا چاہتا تھا۔

"یہ کیا تم بچوں جیسی حرکتیں کر رہے ہو۔ کچھ تو میچورٹی کا ثبوت دو۔" وہ اپنی آواز کی کمزوری پر قابو پاتے ہوئے بمشکل بولے تھے۔ "تم دونوں ہی کا رویہ امیچور ہے۔ غلط فہمیاں کہاں نہیں ہوتیں۔ لیکن اسے انا اور عزت کا مسئلہ بنا کر ہر کوئی تم لوگوں کی طرح نہیں بیٹھ جاتا۔ اگر آپس میں کوئی بدگمانی آ گئی ہے تو بیٹھ کر بات کر کے اپنے مسئلے کا حل نکالو۔ ایک دوسرے کے ساتھ Communicate کرو۔ پڑھے لکھے لوگوں کے بیچ Communication gap کبھی بھی نہیں آنا چاہئے۔ ہر مسئلے کا حل ڈسکشن میں پوشیدہ ہوتا ہے۔" وہ دونوں کی طرف باری باری نگاہ ڈالتے ہوئے بولے تھے۔

وہ کچھ دیر کھڑا جیسے اپنے آپ پر قابو پاتا رہا تھا۔ پھر بڑی دقتوں سے خود کو آمادہ کرتا ہوا کرسی پر دوبارہ بیٹھ گیا تھا۔ ان کی بیماری کا لحاظ کرتے ہوئے بیٹھ تو گیا تھا لیکن چہرے پر موجود ناگواری اور خفگی کے تاثرات کو وہ چھپا نہیں پا رہا تھا۔ انہوں نے دوبارہ کچھ کہنے کی کوشش کی تو اویس بڑی بے مروتی سے انہیں ٹوکتا ہوا بولا۔

"پلیز پاپا جانی I Beg You آپ کسی ناپسندیدہ موضوع کو یہاں زیر بحث مت لائیں۔ میں آپ کی طبیعت کی وجہ سے مجبور ہوں آپ مجھے کچھ بولنے پر مت اکسائیں۔" اس نے اپنا جھکا ہوا سر اٹھا کر بڑے غور سے اویس لودھی کی طرف دیکھا تھا۔ کیا جو جھوٹے ہوتے ہیں ان کا لہجہ اتنا مضبوط ہوتا ہے۔ کیا ظالموں کے چہرے اتنے روشن ہوتے ہیں۔ کیا ریاکاروں اور منافقوں کی آنکھوں میں اتنی چمک اور سچائی ہوتی ہے۔ وہ ایک ٹک اس کی طرف دیکھتے ہوئے سوچ رہی تھی۔ وہ اپنے چہرے پر مرکوز اس کی نگاہوں سے بے نیاز ان سے مخاطب تھا۔

"مجھے کسی سے کوئی بات نہیں کرنی۔ نہ آج نہ کبھی۔ میں جو ہوں جیسا ہوں مجھے معلوم ہے۔" وہ اپنے مخصوص مضبوط اور دوٹوک انداز میں بولا تو وہ بڑی بے بسی محسوس کرتے ہوئے چپ ہو گئے تھے۔ وہ اس وقت سے مسلسل اسی کی طرف دیکھ رہی تھی جو سارے زمانے سے خفا نظر آ رہا تھا۔ اس کا اپنا دل اور دماغ اس کے حق میں گواہی دینے لگے تھے وہ سچا ہے اسی لئے اسے کسی کا ڈر نہیں۔ یہ شخص کبھی جھوٹ نہیں بول سکتا۔ کوئی اس کے اندر سے بول رہا تھا اور وہ اپنی اب تک کی بدگمانیوں پر شرمسار بیٹھی ہوئی تھی۔ کیا اس کا پچھلا رویہ میرے سامنے نہیں تھا۔ کیا وہ کبھی بھی ایسا کر سکتا تھا جیسا میں نے اسے سمجھا۔ اگر وہ مجھے دھوکہ دے رہا ہوتا تو اس دن رنگے ہاتھوں دعا کے ساتھ پکڑے جانے پر بوکھلا جاتا۔ وہ اپنی اور اس کی اس روز کی گفتگو یاد کرتے ہوئے سوچ رہی تھی۔ کتنی ہی دیر تک وہ سر جھکائے اپنے آپ سے الجھتی رہی تھی۔ کیا میری اس دن کی تمام بکواس پر مجھے کبھی معاف کرے گا۔ نہیں کبھی نہیں۔ اس نے کبھی میرا دل نہیں



دکھایا کبھی مجھے کوئی تکلیف نہیں پہنچائی اور میں نے اسے کتنی بری طرح ہرٹ کیا۔ کیا ایک سوری میری تمام بدتمیزیوں کا مداوا ہو سکتی ہے۔ نہیں کبھی نہیں۔ میں نے دشمنوں کی سازشوں کو سمجھے بغیر اندھا دھند ان پر اعتبار کر لیا اور اپنی جلد بازی اور حماقت کے ہاتھوں اسے خود سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ناراض کر دیا۔ وہ اب شاید مجھے کبھی بھی معاف نہ کرے اور شاید مجھ جیسے لوگوں کے ساتھ ہونا بھی ایسا ہی چاہئے۔ میری Short Sightedness نے مجھے کہیں کا نہیں چھوڑا۔" وہ اپنی سوچوں سے گھبرا کر ان کے پاس سے کھڑی ہو گئی۔

کمرے سے نکل کر بڑے لمبے لمبے اور تھکے ہوئے قدموں سے چلتی وہ اپنے آپ سے کہہ رہی تھی اپنی زندگی میں کھلنے والے خوشیوں کے اس در کو میں نے خود اپنے ہی ہاتھوں بند کر دیا۔ کیا کوئی اور بھی مجھ سا احمق اور جلد باز ہو گا۔

ابھی کیا کہیں، ابھی کیا سنیں؟
کہ سر فصل سکوت جاں
کف روز شب پہ شرر نما
وہ جو حرف حرف چراغ تھا
اسے کس ہوا نے بجھا دیا
کبھی لب ملیں گے تو پوچھنا
سر شہر عہد وصال دل
وہ نگہتوں کا ہجوم تھا
اسے دست موج فراق نے
تہ خاک کب سے ملا دیا
کبھی گل کھلیں تو پوچھنا
ابھی کیا کہیں، ابھی کیا سنیں
یونہی خواہشوں کے فشار میں
کبھی بے سبب کبھی بے خلل
کہاں کون کس سے بچھڑ گیا؟
کسے کس نے کیسے گنوا دیا؟
کبھی پھر ملیں گے تو پوچھنا

وہ پارکنگ میں آ کر اپنی گاڑی کا لاک کھولتے ہوئے خود کو ہمیشہ سے زیادہ تنہا اور دکھی محسوس کر رہی تھی۔ اپنی پشت پر کسی کی موجودگی کا احساس ہوا تو وہ پلٹے بغیر ہی اس کے مخصوص پرفیوم کی خوشبو سے اسے پہچان گئی۔ مڑ کر دیکھا تو وہ اس کے بالکل سامنے کھڑا اسے بڑی گہری نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

"تم نے کبھی مجھے نہیں سمجھا۔ لیکن میں تمہارے چہرے پر موجود تاثرات سے تمہارے دل کی ہر بات جان

لیتا ہوں۔ مجھے تمہیں جھکانے کی کوئی خواہش نہیں ہے۔ لیکن کم از کم اتنا تو کہہ دو کہ تم میرے اوپر اعتبار کرتی ہو ساری دنیا میں سب سے زیادہ۔ صرف اتنا ہی کہہ دو کہ تمہارے دل سے تمام شکوک دور ہو گئے ہیں تمہیں مجھ پر یقین آ گیا ہے۔" وہ اس کے سامنے کھڑا دونوں ہاتھ سینے پر باندھے مضبوط لہجے میں کہہ رہا تھا۔

"کیا آپ مجھے معاف کر دیں گے؟" وہ اس سے نظریں ملانے کی ہمت خود میں نہیں پا رہی تھی۔ اس لئے سر جھکا کر بولی تھی۔

"ہاں اس شرط پر کہ آئندہ کبھی مجھ سے بدگمان نہیں ہو گی۔ ہر شخص منافق اور دھوکے باز نہیں ہوتا۔ دنیا میں ابھی سچی محبت اور خلوص اتنا نایاب بھی نہیں ہوا کہ ہر آدمی کو شکوک کی عینک لگا کر دیکھا جائے۔ وہ اتنی دیر میں پہلی مرتبہ مسکرایا تھا اور اس کی اس بات پر وہ اپنے چہرے پر مسکراہٹ لئے اقرار میں گردن ہلا گئی تھی۔

☆☆☆

"آج اجالا نے سچ مچ میرے گھر میں اجالا کر دیا ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی میں اسے رخصت کر کے اپنے گھر لایا ہوں۔ آج سے ٹھیک ایک سال پہلے آج ہی کے دن وہ مجھے پہلی مرتبہ پارک میں ملی تھی اور تب میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ یہ اتنی پیاری اور منفرد سی لڑکی میرے گھر میں اتنی ساری خوشیاں اور بہاریں لے کر آئے گی۔ میں خوش ہوں بے تحاشا اور بے حساب خوش ہوں۔ میرے بچوں کو ان کی خوشی مل گئی وہ مطمئن اور آسودہ ہو گئے اور اپنے بچوں کو خوش دیکھ کر میں کیوں نہ خوش ہوں۔ اجالا دلہن بن کر اتنی پیاری لگ رہی تھی کہ میں بتا نہیں سکتا۔ کاش آج ہم لوگوں کے درمیان صبیحہ، دانیال اور سیمین بھی ہوتے تو ہماری خوشیاں دوبالا ہو جاتیں۔ خیر میں اپنے رب کی رضا میں راضی ہوں۔ اس نے مجھے بے حد نوازا ہے۔ میرا اویس اور میری اجالا میرے پاس ہیں۔ میرا گھر مکمل ہو گیا ہے۔ اب اس گھر میں قہقہے گونجا کریں گے۔ میرے بچے اپنی زندگی کو خوشگوار انداز میں بسر کریں گے اور میں انہیں ہنستا مسکراتا دیکھ کر رب کائنات کا شکر ادا کروں گا۔ کچھ عرصہ پہلے تک مجھے یہ سب کچھ ہوتا ہوا نظر نہیں آ رہا تھا۔

اجالا اور اویس کے بیچ اتنی مس انڈر سٹینڈنگ ہو گئی تھی اور میرے سمجھانے بجھانے کا دونوں ہی پر کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ اگر بچوں کے نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو اجالا اور اویس دونوں ہی اپنی اپنی جگہ صحیح تھے۔ اجالا جس نے اپنے خونی رشتوں کی بے اعتباری اور ناقدری کا دکھ اٹھایا ہوا تھا کیسے کسی اور پر بھروسہ کر لیتی اور اویس اپنے جذبوں میں سچا تھا اس لئے وہ کیوں جھک جاتا۔ ان دونوں کے رویے اپنی جگہ درست تھے لیکن میں اپنے بچوں کو ایک دوسرے سے ناراض انا کا پرچم بلند کئے کیسے دیکھتا رہتا۔ خاموش تماشائی بنا اپنے بچوں کی بربادی دیکھتا رہتا۔ وہ ناخوش تھے ایک دوسرے سے خفا تھے اور میں دونوں میں سے کسی کو بھی سمجھا نہیں پا رہا تھا۔

پھر اچانک ہی میرے ذہن میں ایک خیال آیا اور وہ جو مثل مشہور ہے کہ جوان گھر سے بھاگنے سے ڈراتا ہے اور بوڑھا مرنے سے۔ سو اسی مثل پر عمل پیرا ہوتے ہوئے میں نے ایک ڈرامہ تیار کیا۔ اس ڈرامے میں میرے ساتھ اخلاق اور بخاری نے بھی اپنا اپنا کردار نہایت عمدگی سے نبھایا۔ اجالا تو خیر ہے ہی سیدھی سادی اور معصوم اصل خطرہ تو اویس سے تھا۔ وہ آخر میرا پوتا ہے اس کی زیرک اور تیز فہم نظروں سے مجھے خوف تھا۔ لیکن آخر میں اسی کا دادا ہوں ایسی کامیاب اداکاری کی کہ اس کے فرشتے بھی اصل حقیقت نہیں جان سکے ہوں گے۔ اخلاق کو میں نے سمجھا دیا



تھا کہ پہلے اویس کو روتے ہوئے فون کرے پھر جب وہ مجھے ہاسپٹل لے جائے تو اجالا کو۔ ان دونوں کو ایک دوسرے سے ملوانے کا اور کوئی طریقہ ہی نہیں تھا میرے پاس۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میری ترکیب کامیاب رہی۔ ان دونوں کے بیچ موجود تمام شکوک اور ناراضگیوں کی دھند چھٹ گئی۔ اپنی اس چالاکی کا تو میں انہیں کبھی بھی پتہ نہیں چلنے دوں گا۔ ورنہ وہ آئندہ کبھی میری کسی بات کا یقین نہیں کریں گے۔

اپنے آشیانے کی حفاظت میں نے بخیر و خوبی کر لی اور میں خدائے بزرگ و برتر کا احسان مند ہوں جس نے میرے بچوں کو ان کی روٹھی ہوئی خوشیاں لوٹا دیں۔ میری دعا ہے کہ اویس اور اجالا کے بیچ اب کبھی کوئی دعا کوئی ماریہ نہ آئے اور اگر آئے بھی تو وہ ہر سازش اور ہر حاسد کی حسد اور دشمنی کو ناکام بنا دیں۔ یارب العالمین میرے بچوں کو سدا خوش اور آباد رکھنا۔ انہیں کبھی کوئی دکھ نہ پہنچے۔ انہیں حاسدوں کے حسد اور شر پسندوں کے شر سے بچانا۔ وہ ہمیشہ ایک دوسرے پر اعتبار کریں ایک دوسرے سے پیار کریں۔ انہیں کبھی کوئی دکھ چھو کر بھی نہ گزرے آمین ثم آمین۔

# خوشی کو ڈھونڈتے ہوئے

کہتے ہیں وقت سب سے بڑا استاد ہے، وہ باتیں جو آپ کو نہ کتابیں پڑھ کر سمجھ میں آتی ہیں اور نہ ہی کالجوں، یونیورسٹیوں میں کسی اعلیٰ ترین ڈگری کے حصول کے دوران، وہ سب وقت بڑے سفاکانہ انداز میں خود بخود ہی سمجھا دیا کرتا ہے۔ مجھے بھی وقت نے بہت کچھ سمجھا اور سکھا دیا ہے۔

آج سے پانچ سال پہلے والی نیرہ ذاکر اور آج کی نیرہ ذاکر میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

کبھی میں خود بھی بے تحاشا خوش رہا کرتی تھی اور اپنے اردگرد موجود دوسرے لوگوں کو بھی اپنی باتوں اور زندگی سے بھرپور مسکراہٹوں سے خوش رکھا کرتی تھی۔

تب نیرہ ذاکر نے دنیا کو سمجھنا شروع نہیں کیا تھا۔ وہ سادہ سی لڑکی سب لوگوں کو اپنے جیسا ہی سادہ سمجھا کرتی تھی۔

لوگوں کی چالاکیاں، مکاریاں، منہ پر کچھ اور پیٹھ پیچھے کچھ والی باتوں کا اسے ادراک ہی نہیں تھا لیکن پھر آہستہ آہستہ وقت اسے سب کچھ سمجھاتا چلا گیا۔ شروع شروع میں جب میں نے لوگوں کی منافقت دیکھی تو میں حیران رہ گئی۔ میں شدید دکھ میں مبتلا ہوگئی۔ بہت قریبی افراد بھی کس طرح حسد اور نفرت میں مبتلا ہوتے ہیں۔ یہ سب میں نے بہت قریب سے دیکھا ہے۔ میں نے لوگوں کے ایک چہرے کے پیچھے چھپے کئی چہرے دیکھے ہیں۔

یہ بالکل شروع شروع کی بات ہے، جب مجھے لوگوں کی منافقت اور جھوٹ سے بہت تکلیف پہنچتی تھی۔

اب کم از کم ایسا نہیں ہے۔ ٹھیک ہے کہ میں لوگوں کی طرح جھوٹ نہیں بول سکتی، منافقانہ انداز نہیں اختیار کر سکتی، لیکن کم از کم اتنا تو کر ہی سکتی ہوں کہ خود بھی لوگوں پر خلوص اور محبت نچھاور نہ کروں۔ اگر بہت سے لوگوں کو میں صرف ضرورت پڑنے پر ہی یاد آتی ہوں تو پھر میں بھی جواباً انہیں اسی وقت یاد کرتی ہوں جب مجھے ان سے کوئی کام ہوتا ہے۔

کراچی جیسے بڑے شہر میں، میں اپنا ذاتی بیوٹی پارلر چلا رہی ہوں اور ہر روز میں کئی قسم کے لوگوں سے ملتی ہوں کہ اب کسی کی بھی صرف شکل دیکھ کر ہی اس کا فیملی بیک گراؤنڈ بتا سکتی ہوں۔ پبلک ڈیلنگ بہت مشکل کام ہے۔ ہر کسی کے بس کا نہیں ہے یہ کام اور یہ بے حد مشکل کام میں پچھلے پانچ سالوں سے بڑی خوبصورتی سے انجام دے رہی



ہوں۔ ایک سو فیصد پروفیشنل انداز رکھنے والی لڑکی بن گئی ہوں میں۔

یہ میرا پروفیشنلزم ہی تو ہے کہ ایک بار جو کلائنٹ میرے پاس آجائے وہ پھر کسی دوسرے پارلر میں جانا پسند نہیں کرتا۔ اس کی وجوہات میں میری کام میں مہارت اور کام کو پوری توجہ سے کرنا شامل ہے ہی لیکن اس کے علاوہ کچھ اور عوامل بھی اس میں شامل ہیں۔ اچھا بزنس مین یا وومن وہ ہوتا ہے، جو دیرپا اور دور رس نتائج پر نگاہ رکھے۔ اگرچہ میں نے کسی نامی گرامی انسٹی ٹیوٹ سے بزنس ایڈمنسٹریشن میں کوئی ڈگری نہیں لے رکھی یا بزنس، مارکیٹنگ اور پبلک ریلیشنگ وغیرہ کو بطور سبجیکٹ پڑھ رکھا ہو، لیکن بغیر پڑھے بھی میں کسی بزنس اسکول کے گریجویٹ سے زیادہ چالاک اور ذہین بزنس وومن ہوں۔ اپنے ہر کلائنٹ کے ساتھ خوش اخلاقی اور خوش دلی سے ملنا تو میرا وصف ہی ہے۔ میرا ہر کلائنٹ دل ہی دل میں خود کو میرا سب سے خاص کلائنٹ سمجھتا ہے۔ اچھے کاروباری ادارے اور ملٹی نیشنل کمپنیاں جو طریقہ اختیار کرتی ہیں کہ وہ صابن لو تو ایک مفت، ٹوتھ پیسٹ کے ساتھ برش مفت اور گھی کے ایک کلو کے ڈبے پر دس روپے کی بچت وغیرہ وغیرہ ایسا ہی کچھ کچھ میں بھی کرتی ہوں۔ جو کلائنٹ پہلی مرتبہ آتی ہے اور اس نے صرف آئی بروز بنوائی ہیں تو میں اپر لپ مفت میں بنا دوں گی۔ کلینزنگ کروانے آئی ہے تو میں مفت میں بلیک ہیڈز بھی نکال کر اسے کلینزنگ کے پیسوں میں فیشل کے مزے کروا دوں گی۔ وہ تھوڑا سا نقصان بعد میں میری مستقل آنے والی کلائنٹس میں ایک اور کلائنٹ کا اضافہ کر دیتا ہے۔ حالانکہ آج کل کتنا سخت مقابلہ ہے۔ ہر گلی محلے میں بیوٹی پارلرز کا جمعہ بازار لگا ہوا ہے، لوگوں کے پاس بے تحاشا چوائس ہے۔ ایسے میں یہ میری کاروباری کامیابی ہی ہے کہ میرے پاس ایک بار آنے والا پھر میرے علاوہ اور کہیں نہیں جاتا۔ باوجود اس کے کہ پھر دوبارہ میں پیسوں میں اس طرح کی رعایت کبھی بھی نہیں کرتی۔

پانچ سال پہلے جب میں نے اپنے اس پارلر کا آغاز کیا، اس وقت میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ آنے والے دنوں میں میرا پارلر اتنے زبردست طریقے سے چلنے لگے گا۔ یہ ایک ایسا کام تھا جو میں نے انتہائی مشکل حالات میں بہت ڈرتے ڈرتے شروع کیا تھا۔ کچھ میں خود ڈری ہوئی تھی، کچھ امی اور بہنوں نے بھی ڈرایا ہوا تھا۔

"تم کیسے کرو گی یہ کام اس قسم کے کاموں کے لئے جس طرح کی چالاکی اور ہوشیاری درکار ہوتی ہے، وہ تمہارے پاس ہے نہیں۔ ایک سے ایک چالاک اور چلتی پرزہ قسم کی عورتیں اور لڑکیاں آیا کریں گی تمہارے پاس۔ تم اس طرح کے لوگوں کو کس طرح ہینڈل کرو گی۔"

وہ لوگ وقتاً فوقتاً اس طرح کی باتیں کر کر کے میرا حوصلہ پست کرنے کی کوشش کیا کرتی تھیں۔ امی کو مجھ سے اس بات کا شکوہ تھا کہ اگر میں نے ان کی خواہشات کا احترام کرتے ہوئے کچھ پڑھ لکھ کر دے دیا ہوتا تو بجائے اس مشکل کام میں پڑنے کے سیدھے سیدھے کہیں کوئی مناسب سی جاب ہی کر لیتی۔ مگر اب اس بی اے جیسی عوامی ڈگری کے ساتھ اور وہ بھی سیکنڈ ڈویژن میں مجھے کون اپنے پاس ملازمت دے سکتا تھا۔

ہر آدمی، ہر چیز میں اچھا نہیں ہو سکتا، ہر آدمی ہر کام اچھا نہیں کر سکتا۔ میں بہت سے کاموں میں بہتر تھی لیکن افسوس کہ ان کاموں میں پڑھائی کبھی بھی شامل نہیں ہو سکی۔ حالانکہ میرے علاوہ باقی چاروں بہنیں پڑھائی میں بہت

بقیہ پچاس فیصد شکست ہماری کم ہمتی اور منفی سوچیں خود بخود عنایت کر دیں گی۔ تجربہ، تیزی اور چالاکی کوئی بازار میں بکنے والی چیز تو ہے نہیں کہ میں بازار جاؤں اور خرید کر لے آؤں اور نہ ہی یہ چیزیں کہیں آسمان سے ٹپکیں گی۔ میں بھی کام کر کے ہی سیکھوں گی۔ جب تک ٹھوکر نہیں کھاؤں گی تب تک سنبھلنا اور ڈھنگ سے چلنا بھی نہیں سیکھ پاؤں گی۔''

ان لوگوں کے اعتراضات کے جواب میں، میں نے بہت عزم اور حوصلے کے ساتھ اپنے خیالات ان لوگوں کے سامنے رکھے تھے۔ بہت بحث و تکرار کے بعد میں امی اور سارہ کو قائل کرنے میں کامیاب ہوگئی تھی۔

ایک کمرہ باقی گھر سے ذرا الگ بنا ہوا تھا۔ میں نے اسی میں پارلر کھولنے کا ارادہ کیا۔ اللہ کا نام لے کر میں نے اپنے بیوٹی پارلر کا آغاز کر دیا۔ شروع شروع میں مجھے کتنی مشکلات پیش آئیں، یہ بہت ہی طویل داستان ہے۔

وہ جو امی اور سارہ مجھے لوگوں کی چالاکیوں سے ڈرایا کرتی تھیں اس کا بھی مجھے خوب اچھی طرح تجربہ ہوا۔

شروع میں میرے پاس آنے والی کلائنٹس میں زیادہ تعداد ہمارے پڑوس میں رہنے والی خواتین اور لڑکیوں کی تھی یا پھر خاندان کی لڑکیوں کی۔ اکثر میں پڑوس اور رشتہ داری نبھانے کے چکر میں اپنی مروّت کے ہاتھوں نقصان اٹھایا کرتی تھی۔ محلے کی کوئی خاتون میرے پاس اگر بال ٹرم (Trim) کروانے آتیں تو بالوں کی ٹرمنگ کرواتے کرواتے وہ پوری کٹنگ ہی کروالیا کرتیں۔

''نیرہ! ذرا سا پیچھے سے ہلکا سا یو شیپ دے دو بالوں کو۔'' ٹرم کرواتے کرواتے وہ لاپروائی سے کہتیں۔ ابھی میں بالوں کو پیچھے سے یو شیپ دے رہی ہوتی تو وہ فرماتیں۔

''آگے سے ہلکی ہلکی سی لیئرز اگر دے دی جائیں تو کیسا لگے گا؟'' یوں ''ہلکا'' اور ''ہلکی'' کرتے وہ مجھ سے پوری لیئر کٹنگ کروالیا کرتیں اور پیسے لیتے وقت مجھ سے مارے مروّت اور لحاظ کے یہ بات کبھی کہی نہیں جاتی تھی کہ ''آنٹی آپ نے فل کٹنگ کروائی ہے، آپ اس کے پیسے دیں۔''

ان کی چالاکی اور مکاری میری سمجھ میں تو آتی تھی مگر کسی کو منہ پر کس طرح اور کس انداز میں جواب دیتے ہیں یہ بات مجھے آتی ہی نہیں تھی۔

امی کو میری اس حرکت کا پتہ چلا اور پتہ بھی ظاہر ہے میرے بتانے پر ہی چلا تھا تو وہ مجھ پر خوب ناراض ہوئیں۔

''اگر فی سبیل اللہ اور خدمت خلق کے طور پر کام کرنے کا اتنا ہی شوق ہو رہا ہے تو پھر باہر ایک بڑا سا بورڈ لگوا لو، جس پر ''یہاں تمام کام مفت کئے جاتے ہیں۔'' جلی حروف میں لکھا ہوا ہو۔''

''میں کیا کروں امی! مجھ سے پیسوں کے بارے میں کسی سے کچھ کہا نہیں جاتا، عجیب سا لگتا ہے۔ انہیں تو خود اس بات کا احساس ہونا چاہئے کہ انہوں نے کیا کام کروایا ہے۔ خود کہنا کتنا برا سا لگتا ہے۔''

میں نے شرمندگی سے سر جھکا کر اپنی کمزوری کا اعتراف کیا تو امی غصہ اور ناراضی بھلا کر مجھے سمجھانے بیٹھ گئیں۔

''ان حرکتوں پر لوگ تمہیں کسی بہت اعلیٰ خاندان کی فرد اور پیسے پر جان نہ دینے والی شخصیت نہیں سمجھیں گے۔ بلکہ بے وقوف اور پاگل سمجھیں گے۔ بات دس روپے، سو روپے یا ہزار روپے کی نہیں ہے۔ بات یہ ہے کہ آپ کو اپنا حق لینا آتا ہے یا نہیں اور اس بات میں تمہیں شرمندگی بھی محسوس نہیں کرنی چاہئے۔ تم اپنے حق سے زیادہ تو کچھ



طلب نہیں کر رہیں۔''

کچھ امی کے سمجھانے اور کچھ خود ہی لوگوں کی تیزی اور چالاکی دیکھ دیکھ کر آہستہ آہستہ میں نے کاروباری طور طریقے سیکھنے شروع کر دیئے۔ میں کام پوری محنت اور دیانتداری سے کیا کرتی تھی، بہت سے دوسرے پارلرز کی طرح میں کبھی کوئی دو نمبر اور سستی پروڈکٹ امپورٹڈ اور یجنل بوتل یا ڈبے میں بھر کر اپنے کلائنٹس کو بے وقوف بنانے کی کوشش نہیں کرتی تھی۔

چند ہی سالوں میں، میں نے اپنے پاؤں جمانے اور ٹھوکر کھا کھا کر سنبھلنا اور مضبوط قدموں سے چلنا سیکھ لیا تھا۔ امی جو میری نالائقیوں اور بے وقوفیوں سے عاجز رہا کرتی تھیں میری کامیابیوں پر بے حد خوش تھیں۔ میں نے اور سارہ نے امی کی تمام ٹیوشنز ختم کروا دی تھیں۔ اسکول کی جاب انہوں نے ہم لوگوں کے بہت کہنے پر بھی نہیں چھوڑی تھی۔ البتہ وہاں سے لونگ لیو (Long leave) لے لی تھی۔ اس لونگ لیو کے بعد انہوں نے دوبارہ سے اسکول جوائن کر لیا تو ہم لوگ اس بات پر خوش تو ہرگز نہیں تھے، لیکن انہیں روک بھی نہیں پائے تھے۔

سارہ کی منگنی اس کے بی ایس سی کے دوران ہی امی کی ایک کولیگ کے بیٹے کے ساتھ ہو چکی تھی۔ ادھر سارہ کا ایم ایس سی مکمل ہوا۔ ادھر ان لوگوں نے شادی کی جلدی مچا دی۔ امی نے بھی اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ کہنے کو وہ مجھ سے ایک سال بڑی بہن تھی، لیکن میری اس سے بالکل دوستوں جیسی انڈرسٹینڈنگ تھی، اس لئے اس کی شادی کے بعد میں نے اس کی کمی بے حد شدت سے محسوس کی تھی۔

اپنے معاشی مسائل کے حل اور امی کی پریشانیوں کو کم کرنے کے لئے میں نے محنت اور لگن سے جو کام شروع کیا تھا، اس سے میں مطمئن تو تھی لیکن پھر بھی کبھی کبھار مجھ پر مایوسیوں کا حملہ بھی ہو جایا کرتا تھا۔ اپنی ہم عمر بہت سی دوسری لڑکیوں کو بے فکری کی زندگی گزارتے دیکھ کر کبھی میں اللہ سے شکوے کرنے بیٹھ جایا کرتی تھی۔ لیکن زندگی سے یہ تمام شکوے اور شکایتیں صرف اس وقت تک تھیں جب تک میں صائمہ علی سے نہیں ملی تھی۔

صائمہ علی میری مستقل کلائنٹ ہے۔ میں نے اس سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ زندہ دلی، بہادری، خود اعتمادی۔ کہنے کو وہ میری ہی ہم عمر ہے مگر عزم اور ہمت میں وہ مجھ سے کہیں آگے ہے۔ وہ ایک بہت ہی سخت اور آزمائشوں سے بھری ہوئی زندگی گزار رہی ہے، پھر بھی وہ میری طرح زندگی سے کبھی ناراض نہیں ہوتی وہ کبھی بھی یہ نہیں کہتی کہ صرف میرے ہی ساتھ ایسا کیوں ہو رہا ہے۔ دوسری لڑکیاں تو اتنے مزے کی زندگی گزار رہی ہیں۔

زندہ دلی سے قہقہے لگاتی اور ہنستی مسکراتی ہوئی اس بے تحاشا حسین اور باہمت لڑکی کو دیکھ کر کوئی اندازہ ہی نہیں لگا سکتا کہ زندگی کس کس انداز میں اس کا امتحان لے رہی ہے۔

صائمہ کو میرے پاس آتے ہوئے غالباً تین سال ہو گئے ہیں۔ وہ ایک غیر ملکی فاسٹ فوڈ ریسٹورنٹ میں CRO ہے۔ پہلی مرتبہ جب وہ میرے پاس آئی تو میں نے اسے کوئی خاص اہمیت نہیں دی تھی۔ دوسرے لوگوں کی طرح اسے بھی میرے کام کرنے کا انداز پسند آیا تھا اس لئے وہ اس ایک مرتبہ کے بعد پابندی سے ہر دوسرے تیسرے مہینے میرے ہی پاس آنے لگی۔ اس کا ریسٹورنٹ ہمارے گھر سے بہت قریب تھا۔ اکثر وہ وہاں سے ڈیوٹی آف ہونے پر میرے پارلر میں آیا کرتی تھی۔

جتنی دیر میں اس کا فیشل یا بالوں کی کٹنگ کر رہی ہوتی، وہ مسلسل کچھ نہ کچھ بولتی رہتی لیکن ایک روز جب وہ میرے پاس آئی تو بہت چپ چپ سی تھی۔

''تمہارے بالوں کا حلیہ بھی بالکل بگڑا ہوا ہے صائمہ! سارا شیپ ہی خراب ہو گیا ہے۔ کہو تو کٹنگ کر دوں۔''

میں نے دھاگا واپس دراز میں ڈالتے ہوئے اس سے کہا تو اس نے بیزاری سے بھرپور انداز میں منع کر دیا۔

''موڈ نہیں ہو رہا۔ بالوں کو تو کلپ لگا کر یا بینڈ میں جکڑ کر قابو کیا جا سکتا ہے۔ بھنوؤں کی مجبوری ہے۔ ورنہ میرا تو انہیں بنوانے کا بھی دل نہیں چاہ رہا تھا۔ کسٹمرز کے ساتھ اچھے ریلیشنز رکھنے کے لئے یہ بھی تو ضروری ہے کہ آپ خوبصورت نظر آ رہی ہوں، آپ کے چہرے پر مصنوعی مسکراہٹ ہو۔ بیماروں جیسی روتی بسورتی شکل دیکھ کر تو کسٹمرز بھاگ ہی جائیں گے۔''

وہ بہت جلے بھنے انداز میں بولی تھی۔ شاید بہت بھری ہوئی بیٹھی تھی۔ غالباً اسے اپنے دکھ کہنے کے لئے ایک سننے والا درکار تھا۔ اتفاق سے اس وقت پارلر میں، میں اور وہ اکیلے ہی تھے۔

صائمہ کی زبان اس کی ساری کہانی سن کر میں اللہ تعالیٰ سے اپنے تمام گلے شکوؤں پر جی بھر کر شرمندہ ہوئی تھی۔ صائمہ بے چاری تو ہر طرح سے حالات کے ظلم و ستم کا شکار تھی۔

''ہم سات بہن بھائی تھے۔ میں سب سے بڑی تھی۔ پندرہ سال کی تھی جب ابا کا انتقال ہو گیا۔ ہم لوگ کرائے کے مکان میں رہتے تھے۔

میں نے ابھی صرف میٹرک ہی کیا تھا کہ زندگی یوں آندھیوں کی زد میں آ گئی۔ کالج میں پڑھنے اور ڈاکٹر بننے کے تمام خواب چکنا چور ہو گئے تھے۔ کوئی رشتہ دار، کوئی دوست اور کوئی پڑوسی ان مشکل حالات میں کام نہیں آیا تھا۔ بہت کوششوں سے مجھے ایک فیکٹری میں ملازمت ملی تھی۔ امی گھر پر لوگوں کے کپڑے سینے کا کام کرتیں اور میں سارا سارا دن فیکٹری میں سخت ترین مشقت کرتی، تب کہیں جا کر ان کے گھر میں چولہا جلا کرتا۔ ان سب سختیوں سے گزرنے کے ساتھ ساتھ پرائیویٹ انٹر کے امتحان کی بھی تیاری کی۔ انٹر کرنے کے بعد میں نے فیکٹری کی ملازمت چھوڑ کر کہیں اور بہتر ملازمت کرنے کا سوچا۔ جہاں معاوضہ ذرا بہتر مل سکے۔ اخبار میں اشتہار دیکھ کر میں ایک پرائیویٹ فرم میں سیکرٹری کی جاب کے لئے پہنچ گئی۔ میری حیرت اور خوشی کی انتہا نہ رہی جب وہاں کے مالک نے چند آسان آسان سے سوال پوچھنے کے بعد اپنے پاس جاب دے دی۔ وہاں کی تنخواہ فیکٹری میں ملنے والی تنخواہ سے کہیں اچھی تھی۔

باس کا رویہ میرے ساتھ بہت اچھا تھا۔ مجھے ٹائپنگ کرنی اور ڈکٹیشن لینا نہیں آتا تھا لیکن وہ پھر بھی میری حوصلہ افزائی کیا کرتے تھے۔ میں کسی کام میں کوئی غلطی کر دیتی تو اسے بڑے آرام سے نظر انداز کر دیا کرتے۔ میں بہت کم عمر تھی اس وقت۔ مجھے باہر کی دنیا اور مردوں کی کمینگی کا پتہ ہی نہیں تھا۔ وہ مجھ سے بیٹا بیٹا کر کے بات کرتے تو میں نے انہیں سچ مچ اپنے والد ہی کی طرح سمجھ لیا تھا۔ مجھے اتنی عقل ہی نہیں تھی کہ انٹر جیسی کم تعلیم اور بغیر کسی تجربہ، ٹائپنگ، شارٹ ہینڈ اور دیگر دفتری امور میں ناواقفیت کے باوجود بھی انہوں نے مجھے اپنے پاس جاب کیوں دے دی ہے۔ میں تو بس اسے اپنی خوش قسمتی سمجھ کر بے تحاشا خوش تھی۔ وہ مجھے اہمیت دیتے، میری حوصلہ افزائی کرتے یہ کہتے کہ



ان کے ہاں جاب کرنے کے ساتھ ساتھ مجھے آگے بی اے کے امتحان کی تیاری بھی شروع کر دینی چاہئے وہ کہتے تھے کہ آگے بڑھنے کے سلسلے میں وہ میری بھرپور مدد کریں گے۔ صرف دو مہینوں میں ہی میں نے خوابوں ہی خوابوں میں خود کو بی اے اور ایم اے کرتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ اسی امید میں سیکرٹری کی جگہ کسی اور اچھی پوسٹ پر کام کرتے ہوئے میں خود کو تصور میں دیکھا کرتی تھی۔

وہ اکثر مجھے چھٹی کے بعد بھی آفس میں روک لیا کرتے تھے۔ ایک روز چھٹی کے بعد انہوں نے مجھ سے رکنے کے لئے کہا تو میں ہمیشہ کی طرح بڑے آرام سے رک گئی۔ یہ دیکھے بغیر کے باقی سارا اسٹاف چھٹی کر کے جا چکا ہے۔ ہمارا آفس پانچویں منزل پر تھا اور اس فلور پر ہمارے آفس کے علاوہ دو آفسز اور تھے۔ وہاں چھٹی ہمارے آفس سے پہلے ہو جایا کرتی تھی اس لئے اس وقت وہاں مکمل سناٹا اور ویرانی تھی۔ میں کم عمر اور نادان تھی تو میری ماں بھی بہت سیدھی کم عقل اور بے وقوف عورت تھی۔ ورنہ یہ بات ضرور سوچتی کہ کسی غیر معمولی کوالیفیکیشن کے نہ ہونے کے باوجود اس کی بیٹی پر اس کا باس کیوں مہربان ہو رہا ہے۔

سارے فساد کی جڑ میری یہ شکل تھی نیرہ! میری یہ حسین صورت۔ یہ خوبصورتی جس میں اس وقت بہت سی معصومیت اور بھولپن بھی شامل تھا۔ میری یہ خوبصورتی جس کا مجھے احساس نہیں تھا۔ کبھی ہم فلموں میں اس طرح کا سین دیکھتے ہیں تو کس قدر انجوائے کرتے ہیں۔ ایک لڑکی چیخ رہی ہے، بچاؤ بچاؤ کی آوازیں لگا رہی ہے۔ فلموں میں ہمیں معلوم ہوتا ہے ہیروئن پر کوئی آنچ نہیں آئے گی، ایک خوبرو سا ہیرو ساری رکاوٹیں عبور کرتا، سارے زمانے سے ٹکر لیتا اسے بچانے آ جائے گا۔ لیکن حقیقی زندگی میں کوئی ہیرو نہیں آتا، نیرہ! کوئی ہیرو، کسی صائمہ علی کو بچانے نہیں آتا نیرہ۔''

وہ میرے سامنے بیٹھ کر بھرائی ہوئی آواز میں رو رہی تھی۔ میں دم سادھے اس کی باتیں سن رہی تھی۔

''اس کا خیال تھا کہ میں کم عمر اور بے قوف سی لڑکی ہوں۔ اس کی مہربانیوں اور اپنے معاشی مسائل کا سوچتے ہوئے اور یہ بات ذہن میں رکھتے ہوئے کہ اگر میں نے اس کی بات نہ مانی تو وہ مجھے ملازمت سے نکال دے گا، پھر مجھے کہاں ملازمت ملے گی۔ خود کو بڑے آرام سے اس کے حوالے کر دوں گی۔ وہ مجھے بہت سے سنہرے خواب دکھا رہا تھا۔ میری تنخواہ میں اضافہ ہو جائے گا اور بھی بہت سی سہولتیں ملیں گی۔ اس روز مجھے یہ بات پتہ چلی تھی نیرہ! کہ یہ ملازمت مجھے میری شکل، صورت اور کم عمری کی وجہ سے ملی ہے۔ وہ دو مہینوں کی تنخواہ جو میں نے اپنے کام کا معاوضہ سمجھ کر وصول کی تھی، وہ میرے کام کی وجہ سے نہیں بلکہ میرے حسن اور خوبصورتی کی وجہ سے مجھے ملی تھی۔ میں نے خود کو اس سے کس طرح بچایا میں تمہیں بتا نہیں سکتی۔ پتہ نہیں میرے ماں باپ کی کوئی نیکیاں تھیں یا اللہ کو مجھ پر رحم آ گیا تھا جو میں اس درندے سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ اندھا دھند بھاگتی میں تیزی سے سیڑھیاں اتر کر اس بلڈنگ سے باہر نکل آئی تھی۔ مجھے پتہ نہیں تھا میں زندہ ہوں بھی یا نہیں۔

بہت دیر تک میں روڈ پر یونہی بھاگنے کے انداز میں چلنے لگی اور پھر تھک کر مین روڈ کے ایک طرف فٹ پاتھ پر بیٹھ گئی تھی۔ میرے پاس سے گزرتی ایک راہ گیر عورت نے مجھے بھکارن سمجھ کر چند سکے میری جھولی میں ڈال دیئے۔ وہ مجھے بھکارن سمجھنے میں حق بجانب تھی۔ میرا حلیہ ہی ایسا تھا۔ میرا وہ ہزار دفعہ کا پہنا ہوا سوٹ جسے اس صبح میں خوب کلف لگا کر اور استری جما کر پہن کر آئی تھی، کئی جگہ سے پھٹ چکا تھا۔ نیرہ! دوپٹہ میرا وہاں آفس کے اسی کمرے میں

ہی گر چکا تھا۔ میں کتنی دیر تک وہاں بیٹھ کر روتی رہی مجھے یاد نہیں۔ مجھے دنیا سے، زندگی سے، لوگوں سے ہر چیز سے نفرت ہو رہی تھی، شدید نفرت۔ میں نے اس لمحہ بڑی شدت سے اللہ سے اپنے لئے موت مانگی تھی۔ قریب تھا کہ میں سامنے سے آتی کسی بھی گاڑی کے آگے آ کر خود کو موت کے حوالے کر دیتی کہ اچانک میرے ذہن میں میری ماں اور چھوٹے بہن بھائیوں کے آنسوؤں سے بھیگے ہوئے چہرے آ گئے۔ اپنے گھر کا بجھا ہوا چولہا آ گیا۔ نہیں مجھے زندہ رہنا ہے۔ اپنی ماں اور بہن بھائیوں کے لئے۔

اس لمحہ میں نے ایک نیا جنم لیا تھا۔ ایک نئی صائمہ علی نے جنم لیا تھا۔ وہ پرانی، بے وقوف، سیدھی اور لوگوں پر آنکھیں بند کر کے بھروسہ کرنے والی صائمہ علی کو میں نے اسی فٹ پاتھ پر ان سکوں کے ساتھ بیٹھا چھوڑ دیا تھا اور خود واپس اپنے گھر آ گئی تھی۔ میں نے سمجھ لیا تھا کہ مجھے اسی دنیا میں اور ان ہی لوگوں کے ساتھ زندہ رہنا ہے۔ لوگ میری خاطر نہیں بدلیں گے، مجھے خود کو لوگوں کی خاطر بدلنا ہوگا۔ اپنی حفاظت کرنا سیکھنا ہوگی۔ بہادری سے زندگی سے لڑنا ہوگا۔

اس نے اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے ایک پل کے لئے میری طرف دیکھا اور میری آنکھوں میں اپنے لئے دکھ اور آنسو دیکھ کر بہت دکھ بھرے انداز میں ہلکا سا مسکرائی۔

''پھر میں نے بہت جگہوں پر نوکریاں کیں، کبھی کسی اسکول میں کیشئر کی، کبھی کسی آفس میں ٹیلی فون آپریٹر کی، کبھی ریسپشنسٹ کی۔ لیکن پھر دوبارہ میں نے کسی مرد کے ہاتھوں کبھی دھوکہ نہیں کھایا۔ میں نے لوگوں کے چہرے اور ان کی نگاہیں پڑھنا سیکھ لی تھیں۔ اپنے رویے میں سختی اور کھرا پن شامل کر لیا تھا۔ تعلیم کا سلسلہ میرا ٹوٹ گیا تھا۔ اب مجھے اپنی تعلیم سے زیادہ اپنے بہن بھائیوں کی تعلیم کی پروا تھی۔ وہ سب اچھی تعلیم حاصل کریں تاکہ انہیں میری طرح کے مسائل کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

پھر ایک روز میں اپنی ایک کولیگ کے ساتھ قسمت آزمائی کے لئے اس ریسٹورنٹ میں انٹرویو دینے کے لئے پہنچ گئی۔ وہاں نوکری کے لئے اچھی پرسنیلٹی اور اچھی انگلش لازی چیزیں تھیں اور یہ دونوں ہی چیزیں میرے پاس تھیں۔ میں دو دو جگہ کام کر کے تھک جایا کرتی تھی۔ مجھے یہاں جاب ملی تو میرا بہت بڑا مسئلہ حل ہو گیا۔ میں نے گھر جا کر خوشی خوشی امی کو اس جاب کا بتایا تو وہ بجائے خوش ہونے کے مجھ سے ناراض ہو گئیں، پورے چار دن انہوں نے مجھ سے بول چال بند رکھی۔

''میری بیٹی اب لوگوں کو برگر، پیزا اور کولڈ ڈرنکس پیش کیا کرے گی۔ یہی دن دیکھنے کے لئے زندہ تھی کیا میں کہ میری بیٹی بیرا گیری کرے گی۔''

میں انہیں سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی کہ میں بیرا گیری نہیں کر رہی۔ ہم لوگ تو کاؤنٹر پر کھڑے رہا کریں گے، لوگ اپنی ٹرے اٹھا کر خود اپنی میز پر لے کر جایا کریں گے۔ بہت مشکلوں سے امی کو منایا تو خاندان والوں کے اعتراضات شروع ہو گئے۔ ماموں، خالہ، چچا، پھوپھی سب نے خوب لعن طعن کی۔ ماموں نے تو باقاعدہ ہم لوگوں کا سوشل بائیکاٹ کر دیا۔ امی سے صاف کہہ دیا گیا کہ وہ اب ہم لوگوں سے نہیں ملا کریں گے۔ ان کی بیٹی کوٹ پتلون پہن کر فرنگیوں کے سے رنگ ڈھنگ اختیار کر کے لوگوں کو ٹرے میں کھانے سجا سجا کر دیا کرے گی۔ ایسی کمائی پر لعنت



ہے اور ایسی کمائی جس گھر میں آئے، اس گھر والوں پر بھی لعنت ہے۔ امی ان کے طعنوں پر بہت روئی تھیں۔ مجھے ان کے رونے پر شدید غصہ آیا تھا۔ جب ہم بہن بھائی بھوک سے تڑپ رہے تھے۔ جب ہمارے گھر کا چولہا بند پڑا تھا، جب مالک مکان کرایہ نہ دینے پر دھمکیوں پر دھمکیاں دے رہا تھا اس وقت کہاں تھے یہ رشتے دار۔

میں نے ان لعنت بھیجنے والوں پر جوابی لعنت بھیجی اور اپنی جاب میں مصروف ہو گئی۔ میرے لئے تو میری یہ جاب پہلی والی جابز سے زیادہ اچھی ثابت ہوئی۔ اللہ نے مجھے ترقی اور عزت بھی دے دی ہے۔''

وہ اپنی بات کے اختتام پر خوشگوار سے انداز میں مسکرائی تو بے ساختہ ہی میرا دھیان اس کے کچھ دیر پہلے کے خاموش خاموش اور بیزار سے انداز کی طرف چلا گیا۔ اس نے اتنی ساری گفتگو کے بعد اب مجھے اس بارے میں پوچھنا برا نہیں لگا، لہٰذا میں فوراً ہی اس سے اس بارے میں پوچھنے لگی۔ وہ میرا سوال سن کر مسکرا دی۔

''کچھ خاص بات نہیں یار! بس یونہی ذرا میں ٹینس ہو گئی تھی۔ مضبوط اعصاب کے حامل لوگ بھی تو کبھی کبھار کسی چھوٹی سی بات پر پریشان ہو سکتے ہیں۔''

اس نے ہنستے ہوئے جواب دیا اور پھر مجھے اس بارے میں متجسس دیکھ کر خود ہی اپنی ٹینشن کی وجہ بتانے لگی۔

''ہمارے پاس آنے والے اکثر لوگ پڑھے لکھے اور مہذب قسم کے ہیں۔ زیادہ تر کسٹمرز کلچرڈ اور تعلیم یافتہ ہوتے ہیں، لیکن ان ہی کلچرڈ اور مہذب لوگوں کے ساتھ ساتھ کبھی کبھار کچھ بے ہودہ قسم کے لوگ بھی آ جاتے ہیں۔ ایسے ہی آج کل ایک فضول سا لڑکا وہاں آ رہا ہے۔ بہت قیمتی گاڑی میں، خوب مہنگا سا موبائل ہاتھ میں لے کر کچھ پڑھا لکھا بھی ہے۔ لگتا تو یہی ہے کہ کسی اچھی یونیورسٹی میں پڑھتا ہوگا لیکن تعلیم نے اس بندے کا کچھ نہیں بگاڑا۔ امیر ماں باپ کا یہ بگڑا ہوا بیٹا آج کل مجھے بہت پریشان کر رہا ہے۔ ویسے تو خیر اس طرح کے لوگوں کی میں پروا نہیں کرتی۔ ہمارے ہاں سکیورٹی کا انتظام بھی بہت اچھا ہے لیکن کل اس بندے نے ریسٹورنٹ میں آ کر خوب ہنگامہ کیا۔ شراب پی ہوئی تھی اس نے اور شراب کے نشے میں اس نے وہاں جو توڑ پھوڑ اور ہنگامہ کیا تو پھر نوبت پولیس بلانے تک پہنچ گئی۔ اتنے لوگوں کے سامنے وہ میری طرف اشارہ کر کر کے کہہ رہا تھا کہ میں اس سے محبت کرتا ہوں لیکن یہ میری محبت کا جواب محبت سے نہیں دیتی۔ اتنے سارے لوگوں کے سامنے مجھے اس بات پر بہت شرمندگی ہوئی۔ حالانکہ بعد میں ہمارے منیجر نے مجھے بلا کر کافی تسلی دی تھی اور سمجھایا تھا کہ میں اس واقعہ پر پریشان نہ ہوں۔ ریسٹورنٹ میں، میں ہر طرح محفوظ ہوں اور یہاں سے باہر بھی مجھے گھر تک پہنچانے ریسٹورنٹ کی گاڑی ہی جاتی ہے اور یوں بھی اس طرح کے لوگ صرف اس طرح کی ہلڑ بازی ہی کر سکتے ہیں۔ ان سے ڈرنا بالکل بھی نہیں چاہئے۔''

وہ ساری بات مجھے بتا کر خاموش ہوئی، میں تب بھی اس کی طرف یونہی خاموشی سے، متحیر سے انداز میں دیکھتی رہی۔

''اس طرح کی باتوں پر میں پریشان نہیں ہوتی۔ تو یہ ابھی تازہ تازہ کل ہی کا واقعہ ہے اس لئے تمہیں میں الجھی ہوئی لگی ہوں۔ ایک دو روز کے بعد تو میں اس بات کو سرے سے بھول ہی چکی ہوں گی۔''

وہ ایک مرتبہ پھر وہی ہنستی مسکراتی ہوئی صائمہ بن گئی۔ پھر اس روز کے بعد سے میری صائمہ سے بہت اچھی دوستی ہو گئی تھی اور اس دوستی کا سبب اس کی یہی بہادری اور حوصلہ مندی تھی۔ زندگی میں تکلیفیں تو بہت سے لوگ اٹھاتے

ہیں۔ لیکن ہر کوئی ان تکلیفوں کو اتنے حوصلے سے ہمت سے برداشت نہیں کرتا جتنا وہ لڑکی کر رہی تھی۔ وہ کسی کو بھی خود پر ترس کھانے کی اجازت نہیں دیتی تھی۔ اس سے ملنے والا کوئی بھی فرد یہ اندازہ لگا ہی نہیں سکتا تھا کہ بظاہر یہ ہنستی اور کھلکھلاتی لڑکی اپنے دل کے اندر کتنے غم اور کتنے آنسو چھپائے بیٹھی ہے۔ اس نے مجھے بہت کچھ سکھایا تھا۔ ہمت، حوصلہ، بہادری، زندہ دلی۔ وہ زندگی سے خوش تھی، اسے زندگی سے کوئی شکایت نہیں تھی۔ حالانکہ وہ ابھی بھی بہت سے مسائل کا شکار تھی۔

اس سے چھوٹی بہن B.Sc. کرنے کے بعد ایک اسکول میں پڑھانے لگی تھی۔ لیکن وہ اپنی تنخواہ خود اپنے آپ پر ہی خرچ کر لیا کرتی تھی۔ صائمہ پر پہلے اگر سات افراد کی ذمہ داری تھی تو اب چھ افراد کی تھی۔ وہ انہیں بہت اچھی تعلیم دلوا رہی تھی۔ اس کی خواہش تھی کہ اس کے بھائی خوب ساری تعلیم حاصل کریں۔ یوں اس کی جدوجہد ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔

صائمہ سے کیا ملی، میری مایوسیاں اور زندگی سے شکایتیں یکسر ہی ختم ہو گئیں۔

آنے والے دنوں میں اللہ تعالیٰ نے میرے پارلر کو مزید ترقی عطا کر دی تھی، اکیلے لوگوں کے رش سے نمٹنا میرے لئے مشکل ہونے لگا تو میں نے شگفتہ اور تابندہ کو اپنے پاس ملازم رکھ لیا۔ وقت دبے پاؤں گزرتا چلا گیا تھا۔ اب مڑ کر دیکھوں تو کل کی بات لگتی ہے حالانکہ پورے پانچ برس ہو گئے ہیں مجھے اپنے پارلر کو چلاتے ہوئے۔ ان گزرتے برسوں میں امی کی صحت مزید خراب ہو گئی تو انہیں مجبوراً جاب چھوڑنی پڑ گئی۔

سچی بات تو یہ تھی کہ اب ان کے جاب کے بغیر بھی ہمارا گزارا بہت اچھی طرح ہو سکتا تھا، اسی لئے میرے سمجھانے پر وہ خاموشی سے میری بات مان گئی تھی۔

☆☆☆

میں حریم کو ساتھ لے کر قریبی مارکیٹ سے مہینے بھر کا سودا لینے آئی ہوئی تھی۔ وہ سارے کام جو پہلے امی کیا کرتی تھیں میں نے از خود اپنے ذمے لے لئے تھے۔ اب اکثر امی کے بغیر ہی کسی نہ کسی بہن کو ساتھ لے کر مارکیٹ آ جایا کرتی تھیں۔ پارلر میرا گیارہ بجے سے پہلے نہیں کھلتا تھا اور صبح صبح اتنے کوئی خاص لوگ آتے بھی نہیں تھے، اسی لئے مجھے جو بھی کام کرنا ہوتا، میں اسے صبح صبح ہی نمٹا لیا کرتی تھی۔ خریداری سے فارغ ہو کر میرا بجلی کا بل جمع کرواتے ہوئے گھر واپس جانے کا ارادہ تھا۔ مارکیٹ سے خریداری کر کے میں نے بینک کی طرف سے جانے والی سڑک پر جیسے ہی گاڑی موڑی، پیچھے سے آنے والی ایک پجیرو نے بڑی زوردار ٹکر میری آلٹو کو ماری۔ شکر تھا کہ کوئی بڑا حادثہ نہیں ہوا تھا۔ مجھے اور حریم کو کوئی چوٹیں بھی نہیں آئی تھیں، البتہ میری چھوٹی سی آلٹو اچھی خاصی زخمی ہو گئی تھی۔ اس سے پہلے کہ میں اتر کر پجیرو میں بیٹھے ان دونوں لڑکوں کے پاس پہنچتی، وہ میرا ارادہ بھانپ کر فوراً ہی تیز رفتاری سے سگنل توڑتے گاڑی بھگا لے گئے تھے۔

میرا ان سے ٹھیک ٹھاک جھگڑا کرنے اور اپنا نقصان وصول کرنے کا ارادہ تھا اسی لئے میں نے ٹریفک رکنے اور پیچھے سے آنے والی گاڑیوں کے مسلسل ہارن دینے کے باوجود بھی گاڑی بیچ سڑک پر روک دی۔ لیکن جیسے ہی انہیں بھاگتے دیکھا تو میں نے بھی آؤ دیکھا نہ تاؤ اور گاڑی فل سپیڈ میں ان کے پیچھے دوڑانی شروع کر دی۔



"باپ کی کمائی پر عیش کر رہے ہیں اور باپ کے پاس کونسی حلال کی اور محنت کی کمائی سے آئی ہو گی یہ پجیرو۔ محنت سے کمایا ہو تو درد بھی ہو۔"

میں نے با آواز بلند اپنے غصے کا اظہار حریم سے کیا۔ ایک نظر میں ہی میں دیکھ چکی تھی کہ وہ دونوں لڑکے اٹھارہ انیس سال سے زیادہ عمر کے نہیں تھے باپ کا پیسہ، باپ کی گاڑی۔ اس طرح کی بدمعاشی ایسے ہی لوگوں کو ہوتی ہے۔ حریم مجھے ان لوگوں کے پیچھے غصے بھرے انداز میں گاڑی دوڑاتے دیکھ کر کچھ سہمی ہوئی بیٹھی تھی۔

"چھوڑیں نا آپیا جانے دیں۔" وہ دوڑتے دوڑتے آہستہ سے مجھ سے بولی تو میں نے ایک تیز نگاہ اس پر ڈالی۔

"تم اپنی چونچ بند رکھو۔" اسے ڈانٹ کر میں نے دوبارہ اپنی نگاہیں ان کے تعاقب میں مرکوز کر دی تھیں۔

وہ مجھے مسلسل اپنے پیچھے آتے دیکھ کر کچھ بوکھلا گئے تھے اسی لئے گاڑی مین روڈ سے نکال کر رہائشی مکانات کی گلیوں کی طرف موڑ دی۔ ایک گلی میں وہ مڑے تو ان کے پیچھے میں نے بھی اسی گلی میں گاڑی موڑی۔ میری بہت کوششوں کے باوجود بھی وہ لوگ مجھ سے بہت آگے تھے، اس لئے میں غصے کے ساتھ ساتھ جھنجھلاہٹ اور کوفت میں بھی مبتلا ہونے لگی اور اسی جھنجھلاہٹ میں میری سپیڈ خطرناک حد تک تیز ہو گئی۔ بے احتیاطی اور غصے کی شدت کے سبب ٹرن کرتے ہی میری گاڑی سامنے سے انتہائی مناسب رفتار سے آتی، اس بالکل نئے ماڈل کی سلور بلیک کلر کی ٹویاٹا سے ٹکرائی تھی۔ گو کہ میں نے فوراً ہی بریک پر پاؤں رکھ دیا تھا، لیکن پھر بھی رکتے رکتے بھی میری گاڑی اس سامنے والی گاڑی سے ٹکرا گئی۔

سامنے ٹویوٹا میں بیٹھا بندہ بھی کوئی میرا بھائی بند ہی تھا۔ اسی لئے فوراً ہی بڑے غصے سے گاڑی کا دروازہ کھول کر اترا تھا۔ حالانکہ اس کی گاڑی بالکل صحیح سلامت تھی۔ اس مصیبت سے پیچھا چھڑانے کے لئے میں خود بھی گاڑی کا دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔ باہر نکلتے ہی جیسے ہی میں نے اپنی طرف بڑے غصے سے آتے اس بندے کو بغور دیکھا تو مجھے حیرت کا جھٹکا لگا۔

"نعمان خاور!" میرے ہونٹوں سے بے آواز اس کا نام نکلا تھا۔ وہ جو گاڑی کا دروازہ دھماکے سے بند کرتا بڑے غصے سے میری طرف بڑھا، مجھے دیکھنے کے ساتھ ہی اس کے غصے بھرے تاثرات فوراً ہی غائب ہو گئے۔

"اس قسم کی ڈرائیونگ کی امید میں آپ سے ہی رکھ سکتا تھا۔ بغیر آپ کی طرف دیکھے بھی گاڑی کی سپیڈ دیکھتے ہوئے میرے دل میں یہی بات آئی تھی کہ یہ جو کوئی بھی خاتون ہیں نیرہ ذاکر کے سے انداز میں ڈرائیو کر رہی ہیں۔"

وہ میرے پاس آ کر رک کر مسکراتے ہوئے بولا۔ میں نے اخلاقاً مسکرانے کی کوشش کی تو تھی، لیکن باوجود کوشش کے بھی میرے لبوں پر ہلکی سی بھی مسکراہٹ نہیں آ سکی۔

"آپ ہی جیسے شاگرد ہوتے ہیں جو اساتذہ کا نام روشن کرتے ہیں۔ کبھی کوئی آپ سے پوچھے کہ آپ نے گاڑی کس سے چلانی سیکھی تھی تو ازراہ مہربانی میرا نام صیغۂ راز میں ہی رکھئے گا۔" وہ کچھ شرارتی سے انداز میں مسکراہٹ لبوں پر روکتے ہوئے بولا۔ "افسوس میری ساری محنت ضائع ہو گئی۔"

اب اس کا لہجہ بہت دکھ بھرا تھا۔

"ویسے ہو کیا رہا ہے آج کل۔ وہی بیوٹی پارلر ہی چلا رہی ہیں یا کچھ اور کر رہی ہیں۔" اس نے خود ہی موضوع تبدیل کر دیا۔

"جی وہی پارلر ہی چلا رہی ہوں۔" میں نے بہت سنجیدگی اور متانت سے اسے جواب دیا، بغیر چہرے پر مسکراہٹ لائے۔

"آپ ٹھیک تو رہیں اتنے دنوں۔ کافی عرصے بعد آپ سے ملاقات ہوئی۔" وہ یوں بولا گویا ہم دونوں اس سے پہلے بھی آپس میں کافی دوستانہ انداز میں ملتے رہے ہوں۔

"جی میں خیریت سے ہوں۔" میں نے ایک مرتبہ پھر سنجیدگی سے جواب دے کر خاموشی اختیار کر لی تھی۔

اصولاً تو مجھے اس سے معذرت کرنی چاہئے تھی لیکن وہ موصوف ضرورت سے زیادہ خوش اخلاقی اور بے تکلفی کا مظاہرہ کر کے مجھے بلاوجہ چڑا رہے تھے اسی لئے میں نے فی الفور معذرت کرنے اور خشک سا انداز اختیار کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

"میں بھی آپ کی دعاؤں سے بالکل خیریت سے ہوں اور ڈرائیونگ اسکول بھی آپ کی دعاؤں سے خوب اچھا چل رہا ہے۔"

میرے خیریت پوچھے بغیر وہ خود ہی اپنی خیریت سے آگاہ کر رہا تھا۔ میں اب جلد سے جلد اس سے پیچھا چھڑانے کے چکر میں تھی۔

"دیکھیں صرف ڈیڑھ سال میں اللہ نے مجھے کتنی کامیابی دی ہے۔ پہلے صرف گلشن میں تھا میرا ڈرائیونگ سکول، اب بہادر آباد اور نارتھ میں بھی میرے اسکول کی برانچز کھل گئی ہیں اور ماشاء اللہ سے تینوں ہی جگہ میرا اسکول خوب اچھی طرح چل رہا ہے۔"

اسے میری بیزاری نظر ہی نہیں آ رہی تھی۔ بڑی خوشی، خوشی وہ اسی طرح یہ سب مجھے بتا رہا تھا۔ اپنے والٹ میں سے اس نے اپنا وزیٹنگ کارڈ نکال کر میرے ہاتھ میں پکڑایا جسے میں نے بے دلی سے ہاتھ میں لے لیا تھا۔

"اس میں میرے تینوں سکولز کے ایڈریسز موجود ہیں اور میرا موبائل نمبر بھی ہے۔ کبھی کوئی کام ہو تو مجھے کہئے گا، مجھے خوشی ہوگی۔"

وہ واپس اپنی گاڑی کی طرف مڑ گیا۔ میں شکر کا سانس لیتی جلدی سے گاڑی میں بیٹھ گئی تھی اور پھر اس سے بھی پہلے گاڑی سٹارٹ کر کے وہاں سے روانہ ہو گئی تھی۔ بینک جانے کا تو میرا موڈ ختم ہو چکا تھا اس لئے گاڑی گھر جانے والے راستے پر ڈال دی تھی۔

"اپیا! یہ آپ کے انسٹرکٹر تھے نا۔ ان ہی سے آپ نے گاڑی چلانی سیکھی تھی؟" حریم مجھ سے پوچھنے لگی۔ میں نے اس کی طرف دیکھے بغیر گردن ہلا دی تھی۔

"آپ ان سے اتنے روڈ طریقے سے کیوں ملیں۔ وہ بے چارے کتنی خوش اخلاقی سے آپ سے بات کر رہے تھے۔" حریم نے گویا مجھے میری بداخلاقی اور بدتہذیبی سے آگاہ کرنا ضروری سمجھا۔

"نا وہ بے چارے ہیں اور نا ہی اتنے با اخلاق اور بامروت۔ ان مردوں کو تمام تر اخلاقیات اور خوش اخلاقی، خوبصورت لڑکیوں کو دیکھ کر ہی یاد آتی ہیں۔ میری جگہ کوئی عمر رسیدہ اور عام سی شکل صورت کی خاتون ہوتیں



جنہوں نے ان سے گاڑی چلانا سیکھی ہوتی یہ ان کے ساتھ بھی اتنے ہی اخلاقیات دکھاتے تو میں مانتی۔ میرے روکھے اور سرد و سپاٹ انداز پر تو ان کا یہ حال تھا اگر جو میں تھوڑا سا بھی اخلاق بگھار دیتی تو حضرت بالکل ہی ریشہ خطمی ہو جاتے۔"

میں نے ایک نظر حریم پر ڈال کر اپنے خیالات کا تفصیلی اظہار کیا۔

"خیر اس طرح کے تو وہ بالکل بھی نہیں لگ رہے تھے۔ ان کے دیکھنے اور بات کرنے کا انداز بھی بہت مہذب سا تھا۔" اس نے مجھ سے فوراً ہی اختلاف کیا تھا۔

"حریم بی بی! ابھی آپ بچی ہیں۔ کالج کی دنیا سے باہر نکل کر ابھی آپ نے دیکھا ہی کیا ہے۔ یہ مردوں کی قوم کتنی خبیث ہے اس سے ابھی آپ آگاہ ہی نہیں ہیں۔" میں نے جواباً اس کا مذاق اڑایا تو وہ برا ماننے والے انداز میں خاموش ہو کر بیٹھ گئی۔

جس شخص کے بارے میں، میں یہ رائے دے رہی تھی اس سے میرا واسطہ گو بہت ہی مختصر عرصے کے لئے رہا تھا۔ لیکن اس مختصر سے عرصے میں بھی میں نے اسے بہت مہذب اور شائستہ سا انسان ہی پایا تھا۔ کبھی کوئی غیر شائستہ یا غیر مہذب انداز اختیار کرتے، میں نے اسے نہیں دیکھا تھا، لیکن پھر بھی صرف بارہ دن کسی بھی انسان کو اچھا یا برا قرار دینے کے لئے بہت ہی کم ہیں۔

یہ اب سے ڈیڑھ برس پہلے کی بات ہے جب میں پہلی مرتبہ نعمان خاور سے ملی تھی۔ ہمارے ایک کزن نے اپنی آلٹو بیچ کر نئی گاڑی خریدنے کا ارادہ کیا تو ان کی آلٹو میں نے خرید لی۔ گاڑی تو خرید لی تھی مگر چلانی ہم بہنوں میں سے کسی کو بھی نہیں آتی تھی۔ جب میں پہلی مرتبہ نعمان خاور کے ڈرائیونگ اسکول میں گئی تو ریسپشن پر موجود صاحب سے میری اس بات پر کافی بحث و تکرار ہوئی تھی کہ مجھے صبح آٹھ ساڑھے آٹھ بجے کا ٹائم چاہئے۔

اس کا کہنا تھا کہ صبح کے وقت تمام انسٹرکٹرز مصروف ہیں مجھے شام چھ بجے کا ٹائم مل سکتا ہے۔ آسانی سے قائل ہو جانا او دوسروں کی بات سمجھ لینا تو میں نے سیکھا ہی نہیں ہے، اسی لئے میں خوامخواہ اس بندے سے الجھ رہی تھی۔

میرے پیچھے ایک کمرے کا دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز آئی تھی۔ میں اپنی بحث و تکرار میں مصروف تھی میں نے اس بات پر اتنی کوئی خاص توجہ دی بھی نہیں تھی۔

"آپ صبح کا ٹائم کیوں رکھنا چاہتی ہیں؟" میرے برابر میں آکر کھڑا ہو جانے والا وہ بندہ سوالیہ انداز میں پوچھ رہا تھا۔ میں نے چونک کر اپنے برابر میں کھڑے اس شخص کو دیکھا تھا۔ اپنے حلیہ، شکل وصورت اور گفتگو کے انداز سے وہ بہت مہذب اور پڑھا لکھا انسان لگ رہا تھا لیکن میں پھر بھی اس "تو کون، میں خوامخواہ" والے انداز پر چڑ گئی تھی۔

اس سے پہلے کہ میں اپنی عادت کے مطابق کسی بدتمیزی اور منہ پھٹ پنے کا مظاہرہ کرتی اس نے اپنا تعارف کروا دیا۔

"میں نعمان خاور ہوں۔ اس ڈرائیونگ اسکول کا اونر۔ کافی دیر سے میں آپ لوگوں کی Argument سن رہا تھا۔ آیئے آپ میرے ساتھ، میں آپ کا مسئلہ حل کر دیتا ہوں۔"

ریسپشن پر کھڑے اس سڑیل مزاج بندے نے مجھ سے جان چھوٹ جانے پر گہری طمانیت بھری سانس لی تھی۔ میں اسے گھور کر دیکھتی ہوئی نعمان خاور کے ساتھ اس کے آفس میں آکر بیٹھ گئی تھی۔

"ڈرائیونگ اسکول آج کل چپے چپے پر کھلے ہیں۔ میں تو صرف آپ لوگوں کی اچھی شہرت سے متاثر ہو کر یہاں آگئی تھی۔ لیکن افسوس آپ کے ہاں تو ریسپشن پر ہی اتنے غیر پیشہ ور اور بدتمیز افراد موجود ہیں۔ مجھے بہت مایوسی ہوئی یہاں آکر۔"

میں نے اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھتے ہی برملا اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ اس نے میری تنقید بہت سنجیدگی اور بردباری سے سنی اور چہرے پر کسی قسم کے ناگوار تاثرات کو بھی نہیں آنے دیا۔

"آپ صبح میں ہی سیکھنا چاہ رہی ہیں تو چلیں ٹھیک ہے۔ میں کسی نہ کسی طرح اس کا بندوبست کر دوں گا، اصل میں آج کل جون جولائی کی چھٹیوں کی وجہ سے سیکھنے والوں کا کافی رش ہے۔ اکثر سٹوڈنٹس چھٹیوں میں ڈرائیونگ سیکھتے ہیں، اسی وجہ سے تقریباً تمام انسٹرکٹرز مکمل طور پر بک ہیں۔" وہ اس وسیع و عریض میز پر اپنے بالکل سامنے رکھی ڈائری کو کھول کر اس میں سے صفحے پلٹ پلٹ کر کچھ دیکھنے کے بعد مجھ سے مخاطب ہوا "10,9 بجے ٹھیک رہے گا۔"

اس بات پر میں نے نفی میں سر ہلایا۔

"مجھے یہی ٹائم سوٹ کرتا ہے۔ میرا اپنا بیوٹی پارلر ہے۔ میں صبح کا ہی ٹائم رکھنا چاہتی ہوں تاکہ میرے کام میں کوئی پریشانی نہ ہو۔ نو، دس بجے کا ٹائم رکھا تو خوامخواہ ٹینشن میں مبتلا رہوں گی، ڈرائیونگ سیکھنے سے زیادہ میری توجہ پارلر اور اپنے کلائنٹس کی طرف ہو جائے گی۔"

قبل اس کے کہ میں اسے خدا حافظ کہہ کر وہاں سے کھڑی ہوتی، اس نے کچھ سوچتے ہوئے مجھے ریسپشن سے فارم لے کر بھرنے اور فیس جمع کروانے کے لئے کہا۔ میرا خیال تھا کہ وہ مجھ سے معذرت کر لے گا، ڈرائیونگ اسکول بہت، میں کہیں اور سے سیکھ لوں گی۔

"آپ فارم بھر کر باہر کاؤنٹر پر فیس جمع کروا دیں۔ کل صبح آپ کی پہلی کلاس ہو گی تیار رہیے گا۔"

اس نے بات ختم کرنے والے انداز میں گویا مجھے وہاں سے چلے جانے کو کہہ دیا۔ میں نے ایک رسمی سا تھینکس کہہ کر وہاں سے اٹھ کر باہر کاؤنٹر پر آکر فیس جمع کروا دی۔

اگلے روز صبح ٹھیک آٹھ بجے ہمارے گھر کے گیٹ سے باہر ایک گاڑی کا ہارن بجا۔ گیٹ سے باہر نکل کر میں نے جیسے ہی گاڑی میں بیٹھے اپنے انسٹرکٹر کی طرف دیکھا تو ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے نعمان خاور کو دیکھ کر مجھے سخت حیرت ہوئی تھی۔ آنکھوں پر سن گلاسز چڑھائے وہ گردن موڑ کر گیٹ کی طرف ہی دیکھ رہا تھا۔ مجھے آتا دیکھ کر اس نے برابر والی سیٹ کا دروازہ کھول دیا تھا۔ مجھے اس کے خود آنے پر حیرت تو ہوئی تھی، لیکن میں نے اسے ظاہر بالکل بھی نہیں ہونے دیا تھا۔ بہت سنجیدگی سے اسے سلام کرتی برابر والی سیٹ پر بیٹھ گئی۔

"جب میں نے نیا نیا اپنا ڈرائیونگ اسکول شروع کیا تھا اس وقت میرے پاس انسٹرکٹرز بہت کم تھے اسی لئے میں خود بھی ڈرائیونگ سکھایا کرتا تھا۔ لیکن اب کیونکہ میرے پاس انسٹرکٹر کافی تعداد میں موجود ہیں، اس لئے میں مینجمنٹ دیکھتا ہوں۔ لیکن آپ کیونکہ میرے اسکول کی اچھی شہرت سے متاثر ہو کر وہاں آئی تھیں تو مجھے آپ کو مایوس کرنا اچھا نہیں لگا۔"

میرے پوچھے بغیر اس نے خود ہی بڑی سنجیدگی سے اپنے آنے کی وجہ بتائی۔



"چلیں، اب ہم اپنی کلاس شروع کرتے ہیں۔"

میری طرف دیکھے بغیر وہ اگنیشن میں چابی گھماتا ہوا دوبارہ گویا ہوا۔

میں روزانہ اس سے ڈرائیونگ کی کلاسز لینے لگی تھی وہ میرے اعتماد کی بہت تعریف کرتا، لیکن ایک ایسی بات تھی، جس پر ہر روز وہ مجھے ٹوکتا اور ہر روز میں اس نصیحت کو سننے کے بعد فوراً ہی بھول جایا کرتی تھی۔ اسٹیرنگ سنبھالتے ہی پتہ نہیں کیا ہوتا تھا میرا ایک دم سے دل گاڑی کو بہت تیز تیز دوڑانے کو چاہنے لگتا اور میں بے سوچے سمجھے رفتار بڑھا دیا کرتی۔

"آپ کا کیا مستقبل میں بس ڈرائیور بننے کا ارادہ ہے؟"

چوتھی کلاس کے اختتام پر جب اس روز میں نے گاڑی کو انتہائی تیز رفتاری سے چلاتے ہوئے اپنے گیٹ پر لاکر روکا تو اس نے بڑی سنجیدگی سے مجھ سے پوچھا۔ "یقین کریں۔ آپ کے گاڑی چلانے کا انداز بالکل منی بسوں اور کوچز کے ڈرائیوروں جیسا ہے۔" اس نے بہت مہذب سا انداز اختیار کر کے مجھ پر طنز کرنے کی کوشش کی۔

اپنی کہی ہوئی بات پر وہ خود ہی محظوظ سے انداز میں ہنس پڑا، ہلکی سی مسکراہٹ میرے لبوں پر بھی بکھر گئی تھی۔

"اور یہ بات بھی سچ ہے کہ اس طرح کی ڈرائیونگ آپ کو کوئی خاتون انسٹرکٹر کبھی بھی نہیں سکھا سکتی تھیں۔ یہ نیک نامی میرے ہی نامۂ اعمال میں لکھی گئی تھی۔"

اس نے افسوس بھرے انداز میں تبصرہ کرتے ہوئے گاڑی سٹارٹ کر دی۔ اور میں بھی گیٹ کھول کر اس کے کمنٹس کے بارے میں ہی سوچتے ہوئے گھر کے اندر آگئی۔

پھر اس روز شاید میری نویں یا دسویں کلاس تھی جب ایک روڈ پر سڑک کے بیچوں بیچ ایک بس کے ایکسیڈنٹ کی وجہ سے ٹریفک جام ہو گیا تھا اور اس ٹریفک جام میں ہم لوگ بھی پھنس گئے تھے۔ ہارن کا شور برپا تھا، سب لوگ بلاوجہ آپس میں الجھ رہے تھے۔ حالانکہ اس ایکسیڈنٹ میں وہاں پھنسے ہوئے لوگوں میں سے کسی کا بھی قصور نہیں تھا، لیکن لوگ بے صبری اور جلدی سے جلدی اپنی منزل پر پہنچنے کی دھن میں خوامخواہ ایک دوسرے سے جھگڑ رہے تھے۔ اتنے دنوں میں، میں پہلی مرتبہ نروس ہوئی تھی۔ حالانکہ برابر میں بیٹھے اپنے انسٹرکٹر کی وجہ سے مجھے کسی قدر اطمینان تو تھا، لیکن آگے پیچھے سے بجتے ہارن اور لوگوں کی چیخ و پکار نے پھر بھی مجھے کچھ نروس کر دیا تھا۔ ہماری گاڑی اتنی بری طرح پھنسی ہوئی تھی کہ وہ میرے بجائے خود ڈرائیونگ سیٹ پر نہیں آ سکتا تھا۔ گو کہ گاڑی کا کنٹرول تو اس کے پاس بھی تھا لیکن اسٹیرنگ تو میرے ہی ہاتھ میں تھا۔ وہ بہت پرسکون اور نارمل تھا۔ مجھے مسلسل گائیڈ کرتا اور سمجھاتا، اس نے اسٹیرنگ پر ہاتھ رکھ کر گاڑی کو تھوڑا سا خود بھی کنٹرول کرنے کی کوشش کی تو میں نے فوراً ہی اسٹیرنگ پر سے اپنا بایاں ہاتھ ہٹا لیا۔ حالانکہ اس کا ہاتھ میرے ہاتھ سے بہت دور تھا۔ لیکن پھر بھی میں نے اپنا ہاتھ جلدی سے اپنی گود میں رکھ لیا تھا۔

وہ میری طرح بالکل متوجہ نہیں تھا اس کی توجہ گاڑی اور اسٹیرنگ کی طرف تھی لیکن میرے اس طرح ایک دم سے ہاتھ ہٹانے پر اس نے بہت چونک کر مجھے دیکھا۔ صرف ایک پل کے لئے مجھے بغور دیکھنے کے بعد اس نے اپنی نگاہیں واپس ہٹا لی تھیں۔ میں نے اس کی نگاہوں پر کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ اس رش میں سے گاڑی نکلی تو اس نے اپنا

ہاتھ اسٹیئرنگ پر سے ہٹا لیا اور پرسکون سے انداز میں سیٹ سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اس کے ہاتھ ہٹانے پر میں نے دوبارہ اپنا ہٹایا ہوا ہاتھ اسٹیئرنگ پر رکھ لیا تھا۔

''بہت اچھا چانس مل گیا آج کورش میں سے گاڑی نکالنے کا طریقہ سمجھنے کا۔ جو کراچی میں ڈرائیو کرسکتا ہے وہ دنیا کے کسی بھی ملک اور کسی بھی شہر میں ڈرائیو کرسکتا ہے، یہ بات یونہی نہیں کہی جاتی آپ کو کراچی میں ڈرائیو کرنا ہے تو اس طرح کے حالات اور واقعات سے آپ کو اکثر گزرنا پڑے۔''

اس نے کچھ دیر پہلے کی صورتحال پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا۔

اس آخری کلاس کے بعد میری دوبارہ کبھی اس سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ اور آج جب ڈیڑھ سال بعد وہ مجھے دوبارہ ملا تو میں اس کے خود کو پہچان لینے اور نام کے ساتھ یاد رکھنے پر بہت حیران ہوئی۔ کتنے لوگ آتے اور جاتے ہوں گے، اس کے ڈرائیونگ اسکول میں ڈرائیونگ سیکھنے کے لئے۔ ان میں سے کسی کو نام کے ساتھ یاد رکھنا اور وہ بھی اتنے دنوں بعد۔ میں اس بندے کی اچھی یادداشت پر حیران تو ضرور ہوئی تھی لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ مجھے اس کا بلاوجہ گفتگو کرنا اور فری ہونا بھی پسند نہیں آیا تھا۔ آئندہ کبھی ان صاحب سے ملاقات ہوئی اور انہوں نے میرے ساتھ خوش اخلاقی دکھانے کی کوشش کی تو میں ان کا مزاج درست کردوں گی۔ آج کے واقعہ پر میں نے دل ہی دل میں خود سے کہا تھا۔

☆☆☆

امی کو دو تین دِنوں سے کافی شدید کھانسی ہو رہی تھی۔ ڈاکٹروں کے پاس جانے کی تو وہ ہمیشہ سے چور تھیں اسی لئے کھانسی کی دوا میڈیکل سٹور سے منگوا کر اپنا علاج خود ہی کر رہی تھیں۔ میرے بہت کہنے سننے اور ناراض ہونے پر وہ آج میرے ساتھ ڈاکٹر کے پاس چلنے کے لئے تیار ہوئی تھیں۔

''ذرا سی کھانسی ہی تو ہے۔ خود ہی ٹھیک ہو جائے گی پھر دوا تو میں باقاعدگی سے لے ہی رہی ہوں۔''

وہ جانے کے لئے دل سے ابھی بھی آمادہ نہیں تھیں بس صرف میری وجہ سے مجبوراً مان گئی تھیں۔ میں نے اپنے مخصوص انداز میں گاڑی دوڑانی شروع کی تو امی دل پر ہاتھ رکھ کر بولیں۔

''کتنی بار تمہیں سمجھایا ہے نیرہ! گاڑی آہستہ چلایا کرو۔ کبھی کسی لڑکی کو بس ڈرائیوروں کے سے انداز میں گاڑی چلاتے دیکھا ہے۔''

میں نے ان کی ڈانٹ پر فوراً ہی گاڑی کی رفتار کم کر دی۔ لیکن یہ امی کی وہ واحد نصیحت تھی جو میں روز سنتی اور روز بھول جایا کرتی۔ امی کے بس ڈرائیوروں کہنے پر مجھے بے ساختہ نعمان کے دیئے جانے والے کمنٹس یاد آ گئے تھے۔

''شام میں پارلر تھوڑی دیر کے لئے تابندہ کے سپرد کر دینا۔ کچھ مہمان آنے والے ہیں۔''

کچھ دیر کے بعد امی نے بہت سنجیدگی سے حکم دینے والے انداز میں مجھ سے کہا تو میں نے کسی قسم کے سوال جواب کے بغیر خاموشی سے سر ہلا دیا، جب سے ثانیہ کی ہمارے خالہ زاد بھائی جہانگیر سے منگنی ہوئی تھی۔ تب سے امی کو میری فکر پہلے سے بھی زیادہ رہنے لگی تھی۔ سال بھر پہلے ثانیہ کی جہانگیر کے ساتھ منگنی ہوئی تھی خالہ کا گھرانہ بہت اچھا تھا اور پھر جہانگیر بھی بہت اچھا اور پڑھا لکھا لڑکا تھا اس لئے وہ رشتہ امی کو پسند تو بہت تھا، لیکن ثانیہ کے لئے نہیں بلکہ



میرے لئے۔ اپنی سگی بہن سے ان کا ایسا کوئی تکلف بھی نہیں تھا، اسی لئے انہوں نے خالہ سے یہ بات کہی تھی کہ انہوں نے میرے بجائے ثانیہ کا رشتہ کیوں مانگا ہے۔

''میرے لئے تو نیرہ اور ثانیہ میں کوئی فرق نہیں۔ دونوں ہی مجھے ایک جیسی عزیز ہیں۔ لیکن بات تو جہانگیر کی خواہش کی ہے۔ وہ ثانیہ ہی سے شادی کرنا چاہتا ہے۔''

خالہ نے امی کی بات کے جواب میں اپنی طرف سے صفائی پیش کی اور جہانگیر کی پسند کا حوالہ دیا تو وہ خاموش ہو گئیں۔ یوں ثانیہ کی جہانگیر کے ساتھ منگنی ہو گئی۔ اور امی میری شادی کے لئے پہلے سے بھی زیادہ سرگرم۔

ابتداء میں، میں نے امی سے کافی بحث و تکرار کی۔ ''جب تمہارا پارلر نہیں تھا تو کیا تب ہم بھوکے مر رہے تھے۔ جب پہلے اللہ نے عزت سے گزارا کروا دیا تو اب بھی وہ کوئی نہ کوئی سبیل پیدا کر دے گا۔ ثانیہ کی پڑھائی مکمل ہونے والی ہے۔ حریم اور افشین گریجویشن کے بعد ماسٹرز کرنا چاہیں گی تو کچھ ٹیوشنز وغیرہ کر لیں گی۔ میں بھی کوئی معذور یا اپاہج نہیں ہو گئی۔ کچھ نہ کچھ ہو ہی جائے گا۔ مجھے تمہاری شادی کی فکر ہے۔ ثانیہ سے پہلے میں تمہاری شادی کرنا چاہتی ہوں۔''

اس ایک سال کے عرصے میں بہت سے رشتے آئے تھے، کچھ کو امی نے ریجیکٹ کر دیا تھا اور کچھ نے ہمیں۔

☆☆☆

''تم ہمیشہ اس وقت نازل ہوا کرو۔'' میں نے پارلر میں آنے کے ساتھ ہی صائمہ کو گھور کر دیکھا تھا۔

''کل رات کتنی دیر سے فارغ ہوئی تھی میں۔ میرا خیال ہے دو تو بج ہی گئے تھے۔ ذرا سی دیر ہی سوئی ہوں گی کہ سحری کا ٹائم ہو گیا۔ اب تھوڑے سکون سے سو رہی تھی تو تم ٹپک پڑیں۔''

میں اسے صبح صبح پارلر میں دیکھ کر ناراض ہو رہی تھی۔ وہ میری ناراضی کے جواب میں کچھ بھی نہیں بولی۔ بس پھیکے سے انداز میں ذرا سا مسکرا دی تھی۔

''اب جلدی پھوٹو۔ کام کیا کروانا ہے۔''

میں اس کی خاموشی پر دھیان دیئے بغیر بڑے پروفیشنل انداز میں بولی۔ خالص قسم کا کاروباری اور پروفیشنل لہجہ۔ میرا خیال تھا۔ وہ جواباً دھونس جما کر کچھ کہے گی۔ لیکن جب وہ جواب میں کچھ بھی نہیں بولی تو میں نے اتنی دیر میں پہلی مرتبہ بہت چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔ اس کی آنکھیں اور چہرہ دیکھ کر ایسا لگ رہا تھا جیسے یہاں آنے سے پہلے بھی وہ بہت سا رو چکی ہو۔

''کیا ہوا صائمہ؟'' میں اس کے پاس ہی صوفے پر بیٹھ گئی۔

''آج میں تمہارے پاس بیٹھ کر رونے آئی ہوں نیرہ! مجھے اس وقت رونے کے لئے ایک کندھے کی تلاش ہے اور تم سے بہتر اور تم سے زیادہ معتبر مجھے کوئی نہ لگا۔''

میری بات کا جواب دیتے دیتے اس کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔

''مجھے پتہ ہے کہ تم سے اگر میں اپنا دکھ کہوں تو تم اسے سمجھ لوگی۔ آج صائمہ بہت تنہا ہے نیرہ! اسے اپنے پاس بیٹھ کر رونے دو۔ اگر میں نہیں روئی تو میرا دل پھٹ جائے گا۔''

وہ پتہ نہیں کس طرح کی باتیں کر رہی تھی۔ وہ زندہ دل اور خوش مزاج لڑکی اتنی کم ہمت نہیں تھی کہ کسی چھوٹی سی بات پر یوں دل ہار بیٹھتی۔ کوئی بڑی بات ہوئی تھی، اس کی برداشت اور ہمت سے بڑی جو وہ یوں بکھر گئی تھی۔

میں چپ چاپ الجھے ہوئے انداز میں اسے روتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ ''میں زندگی سے لڑ رہی ہوں، کتنے برسوں سے لڑ رہی ہوں۔ لوگوں کے طنز، زندگی کی سختیاں ہر ناگوار بات خوشی خوشی سہتی رہی۔ کس کے لئے؟ اپنی ماں اور بہن بھائیوں کے لئے۔ بڑا آسان تھا میرے لئے کہ میں انہیں ان کے حال پر چھوڑ کر خود اپنے لئے کوئی بہتر فیصلہ کر لیتی۔ اس ریسٹورنٹ میں جاب سے بہت پہلے اس وقت جب میرا کردار لوگوں کی نظروں میں مشکوک نہیں ٹھہرا تھا، میں اس وقت اپنے لئے کوئی فیصلہ کر چکی تھی۔ بہت لوگ تھے جنہیں میری خوبصورتی اور کردار کی مضبوطی اچھی لگتی تھی، میں خودغرض ہوتی تو ایسا ہی کرتی۔ میرے پاس اعلیٰ تعلیم نہیں تھی، اس کے حاصل کرنے کے مواقع بھی نہیں تھے ایسے میں یہ جاب میرے لئے بہترین جاب تھی اور اس ریسٹورنٹ میں جاب کس کے لئے کی تھی میں نے؟ اپنے ہی ان ہی لوگوں کے لئے کرتی رہی، انہی کے لئے جنہیں آج میرے اس کام سے نفرت ہو رہی ہے۔ میری جاب ان کے لئے شرمندگی کا باعث بن رہی ہے۔ میری بہن کہتی ہے کہ اس کے لئے ایک بہترین رشتہ صرف میری وجہ سے طے نہیں ہوسکا۔ لڑکے والوں کو یہ بات پتہ چل گئی تھی کہ لڑکی کی بہن ایک فاسٹ فوڈ ریسٹورنٹ میں جاب کر رہی ہے۔ میری وہ بہن جسے میں نے پڑھایا لکھایا، اس قابل بنایا کہ آج وہ خود اپنے لئے کمانے کے قابل ہوگئی ہے۔ اسے میرے اور اپنے رشتے پر شرمندگی ہوتی ہے۔ میں اس کی خوشیوں کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہوں اور میرا وہ بھائی جس کے کالج کی فیس اور پڑھائی لکھائی کے تمام اخراجات میری اسی جاب سے پورے ہوتے ہیں۔ اسے میری اس جاب سے شدید نفرت ہے۔ میں اپنے بہن بھائیوں کے لئے باعث ندامت ہوں۔ انہیں اس بات سے ڈر لگتا ہے کہ ان کے کسی جاننے والے کو یہ بات نہ پتہ چل جائے کہ ان کی بہن ایک فاسٹ فوڈ ریسٹورنٹ میں جاب کرتی ہے۔''

وہ میرے گلے لگی دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی۔ میں بے بسی سے اسے روتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔

''دوسرے لوگ کچھ بھی کہتے تھے۔ میں پروا نہیں کرتی تھی لیکن وہ جن کے لئے میں یہ سب کچھ کر رہی ہوں، ان کی تحقیر بھری نگاہیں اور ہتک آمیز باتیں میں سہہ نہیں پا رہی۔ میں نے کیا غلط کیا ہے نیرہ! شرافت کی زندگی گزاری، کبھی کسی مرد کو اپنے قریب بھی نہیں آنے دیا۔ میرے پاس اتنی تعلیم ہوتی تو کسی اچھی ہی جگہ ملازمت کرتی لیکن اگر ایسا نہیں ہوسکا تو اس میں میرا قصور کیا ہے؟ یہ لوگ مجھے یوں ذلیل کیوں کر رہے ہیں؟'' وہ میرے کندھے سے لگی روتی رہی اور میں اس کا دکھ دل کی گہرائیوں سے محسوس کرتی ہولے ہولے اس کے بالوں میں انگلیاں چلاتی رہی۔

''تمہیں میں نے امیرزادے کے بارے میں بتایا تھا نا نیرہ! وہ جو کہتا تھا کہ اسے مجھ سے محبت ہے۔ پتہ ہے ایک روز میں نے اس سے کیا کہا تھا؟'' وہ میرے کندھے پر سے سر ہٹا کر سیدھے ہوتے ہوئے بولی۔ میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی جانب دیکھا۔

''میں نے اس سے کہا کہ اگر تمہیں مجھ سے ایسی ہی شدید محبت ہوگئی ہے تو پھر شریف لوگوں کی طرح میرے گھر رشتہ بھجواؤ۔ وہ میری اس بات پر خوب ہنسا تھا۔ اس نے جواب میں کچھ بھی نہیں کہا لیکن اس کے چہرے پر



صاف لکھا ہوا تھا، شادی اور تم سے؟ شادی تو میں کسی معزز خاندان کی پڑھی لکھی لڑکی سے کروں گا۔ تم جیسی ریسٹورنٹ میں کام کرنے والی لڑکی کے ساتھ تو میں صرف دل لگی کرنے آتا ہوں۔ تب میں نے اس کی حقارت سے بھری ہوئی ہنسی کو نظر انداز کر دیا، لیکن آج مجھے اس کی وہ ہنسی اپنے چاروں جانب گونجتی ہوئی سنائی دے رہی ہے۔ ریسٹورنٹ میں کام کرنے والی لڑکی، لوگوں کو مسکرا مسکرا کر ویلکم کہنے والی لڑکی؟ ٹرے میں پیزا، برگر، چکن، فرائز اور کولڈ ڈرنکس رکھ رکھ کر دینے والی لڑکی۔''

وہ ایک مرتبہ پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ میں اسے تاسف سے دیکھے جا رہی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے کس طرح تسلی دوں، اس کے دکھوں کا مداوا کس طرح کروں۔

''سب لوگ اس طرح کے نہیں ہوتے صائمہ! صرف چند لوگوں کے منفی رویوں سے بددل ہو کر تم اس طرح کی باتیں مت سوچو۔ تم بھی اتنی اچھی ہو جتنی میں ہوں یا جتنی دوسری کوئی بھی لڑکی ہوسکتی ہے۔''

وہ مایوسی کی جن انتہاؤں پر پہنچی ہوئی تھی، میں اسے ان سے نکالنا چاہتی تھی۔ وہ میری بات سن کر طنزیہ انداز میں ہنس دی۔

''تم مجھے یہ طفل تسلیاں مت دو نیرہ! مجھے سچائیوں کا سامنا کرنے دو۔ یہ بے کار کے دلاسے اور کتابی باتیں مجھے ذرا بھی متاثر نہیں کر سکتیں۔''

میں بے بسی سے اس کی طنزیہ ہنسی کو دیکھ رہی تھی۔ مجھے احساس ہوا کہ میری کوئی تسلی اور کوئی ہمدردانہ بات اس کے کچھ کام نہیں آسکتی۔

وہ میرے پاس بیٹھ کر رو لے اور اپنے دکھ کہنے آئی تھی۔ میں اسے روتا ہوا دیکھتی رہی۔ پھر وہ اپنے آنسو صاف کرتی ہوئی جانے کے لئے کھڑی ہوگئی تھی۔

''تھوڑی دیر رک جاؤ صائمہ۔'' میں اسے اس حالت میں جانے نہیں دینا چاہتی تھی۔ وہ انکار میں سر ہلاتی پارلر کا دروازہ کھول کر باہر نکل گئی تو میں بھی اس کے پیچھے پیچھے باہر آگئی۔

''تم پریشان مت ہو، میں بالکل ٹھیک ہوں۔'' وہ میرے چہرے پر پھیلی تشویش اور فکرمندی کو دیکھ کر دھیمے سے ہنسی۔ ایسی ہنسی جس میں آنسو ہی آنسو بھرے ہوئے تھے۔

☆☆☆

آج چاند رات تھی، اس لئے پارلر میں رش بھی غیر معمولی تھا۔ میں، اور میری ہیلپرز بری طرح مصروف تھے۔ شام میں صفیہ باجی اپنی بیٹی کے ساتھ آگئیں۔

صفیہ باجی جب سے میں نے پارلر شروع کیا۔ اسی وقت سے ہی آ رہی تھیں۔ ان کا گھر ہمارے ہی بلاک میں تھا۔ خود بہت سادگی سے رہتی تھیں۔ صرف اپنی بیٹی کے بالوں کی کٹنگ کے لئے وہ میرے پاس آتی تھیں۔ بہت اچھی اور مخلص خاتون تھیں وہ۔ سیدھی سادی اور منافقت سے پاک۔ وہ میری بہت بڑی مداح تھیں۔

اس وقت جب وہ آئیں تو میں نے مسکراتے ہوئے ان کا استقبال کیا۔ اس وقت پارلر میں صرف ایک ہی لڑکی بیٹھی ہوئی تھی جو شگفتہ سے بالوں کی کٹنگ کروا رہی تھی۔ اس لڑکی کو فارغ کر کے میرا ایک گھنٹہ پارلر بند کرنے کا

ارادہ تھا۔ اندر گھر میں خالہ کی فیملی، ثانیہ کی عیدی لے کر آئی ہوئی تھی۔ مجھے تھوڑی دیر ان لوگوں کو بھی کمپنی دینا تھی۔ صفیہ باجی سے یہ کہنا کہ آپ مغرب کی نماز کے بعد آیئے گا مجھے مناسب نہیں لگا، اس لئے ان کی بیٹی کو کرسی پر بیٹھنے کا کہہ کر خود ہی اس کی کٹنگ کے لئے کرسی کے پاس جانے لگی۔

''مجھے تم سے ایک بہت ضروری بات کرنی ہے نیرہ! شگفتہ فارغ ہونے ہی والی ہے۔ شہوار کی کٹنگ وہ کر دے گی۔'' انہوں نے شگفتہ کے ہاتھ میں ہیئر ڈرائیر دیکھ کر کہا میں سر ہلاتی ہوئی ان کے پاس آ کر صوفے پر بیٹھی تو وہ بہت آہستہ آواز میں تمہید باندھنے لگیں۔

''ویسے تو یہ بات مجھے تمہاری امی سے کرنی چاہئے تھی، لیکن پھر میں نے سوچا کہ پتہ نہیں تم اس بات کو پسند کرو گی یا نہیں، اس لئے تم سے ہی بات کر لیتی ہوں۔''

وہ میرے بالکل قریب بیٹھ کر اتنی آہستہ آواز میں بات کر رہی تھیں کہ پارلر کے دوسرے سرے پر موجود شگفتہ کو اس لڑکی کو اور ان کی بیٹی کو ان کی آواز سنائی نہیں دے سکتی تھی۔

''آج میں تمہارے پاس آئی ہی اس لئے ہوں۔ یہ شہوار تو زبردستی لٹک کر ساتھ آ گئی ہے کہ مجھے کٹنگ کروانی ہے۔''

''یہ آفاق ہے۔ میرا سگا بھائی نہیں ہے لیکن مجھے سگوں سے بڑھ کر عزیز ہے۔ بہت اچھا اور بہت شریف لڑکا ہے۔'' انہوں نے اپنے پرس میں سے ایک تصویر نکال کر میرے ہاتھ میں پکڑائی۔ میں نے ایک نگاہ تصویر پر ڈالی، وہ جو کوئی بھی تھا، بہت ہینڈسم تھا۔

''مجھے بہن بنایا ہوا ہے اس نے اور صرف بہن کہتا ہی نہیں بلکہ سمجھتا بھی ہے۔ کافی سال پہلے اس کی والدہ بھی حیات تھیں۔ میرے بڑے بیٹے کو ٹیوشن پڑھانے آتا تھا یہ ان دنوں۔ والد اس کے بچپن میں ہی انتقال کر گئے تھے، بہن بھائی بھی کوئی نہیں ہیں۔ تب یہ خود بھی شاید انٹر کر رہا تھا۔ ٹیوشنز پڑھا کر یہاں وہاں چھوٹی موٹی نوکریاں کر کے اپنی معذور اور بیمار ماں کا علاج کرنے کے لئے پیسہ جمع کرتا تھا، بہت نیک اور خدمت گزار۔ نہایت توجہ سے وہ اپنی معذور ماں کو اپنے ہاتھوں سے کھانا کھلایا کرتا تھا۔ اس کی سب ضرورتوں کا خیال رکھتا تھا۔ اس طرح میں نے کسی لڑکے کو ماں کی خدمت کرتے نہیں دیکھا جس طرح یہ کرتا تھا، تب ہی سے اس کا ہمارے گھر آنا جانا ہے۔ مجھے آپا کہتے کہتے اس نے سچ مچ مجھے اپنی بہن ہی مان لیا۔ پھر والدہ کا انتقال ہو گیا تو یہ بالکل ہی تنہا ہو گیا۔ بی کام کے بعد ہی اسے ایک فرم میں جاب مل گئی تھی۔ اپنی محنت اور ذہانت سے اس نے اپنی جاب میں بہت ترقی کر لی ہے۔ آج کل ایک پرائیویٹ یونیورسٹی سے ایوننگ میں ایم بی اے بھی کر رہا ہے۔ صرف ایک سمسٹر باقی ہے اس کا۔ اس نے اتنی سخت اور اتنی مشکل زندگی گزاری ہے کہ میرا دل چاہتا ہے اس کے لئے کوئی بہت مخلص سی لڑکی ڈھونڈ کر لاؤں، جو اس کی زندگی میں خوشیاں ہی خوشیاں بھر دے۔ اس کے لئے لڑکی ڈھونڈتے ہوئے میرے ذہن میں سب سے پہلے تم آئیں۔ تم جو خود بھی اتنی جدوجہد سے بھرپور زندگی گزار رہی ہو۔ تم اسے ویسی ہی محبت اور ویسا سکون دے سکتی ہو جس کا وہ مستحق ہے اور جو دوسری کوئی اور لڑکی شاید اسے نہیں دے سکتی۔''

صفیہ باجی کی نگاہوں میں میرے لئے خلوص ہی خلوص تھا۔ اپنے بارے میں مجھے کوئی خوش فہمیاں لاحق نہیں



تھیں۔ میں کسی شہزادہ گلفام کا انتظار نہیں کر رہی تھی۔ امی ثانیہ کی شادی سے پہلے میری شادی کرنا چاہتی تھیں۔ انہیں دن رات میری شادی کی فکر ستاتی رہتی تھی، ایسے میں یہ ایک آئیڈیل رشتہ تھا میرے لئے۔ امی نے مجھے یہ بات نہیں بتائی، لیکن میں جانتی ہوں کہ اس سے پہلے میرے لئے جو جو بھی رشتے آئے یا تو وہ اس لالچ میں آتے تھے کہ لڑکی خوب کما رہی ہے۔ ان کے بیٹے کو بیوی کے ذریعے معاشی استحکام ملے گا امی ان لوگوں کا لالچی انداز دیکھ کر انکار کر دیا کرتی تھیں۔

دوسری قسم ان لوگوں کی ہوتی جو یہ دیکھ کر کہ لڑکی مالی طور پر اتنی مستحکم ہے۔ یہ انہیں یا ان کے بیٹے کو کیا خاطر میں لائے گی۔ مجھے ریجیکٹ کر دیا کرتے۔

ان کے خیال میں مالی طور پر مستحکم لڑکیاں شوہروں اور سسرالوں کو جوتی کی نوک پر رکھتی ہیں۔ انہیں دبا کر نہیں رکھا جا سکتا۔ انہیں کوئی دبی دبائی اور خاموشی سے ظلم سہنے والی لڑکی چاہئے تھی۔ جسے پیسہ کمانا نہ آتا ہو۔ جو شوہر کے پیسے کی محتاج ہو۔ اس لئے میری شادی میں مشکل پیش آ رہی تھی۔

قریب تھا کہ میں صفیہ باجی سے یہ کہہ کر وہ اس بارے میں امی سے بات کر لیں ایک طرح سے انہیں اپنی طرف سے رضامندی دے دیتی کہ اچانک میرے کانوں میں ایک روتی ہوئی آواز گونجی۔

''ہر عید پر میں سوچتی ہوں کہ اگلی عید اس عید سے مختلف اور خوشیوں کی پیامبر بن کر آئے گی، لیکن وہ عید کبھی نہیں آئی نیرہ! اور مجھ جیسی لڑکیوں کی زندگی میں وہ عید کبھی آتی بھی نہیں ہے۔''

''آپ کو شاید یہ بات معلوم نہیں صفیہ باجی، میری تو منگنی ہو چکی ہے۔''

بالکل بے ساختگی میں یہ جملہ میرے منہ سے نکلا تھا۔ اپنے منہ سے نکلے ان لفظوں پر میں خود حیران ہو رہی تھی۔ میں کوئی بہت دیالو اور سخی نہیں کہ ایک ایسی چیز جو میرے لئے بھی اتنی ہی اہم اور ضروری ہے جتنی صائمہ کے لئے اسے خوشی خوشی اس کے حوالے کرنے کا سوچوں۔

صفیہ باجی کے چہرے پر میرا جواب سن کر قدرے افسردگی چھا گئی تھی۔

''تم نے کبھی بتایا ہی نہیں۔''

''بس کبھی ایسا کوئی ذکر ہی نہیں نکلا۔'' میں نے ان کے سوال کا سنجیدگی سے جواب دیا۔ ''آپ کے بھائی نے بہت مشکل اور سخت زندگی گزاری ہے صفیہ باجی تو یقیناً انہیں وہ لوگ ضرور اچھے لگتے ہوں گے جو مشکلات کا ہمت اور بہادری سے مقابلہ کرتے ہیں۔ میں آپ کو اچھی لگتی ہوں، لیکن سچی بات تو یہ ہے کہ میں نے ایسی کوئی خاص مشکلات کا سامنا کبھی نہیں کیا۔ جو کچھ میں کر رہی ہوں، وہ تو ہمارے اردگرد بے شمار لڑکیاں کر رہی ہیں۔ لیکن ایک ایسی لڑکی کو میں جانتی ہوں جو عام لڑکیوں سے بہت مختلف ہے۔ صائمہ علی نام ہے اس کا۔ میری بہت اچھی دوست ہے وہ۔ جن حالات سے وہ گزری اور جس طرح اس نے اپنی عزت اور آبرو کی حفاظت کی ایسا ہر لڑکی نہیں کر سکتی۔ ابھی آپ نے بتایا ہے کہ آپ کے بھائی نے بہت ہی سختیاں جھیلیں، چھوٹی بڑی ہر طرح کی نوکریاں کیں تو پھر یقیناً وہ محنت کی عظمت کے حقیقی معنوں سے واقف بھی ہوں گے۔ کسی بھی ایسے کام کو وہ حقیر نہیں سمجھتے ہوں گے جس میں انسان شرافت اور عزت کے ساتھ اپنی روزی کماتا ہو۔''

وہ بہت غور سے میری بات سن رہی تھیں۔ میں انہیں صائمہ کی جدوجہد کی کہانی اور اس کی موجودہ جاب کے بارے میں مختصر لفظوں میں سب کچھ بتاتی چلی گئی تھی۔

"آپ ایک بار اس سے مل ضرور لیں۔ آپ کو میری سب باتوں پر یقین آ جائے گا۔" میں نے اپنی گفتگو کے اختتام پر ان سے کہا تھا۔

"میں ابھی کچھ نہیں کہہ سکتی نیرہ! آفاق سے بات کر کے ہی میں کوئی فیصلہ کر سکتی ہوں۔ یوں تو اس نے خود بھی جب وہ بی کام کر رہا تھا تب ایک فاسٹ فوڈ ریسٹورنٹ میں جاب کی تھی لیکن اپنی ہونے والی بیوی کے لئے اس حوالے سے اس کے کیا خیالات ہیں۔ یہ مجھے اس سے بات کر کے ہی پتہ چلے گا۔" انہوں نے بہت سنجیدگی اور صاف گوئی سے میری بات کا جواب دیا اور پھر گھڑی میں ٹائم دیکھ کر کھڑی ہو گئیں۔

میں نے ان کی بات سنتے ہوئے کچھ سوچ کر جلدی جلدی ایک کاغذ پر صائمہ کے گھر کا پتہ اور فون نمبر لکھ کر ان کے ہاتھ میں پکڑایا۔ انہوں نے خاموشی سے وہ کاغذ میرے ہاتھ سے لے لیا تھا۔

ساری رات پارلر کھلا رہا تھا۔ فجر سے کچھ پہلے ہی ہم لوگ فارغ ہوئے تھے۔ پارلر سے فارغ ہو کر میں کمرے میں آ کر لیٹ تو گئی تھی، لیکن ہمیشہ کی طرح بے خبر ہو کر سوئی نہیں تھی۔ اتنا تھکنے کے باوجود بھی مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں گھر میں چہل پہل شروع ہو گئی تھی۔ امی کی اور تینوں بہنوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ جب نیند نہیں آ رہی تھی تو بے کار لیٹ کر میں کیا کرتی۔ مجھے کمرے سے نکلتا دیکھ کر امی تعجب سے بولیں۔

"تم ابھی تک سوئیں نہیں؟"

"نیند نہیں آ رہی اس لئے میں اٹھ گئی۔"

ہمیشہ میرا عید کا دن سوتے ہوئے گزرتا تھا اور آج میرا سونے کا دل ہی نہیں چاہ رہا تھا۔

گھر میں قربانی ہوئی تھی، ثانیہ اور حریم کچن میں گھسی ہوئی تھیں۔ امی اور افشین بھی پتہ نہیں کہاں مصروف تھیں۔ میں صوفے پر نیم دراز گزری رات کی مصروفیت کے بارے میں سوچ رہی تھی جب فون کی بیل بجی۔ میں نے لیٹے لیٹے ہی ہاتھ بڑھا کر ریسیور اٹھایا تو دوسری طرف سے آتی صائمہ کی آواز کو سن کر میں ایک دم اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔ مجھے ایسا لگا جیسے میں لاشعوری طور پر اس فون کی منتظر تھی اور شاید اس لئے ٹیلی فون کے بالکل قریب بیٹھی ہوئی تھی۔

"کل رات ہمارے گھر ایک خاتون آئی تھیں، صفیہ نام تھا ان کا۔ تم نے بھیجا تھا انہیں۔ وہ تمہارا نام لے رہی تھیں۔ کہہ رہی تھیں کہ نیرہ نے انہیں یہاں رشتے لے جانے کے لئے کہا ہے۔" اس کی بات سن کر میرا دل خوشی کے احساس سے بھر گیا تھا۔

"ہاں۔ میں نے انہیں تمہارا بتایا تھا۔ میری کافی پرانی جاننے والی ہیں صفیہ باجی۔" میں جواباً گویا ہوئی اور پھر فوراً ہی پر تجسس انداز میں اس سے پوچھنے لگی۔

"پھر آگے کیا بات ہوئی؟"

"ابھی تو کچھ خاص بات نہیں ہوئی۔ بس وہ امی سے اور مجھ سے ملیں۔ میں تو سارا وقت حیران ہی ہوتی رہی۔ وہ یہ بات جاننے کے باوجود بھی کہ میں کیا جاب کرتی ہوں، میرے لئے رشتہ لے آئیں۔ ان کے انداز سے ایسا



لگ رہا تھا کہ انہوں نے مجھے پسند کر لیا ہے۔ آج وہ اپنے بھائی کو لے کر آئیں گی ہمارے گھر۔ میں ابھی تک حیرت میں مبتلا ہوں۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ یہ سب ہو کیا رہا ہے۔"

وہ بہت ڈرے ڈرے انداز میں بول رہی تھی۔ میں اس کی بے یقینی اور خوف کو پوری طرح محسوس کر رہی تھی۔

"یہ سب بھی بالکل اسی طرح کی سچائی ہے، جیسے اس سے پہلے کے تمام دکھ اور تمام تکلیفیں سچائیاں تھیں۔ کل تمہیں میری باتیں طفل تسلیاں اور کتابی باتیں لگ رہی تھیں۔ لیکن صائمہ سچائی یہی ہے کہ زندگی میں ہمیشہ اگر سب کچھ اچھا نہیں ہوتا تو ہمیشہ سب کچھ برا بھی نہیں ہوتا۔ اگر ہمیں ملنے والے سب لوگ اچھے نہیں ہوتے تو سب لوگ برے بھی نہیں ہوتے۔"

وہ سب باتیں جو اگر کل میں اس سے کہتی تو وہ انہیں رتی برابر بھی اہمیت نہ دیتی، اس وقت وہ انہیں بڑی توجہ سے سن رہی تھی۔

"خدا کبھی اپنے بندوں پر ان کی برداشت سے بڑھ کر آزمائش نہیں ڈالتا۔ تم بالکل بے خوف ہو کر اپنے اللہ پر یقین رکھتے ہوئے ان خوشیوں کا استقبال کرو۔"

"لیکن نیرہ......!" اس نے کچھ مضطرب سے انداز میں مجھے مخاطب کیا تھا لیکن میں نے اس کی بات کاٹ دی تھی۔

"کوئی لیکن نہیں صائمہ!! تم آج آفاق سے ملو۔ تم دونوں ساتھ بیٹھ کر بات کرو، اس نے بھی تمہاری ہی طرح کی سخت زندگی گزاری ہے، وہ تمہاری سب مشکلات کو سمجھ لے گا۔ تم دیکھنا، وہ تم سے کتنی محبت کرے گا، تمہاری کتنی قدر کرے گا۔ شادی ہو جانے کے بعد کوئی تمہارا رشتہ ختم تو نہیں ہو جائے گا اپنے گھر والوں کے ساتھ۔ اس بار تم صرف اپنے بارے میں سوچو۔ صرف اپنے بارے میں۔ اور اپنی بہن سے میری طرف سے یہ ضرور کہہ دینا کہ تمہاری جس جاب کی وجہ سے اس کی شادی نہیں ہو پا رہی تھی، اسی جاب کے ہوتے ہوئے خود تمہاری اپنی شادی ہو رہی ہے۔"

وہ ایک مرتبہ پھر بہت خاموشی سے میری باتیں سن رہی تھی۔

"اچھا اب میں فون بند کر رہی ہوں۔ اب رات میں تمہیں فون کروں گی، تم میرے لئے وہ خوشخبری تیار رکھنا جو میں سننا چاہتی ہوں اور ایک بات میں تمہیں پہلے ہی کلیئر کروں کہ اس عید پر میں نے برائیڈل میک اپ کے پیسے بڑھا دیئے ہیں۔ تم یہ امید مت رکھنا کہ میں دوستی کا لحاظ کرتے ہوئے تم سے پرانے والے پیسے وصول کروں گی۔"

میں نے سنجیدگی کا چولا اتار کر شوخی سے کہا تو وہ بے ساختہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اس کی وہ ہنسی میں نے بڑی توجہ سے سنی تھی۔ کل جو لڑکی زندگی سے مایوس تھی، آج اس کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔ میں اس بات پر بے تحاشہ خوش تھی۔ بہت خوشی خوشی میں نے اپنا عید کا جوڑا پہنا۔ مجھے اس طرح اہتمام سے تیار ہوتا اور بہت زیادہ خوش دیکھ کر امی سمیت سب ہی حیران تھے۔

خوب اچھی طرح تیار ہو کر اور ثانیہ اور حریم کی عید کی تمام سپیشل ڈشز سے لطف اندوز ہونے کے بعد میں افشین سے اپنے ہاتھوں پر مہندی لگوانے بیٹھ گئی تھی۔ ثانیہ بھی وہیں بیٹھی مختلف چینلز پر عید کے دن خصوصی پروگرام دیکھنے اور ان پر تبصرے کرنے میں مصروف تھی۔ فون کی بیل بجی۔ فون شاید حریم نے ریسیو کیا تھا، اس نے امی کو آواز

دے کر بلایا تھا۔

"مجھے صبح سے ہی شک ہو رہا تھا کہ ضرور دال میں کچھ کالا ہے۔ ہمیشہ کی طرح دنیا مافیا سے بے خبر ہو کر سویا بھی نہیں گیا، پھر یہ اہتمام اتنی تیاری اور تو اور مہندی بھی لگوائی جا رہی ہے۔ کیوں میری پیاری بہنو! ذرا ذہن پر زور ڈال کر یہ بات تو بتاؤ کہ اس سے پہلے بھی کسی عید پر اپیا کو مہندی لگاتے دیکھا ہے؟"

حریم نے اندر آتے ساتھ ہی میری طرف معنی خیز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے ثانیہ اور افشین کو مخاطب کیا۔ ان لوگوں نے فوراً ہی نفی میں سر ہلا کر اس کے سوال کا جواب دے دیا تھا۔ اسی خاموشی سے سامنے صوفے پر بیٹھ گئی تھیں۔

"صاف صاف بتا بھی چکو آخر بات کیا ہے؟" ثانیہ اور افشین نے بے صبری سے پوچھا تھا۔

"نیرہ نے جہاں سے ڈرائیونگ سیکھی تھی، کیا نام بتا رہی تھیں وہ؟"

امی جواب دیتے دیتے خاموش ہو کر اس کا نام سوچنے لگیں تو حریم نے فوراً ان کی مشکل آسان کر دی۔

"نعمان خاور۔"

"ہاں نعمان خاور اس کی والدہ کا فون تھا۔ وہ نیرہ کو اپنے بیٹے کے لئے پرپوز کرنا چاہتی ہیں۔ وہ کہہ رہی تھیں کہ ایک دم سے اس طرح گھر آ جانا جبکہ انہیں یہ بات بھی نہیں معلوم کہ نیرہ کی کہیں بات چیت طے تو نہیں ہو گئی، انہیں مناسب نہیں لگا۔ وہ فون پر مجھ سے یہی پوچھ رہی تھیں کہ نیرہ کی کہیں بات طے تو نہیں ہوئی۔"

حریم سمیت ثانیہ اور افشین بھی میری طرف بڑی معنی خیز نگاہوں سے دیکھ رہی تھیں۔ وہ میری تیاریوں کو جس بات کے ساتھ جوڑ رہی تھیں وہ تو میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی۔ میں اس بات پر اتنی حیران تھی کہ سکتے کے سے عالم میں منہ پھاڑے بیٹھی تھی۔ میری سیدھی سادی، ان رومینٹک زندگی میں اس طرح کی کسی بات کا تو دور دور تک گزر نہیں تھا۔ امی یہ بات بتاتے ہوئے کہ وہ لوگ ابھی تھوڑی دیر میں آنے والے ہیں، کمرے سے اٹھ کر چلی گئی تھیں۔ ان کے جاتے ہی وہ تینوں جو امی کا تھوڑا بہت لحاظ کر رہی تھیں، پنجے جھاڑ کر میرے پیچھے پڑ گئیں۔

شام میں وہ لوگ آئے تھے۔ کچھ دیر بعد ثانیہ مجھے بلانے آئی تو اپنی تمام تر خود اعتمادی کے باوجود مجھے ڈرائنگ روم میں جا کر نعمان کی فیملی سے ملنا بہت مشکل کام لگا۔ پتہ نہیں اس کی والدہ کی میرے بارے میں کیا رائے ہو گی، پتہ نہیں وہ کیا سمجھی ہوں گی کہ میرا ان کے بیٹے کے ساتھ کتنا زبردست قسم کا افیئر چلا ہے۔ یہی سب سوچتے ہوئے میں ٹشو اٹھا کر میک اپ صاف کرنے لگی تو ثانیہ چلائی۔

"اتنی اچھی لگ رہی ہیں، کیوں خوامخواہ حلیہ بگاڑ رہی ہیں۔"

"وہ سمجھیں گی۔ میں خاص طور پر ان کی وجہ سے تیار ہوئی ہوں۔" میں نے جھنجھلائے ہوئے انداز میں اسے سمجھانا چاہا تو وہ ہنستے ہوئے بولی۔

"چھوڑیں وہی کیوں، سمجھ تو ہم لوگ بھی یہی رہے ہیں۔" میں نے جواباً اسے غصے سے دیکھا تھا لیکن وہ میرے غصے کو نظر انداز کر کے ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے مجھے ڈرائنگ روم میں لے آئی تھی۔ وہاں نعمان کی ممی اور بہن امی کے ساتھ باتیں کرنے میں مصروف تھیں۔ وہ بڑی گرم جوشی سے مجھ سے ملیں۔ ان لوگوں کا انداز میری توقعات کے



بالکل برعکس تھا۔ نہ انہوں نے سر سے لے کر پاؤں تک مجھے خوب گھور گھور کر پوسٹ مارٹم کرنے والے انداز میں دیکھا تھا نہ یہ بات جتائی تھی کہ وہ بیٹے کے کہنے پر یہاں آئی ہیں۔ میں پانچ دس منٹ میں وہاں سے بڑی چالاکی سے کھسک لی تھی۔ یہ ساری باتیں اور یہ تمام تر صورتحال میں اتنی آسانی سے قبول کر لینے والوں میں سے نہیں تھی۔ مجھے صائمہ کی بات بھی یاد آ رہی تھی۔

"خوامخواہ سامنے والے بندے کو چیلنج نہ کرو۔ اس کو یہ نہ جتاؤ کہ تم ناقابل تسخیر ہو۔ اگر ایسا کرو گی تو وہ تمہیں تسخیر کرنے کو تمہارے پیچھے ہی پڑ جائے گا۔"

ان مردوں کی انا ذرا ذرا سی بات سے ہرٹ ہوتی ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ ایسا صرف مجھے تسخیر کرنے کو کر رہا ہے۔ مردوں کے بارے میں تو یوں بھی میری رائے کچھ خاص اچھی نہیں۔ میں تیزی سے چلتی ہوئی اپنے کمرے میں آئی اور اپنے بیگ کو پورا کا پورا بیڈ پر الٹ کر اس میں سے گرے ڈھیر سارے کاغذوں اور دیگر الم غلم میں سے ایک وزیٹنگ کارڈ ڈھونڈنے کی کوشش کر رہی تھی۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد میں اسے ڈھونڈ نکالنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ اس پر لکھا ہوا موبائل نمبر میں نے بڑی تیز رفتاری سے ملایا تھا۔

"ہیلو!" اس کی بڑی جاندار آواز سنائی دی تھی۔

"میں نیرہ۔" میں نے ابھی صرف اپنا نام ہی لیا تھا کہ وہ بری طرح چونکتے ہوئے بولا۔

"جی نیرہ! کہیے کیا کام ہے؟" بولنے کا انداز ایسا تھا جیسے اس سے پہلے میرے سب کام وہی کرتا رہا تھا۔

میں اس معصومانہ انداز پر چڑ گئی تھی۔

"آپ نے اپنی ممی کو میرے گھر کیوں بھیجا ہے؟" میرا انداز بہت رعب دار اور بڑا دوٹوک قسم کا تھا۔

"وہ جس بھی وجہ سے آئی ہیں، اس کی انہوں نے وجہ بھی ضرور بتائی ہو گی۔" اس نے مہذب انداز میں جواب دیا۔

"میں آپ سے سننا چاہتی ہوں وہ وجہ۔" میں اس سے بات کرتے ہوئے بالکل بھی نروس نہیں تھی۔ میرا لہجہ بہت پراعتماد سا تھا۔

"کسی لڑکی کے گھر رشتہ اسی لئے بھجوایا جاتا ہے کہ اس سے شادی کرنی ہوتی ہے۔" وہاں ہنوز وہی سنجیدہ اور مہذب سا انداز تھا۔

"یہی تو پوچھ رہی ہوں کہ آپ مجھ ہی سے کیوں شادی کرنا چاہتے ہیں۔" میں نے مجھ ہی پر خاص زور ڈالا تھا۔

"مجھے ریسیور میں سے اس کی ہلکی سی ہنسی کی آواز سنائی دی تھی۔ پتہ نہیں میرے سوال میں ایسی کیا بات تھی جسے وہ انجوائے کر رہا تھا۔

"اگر آپ وعدہ کریں کہ آپ کے اس سوال کے جواب میں، میں جو بات بتاؤں گا، اسے سن کر آپ ناراض نہیں ہوں گی تو میں بتانے کے لئے تیار ہوں۔"

پتہ نہیں اس کے لہجے میں ایسی کیا بات تھی، جو میں بری طرح بوکھلا گئی تھی۔ مجھ سے جواب میں کچھ بھی نہیں بولا جا سکا تھا۔ اس نے ایک سیکنڈ میرے جواب کا انتظار کیا پھر خود ہی بولنا شروع ہو گیا۔

''اب چاہے تمہیں میرا تم کہنا کتنا ہی برا کیوں نہ لگے لیکن مجھے تو یہ بات بڑی عجیب سی لگے گی کہ جس لڑکی سے میں اظہار محبت کرنے جا رہا ہوں اسے آپ کے پرتکلف انداز میں مخاطب کروں۔''

مجھے اپنی طراری رخصت ہوتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ اسی وقت گیٹ پر بیل کی آواز سنائی دی تھی۔

''گیٹ پر بیل ہو رہی ہے۔ میں آپ سے بعد میں بات کروں گی۔''

میں نے اس کا جواب سنے بغیر ہی فون بند کر دیا تھا۔ خود کو اس مشکل سے نکالنے کا اور کوئی طریقہ میری سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ بیل چھوٹے والے گیٹ پر ہوئی تھی اور اس گیٹ کی بیل کی آواز ڈرائنگ روم اور لاؤنج میں ذرا مشکل سے سنائی دیتی تھی۔ میں تیزی سے چلتی ہوئی گیٹ پر آئی اور پتہ نہیں کس دھیان میں بغیر پوچھے ہی گیٹ کھول دیا۔ جس شخص سے ابھی ابھی میں فون پر پیچھا چھڑا کر آئی تھی۔ اسے اپنے سامنے کھڑے دیکھ کر میری ساری بہادری اور اعتماد ہوا ہو گیا۔ وہ میرے چہرے پر بکھری حیرانی اور گھبراہٹ کو دیکھ کر مسکرا دیا۔

''ممی اور صدف کو چھوڑ کر بھی میں ہی گیا تھا اور اب واپس لینے کے لئے آ رہا تھا جب راستے میں تم نے مجھے اپنے رعب اور دبدبے سے ڈرانے کی کوشش کی۔''

اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے موبائل کی طرف اشارہ کر کے ہنستے ہوئے کہا۔

''تم جیسی لڑکی سے اس قسم کے بلکہ اس سے بھی زیادہ خطرناک ردعمل کی میں توقع کر رہا تھا۔ ڈر کے مارے اسی لئے خود تمہیں فون بھی نہیں کیا تھا۔ ممی سے کہا کہ آپ ہی فون کریں، آپ کے لحاظ میں شاید خاتون کچھ نہ کہیں۔ کتنی بزدلانہ بات ہے یہ کہ جس لڑکی سے آپ محبت کرتے ہوں، اس سے شادی کرنے کا فیصلہ کر چکے ہوں، اس سے اپنی محبت کا اظہار نہ کر سکیں۔''

وہ بہت مزے سے اپنی بزدلی کا اور مجھ سے خوفزدہ ہونے کا اعتراف کر رہا تھا۔ میں خاموشی سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ اسے اندر آنے کو بھی نہیں کہا۔

''تم سے شادی کا فیصلہ میں اسی وقت کر چکا تھا جب تم نے مجھ سے ڈرائیونگ سیکھی تھی۔ تمہاری بہادری، تمہارا اعتماد اور سب سے بڑھ کر خود اپنی حفاظت کرنے والا ایسا انداز کہ کوئی تم سے غیر ضروری بات تک کرنے کی ہمت نہ کر سکے۔ مجھے اتنا اچھا اور اتنا مختلف لگا تھا کہ میں نے سوچ لیا تھا مجھے اسی لڑکی سے شادی کرنی ہے۔ لیکن میں چاہتے ہوئے بھی تم سے اپنی اس خواہش کا اظہار نہیں کر سکا تھا۔ مجھے ڈر لگا تھا کہ کہیں تم یہ نہ سمجھو کہ میں تمہارے ساتھ فلرٹ کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ میں اس وقت شادی کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ مجھے اپنی دونوں بہنوں کی شادیاں کرنا تھیں، ان کی شادی سے پہلے میں اپنے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ مجھے پتہ تھا تم تک پہنچنے کا صحیح طریقہ یہی ہے کہ تمہارے گھر آ کر باقاعدہ رشتہ مانگا جائے۔ اس بات کے بغیر خالی خولی میرے اظہار محبت اور شادی کے وعدے کو تو تم کچرے کے ڈبے میں ہی ڈال دیتیں اور مجھے ایسی ایسی سناتیں کہ میرے ہوش ٹھکانے آ جاتے۔ یہی سب سوچ کر میں خاموش رہا تھا۔ یہ سوچ کر کہ اگر میری لگن سچی ہے تو یہ لڑکی مجھے ہی ملے گی۔ اور آج جب اس وقت میں تمہارے سامنے کھڑا ہوں تو پورے اعتماد سے یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ میری لگن اور میری محبت بالکل سچی تھی۔''

محبت کیسی ہوتی ہے؟ چاہے جانے کا احساس کیسا ہوتا ہے؟ آپ کسی کے لئے اتنے اہم ہو جائیں کہ وہ اکثر



آپ ہی کے بارے میں سوچا کرے۔

یہ احساس کیسا ہوتا ہے مجھے ان سوالوں کے جواب مل رہے تھے۔ محبت میرے بالکل قریب تھی۔ میں اسے دیکھ سکتی تھی، محسوس کر سکتی تھی، جس کے لئے میں بہت اہم تھی اور وہ میرے بالکل سامنے کھڑا تھا۔ خوشیوں نے چاروں طرف سے مجھے اپنے گھیرے میں لیا ہوا تھا۔ میرے لئے یہ عید پچھلی تمام عیدوں سے مختلف اور کبھی بھی نہ بھولی جانے والی عید تھی۔

آٹھ سال کی عمر میں اپنی انگلش کی کتاب میں، میں نے ایک سبق پڑھا تھا اس کی ایک بات مجھے آج تک یاد ہے۔

''خوشیوں کو پانا چاہتے ہو تو کبھی ان کے پیچھے بھاگنے کی کوشش نہ کرو، بلکہ دوسروں کے دلوں میں خوشیاں پیدا کرنے کی کوشش کرو۔ تم دیکھو گے کہ خوشیاں خود تمہارے پیچھے بھاگنے لگی ہیں۔''

میرے ساتھ بالکل ایسا ہی ہوا ہے۔ وہ ایک دل جس تک عید کی کوئی خوشی نہیں پہنچ رہی تھی، میں نے اس تک عید کی خوشیاں پہنچانے کی کوشش کی بالکل بے غرض ہو کر۔ یہ سوچے بغیر کے اس نیکی کے عوض اللہ مجھے کچھ عطا کرے گا یا نہیں۔ ہم سب بہت سی نیکیاں کرنا چاہتے ہیں۔ صدقات، خیرات، عبادتیں۔ کسی کے دل میں خوشی کا احساس پیدا کروانا بھی تو ایک عبادت ہے۔

یہ عید تو گزر چکی، اگلی عید پر آپ بھی ایسی ہی کوئی چھوٹی سی نیکی کر کے دیکھئے گا، مجھے پتہ ہے میری ہی طرح آپ سب بھی خوشیوں کے جگنو اپنی مٹھی میں بند کر لینا چاہتے ہیں۔

ہم سب خوشیوں کو ڈھونڈتے ہیں، انہیں پانا چاہتے ہیں۔ ان کے پیچھے پیچھے بھاگتے ہیں، ہمیں ہمارے حصے کی سب خوشیاں مل جائیں ہم اس کوشش میں لگے رہتے ہیں۔ ایک بار کسی دل کو خوشی دینے کی کوشش کر کے ضرور دیکھیں، میری ہی طرح خوشیاں آپ کے بھی تعاقب میں آ جائیں گی۔ آپ خوشیوں کو نہیں ڈھونڈیں گے، خوشیاں آپ کو ڈھونڈیں گی۔

......❁......

# دل ہی تو ہے نہ سنگ وخشت

اپنے گھر کی بیک پر بنے اس گھر کو وہ اس کی تعمیر کے ابتدائی مرحلے سے ہی بغور دیکھ رہی تھی۔ بنیادوں سے لے کر تزئین و آرائش کے اختتامی مرحلوں تک اسے اس گھر کے طرز تعمیر نے نہایت متاثر کیا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ یہاں کے مکین نہایت ہی باذوق تھے۔ ہزار گز پر بنا وہ ایک بڑا ہی کھلا ہوادار اور دلکش بنگلہ تھا۔ رمیثہ کا تو پورا بچپن ہی اسی گھر میں گزرا تھا اور یہ اس کا مخصوص کمرہ بچپن سے اس کے زیر استعمال رہا تھا۔ اسے شروع سے ہی شور شرابے سے الجھن ہوتی تھی۔ اس لیے اس کا بیڈ روم سب سے الگ تھلگ تھا۔ اپنے کمرے ہی میں کھلنے والی بالکونی میں بیٹھ کر اگلے روز کے لیکچرز کی تیاری کرنا اس کا من پسند کام تھا۔ تقریباً سال بھر پہلے شیخ صاحب کی فیملی یہ مکان فروخت کر کے کینیڈا سیٹل ہو گئی تھی۔ اسے بس اتنا ہی پتا تھا کہ شیخ صاحب نے یہ مکان کسی امریکہ سے پاکستان منتقل ہونے والی فیملی کے ہاتھ فروخت کیا ہے۔ اس سے زیادہ نہ اسے معلوم تھا اور نہ ہی اس نے معلوم کرنے کی کوشش کی تھی۔ وہ اپنے حال میں مگن رہنے والے لوگوں میں سے تھی۔ اسے بس اتنا فرق پڑا تھا کہ پہلے جب وہ شام میں بالکونی میں بیٹھی لیکچرز تیار کر رہی ہوتی تو کبھی مونا اور کبھی آنٹی سے آمنا سامنا ہو جاتا تھا اور پھر ان لوگوں کے ساتھ تھوڑی بہت گپ شپ بھی ہو جاتی تھی۔ ان لوگوں کے جانے سے وہ جگہ ایک دم ویران لگنے لگی تھی۔ نئے خریدار نے پورا مکان گرا کر نئے سرے سے بنوایا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ گھر کی ڈیزائنگ اور پلاننگ کسی بہت ماہر آرکیٹیکٹ سے کروائی گئی تھی۔ وہ اکثر کام کرتے کرتے بے خیالی میں بیٹھی کافی دیر تک اس گھر کو تکتی رہتی تھی۔ جب گھر کی بیک سائیڈ اتنی شاندار تھی تو فرنٹ تو پتا نہیں کتنا عالیشان ہوگا۔ رمیثہ اکثر سوچا کرتی تھی۔ پچھلی گلی میں کیونکہ شیخ صاحب کے علاوہ اور کسی فیملی کے ساتھ اتنے گہرے مراسم نہیں تھے اسی لیے وہاں اتنا آنا جانا بھی نہیں ہوتا تھا۔

آٹھ نو ماہ کے عرصے میں وہ گھر مکمل ہو گیا تھا۔ نئے مالک کو شاید پودوں سے بہت لگاؤ تھا اسی لیے وہاں ایک سے ایک عمدہ اور خوبصورت پودے نظر آتے تھے۔ کیاریوں میں لگے وہ چھوٹے چھوٹے پودے جنہیں کل تناور درخت بن جانا تھا۔ وہ بلاوجہ ہی وہاں کی ایک ایک چیز کو دلچسپی سے دیکھتی اور وہاں مستقبل قریب میں بسنے والے لوگوں کے ذوق کو سراہتی۔ پھر ایک روز جب وہ اریب اور عاشی کے ساتھ رات میں واک کے لیے نکلی تو خاص طور پر اپنی پچھلی گلی میں بھی گئی اور اس گھر کو سامنے سے دیکھ کر بے اختیار اس کے منہ سے واہ نکل گیا۔ ابھی تک وہ گھر خالی ہی



تھا۔ رمیثہ کے خیال سے تو گھر ہر لحاظ سے مکمل ہو گیا تھا پتا نہیں کیا وجہ تھی کہ وہاں ابھی تک کوئی بسا نہیں تھا۔ اتنے خوبصورت گھر میں یہ ویرانی اسے اچھی نہیں لگ رہی تھی۔

''خالہ! پیچھے والے گھر میں نئے لوگ شفٹ ہو گئے ہیں۔'' ناشتے کی میز پر وہ اریب، عاشی اور بھیا بیٹھے تھے جبکہ بھابھی کچن میں مصروف تھیں۔ اریب کی بات پر اس نے چونک کر اخبار پر سے سر اٹھایا۔

''تمہیں کیسے پتا چلا؟''

''میں کل خرم کے گھر گیا تھا تو وہاں پورٹیکو میں بلیک سوک کھڑی تھی اور اندر لائٹس بھی آن نظر آ رہی تھیں۔'' اریب نے جواباً کہا تھا۔

صبح کا وقت اتنی افراتفری اور بھاگ دوڑ والا ہوتا تھا کہ اس سے زیادہ تفصیلات وہ معلوم نہیں کر سکتی تھی۔ روزانہ اس کی صبح فجر کی اذان کے ساتھ ہو جاتی تھی۔ نماز سے فارغ ہو کر وہ جلدی جلدی امی کے لیے ناشتا تیار کرتی۔ انہیں نماز کے فوراً بعد چائے چاہیے ہوتی تھی۔ اگر کسی روز اسے چائے لے جانے میں دیر ہو جاتی تو وہ ناراض ہو کر ناشتہ بھی نہیں کرتی تھیں۔ مسلسل بیماری نے انہیں ضدی بنا دیا تھا۔ اسے بچوں کی طرح انہیں بہلانا پڑتا تھا۔ ہارٹ پیشنٹ تو وہ برسوں سے تھیں، مگر پانچ سال پہلے جب وہ گھر کی سیڑھیاں اترتے گر پڑی تھیں۔ اس کے بعد سے ان کی بیک بون اتنی بری طرح متاثر ہوئی تھی کہ تمام تر علاج معالجے اور احتیاط کے باوجود تکلیف اپنی جگہ برقرار تھی۔ ایسا بھی نہیں تھا کہ وہ بالکل معذور ہی ہو گئی تھیں۔ وہ چل پھر لیتی تھیں، مگر جھک کر ان سے کوئی کام نہیں کیا جاتا تھا اسی لئے رمیثہ کو ان پانچ سالوں میں ان کا پہلے سے بھی زیادہ خیال رکھنا پڑا تھا۔

امی کو ناشتہ کرا کے اور ان کے دیگر تمام کام یعنی بال بنانا کپڑے بدلوانا وغیرہ انجام دیکر وہ جلدی جلدی اپنی تیاری کرتی تھی۔ ناشتے کی تیاری میں بھابھی کا ہاتھ بٹانا لازمی تھا ورنہ ان کا منہ پھول جاتا تھا اور اپنی زندگی کے اتنے برسوں میں وہ ابھی تک اس بات کی عادی نہ ہو سکی تھی کہ کسی کا بنا ہوا منہ دیکھ سکے۔ کوئی اس سے ناراض ہو جائے۔ یہ بات اس کی برداشت سے باہر تھی۔ چاہے سامنے والے کو خوش کرنے کے لئے اسے اپنا کوئی نقصان ہی کیوں نہ کرنا پڑے، وہ ایسا کرتی ضرور تھی۔

پہلے کالج جانے کے لیے اس نے وین لگوائی ہوئی تھی۔ اس وقت تو اور بھی زیادہ ٹینشن ہوتی تھی، اگر وین نکل گئی تو پھر رکشہ یا بس سے جانا پڑے گا۔ یہ سوچ اسے پریشان کرتی رہتی تھی۔ جب سے اس نے اپنی ذاتی گاڑی خریدی تھی۔ اس ٹینشن سے جان چھوٹ گئی تھی۔ گاڑی خریدنے سے جہاں اسے آنے جانے کی سہولت ہوئی تھی، وہیں کچھ پریشانیاں بھی پیدا ہو گئی تھیں۔ وقت بے وقت بھابھی کو شاپنگ یا کسی بھی کام سے باہر جانا ہوتا تو اسے ڈرائیوری کے فرائض انجام دینے پڑتے۔ بھیا اپنی گاڑی آفس لے جاتے تھے۔ انہیں یوں بھی بھابی کی شاپنگ وغیرہ سے سخت الجھن ہوتی تھی۔ عاشی یا سمعیہ کو اپنی فرینڈز کے گھر جانا ہوتا تو اس کی منتیں شروع ہو جاتیں اور اسے موڈ نہ ہونے کے باوجود ان کی بات ماننی پڑتی۔ اریب اور عاشی تو اسکول بھی اسی کے ساتھ جایا کرتے تھے۔ وہ دونوں ہی اس سے بہت مانوس تھے۔ اپیا اور جواد بھائی ریاض میں رہتے تھے۔ جواد بھائی وہاں ایک امریکن فرم میں بڑی اچھی پوسٹ پر فائز تھے۔ شروع شروع میں تو دونوں بچے وہاں اپیا کے پاس ہی رہے۔ مگر جیسے جیسے بچے بڑے ہونے لگے۔ اپیا اور جواد بھائی دونوں ہی کو بچوں کی تعلیم

وغیرہ کی طرف سے پریشانی ہونے لگی۔ جواد بھائی کو خاص طور پر سعودی عرب کا معیار تعلیم اپنے بچوں کے لیے مناسب نہیں لگ رہا تھا۔ اسی لیے آخر کار یہی فیصلہ کیا گیا کہ دونوں کو کراچی بھیج دیا جائے۔ جواد بھائی کے والدین تو تھے نہیں۔ بہن بھائی بھی سب پاکستان سے باہر مقیم تھے اس لیے طے یہی کیا گیا کہ بچوں کو ان کے ننھیال میں چھوڑ دیا جائے۔

شروع شروع میں دونوں ہی نے اپنے ماں باپ کو بہت مس کیا۔ مگر پھر رفتہ رفتہ وہ دونوں یہاں سیٹ ہوتے چلے گئے۔ انہیں یہاں مانوس کرنے میں رمیشہ کا بھی بہت بڑا ہاتھ تھا۔ جب وہ لوگ یہاں آئے تھے۔ رمیشہ تازہ تازہ یونیورسٹی سے فارغ ہوئی تھی۔ اسے رزلٹ کا انتظار تھا اس کے بعد اس کا لیکچر شپ کا ارادہ تھا۔ فراغت کے ان دنوں میں اس نے بچوں کو بھرپور وقت دیا تھا۔ تب ہی آٹھ سالہ عاشی اور چھ سالہ اریب کی اپنی اکلوتی خالہ سے اتنی اچھی انڈر اسٹینڈنگ ہوگئی تھی کہ پھر انہیں چھٹیوں میں بھی سعودی عرب جانے میں مزہ نہیں آتا تھا۔ ان سات برسوں میں اس نے ان دونوں کا بہت خیال رکھا تھا۔

عاشی کا یہ اسکول کا آخری سال تھا جبکہ اریب ایٹتھ اسٹینڈرڈ میں تھا۔ صرف عاشی اور اریب ہی نہیں بلکہ سمعیہ، سنی اور عبداللہ کی بھی وہ پسندیدہ تھی۔ انہیں بھی اپنی یہ چارمنگ اور نس مکھ پھپھو دل و جان سے عزیز تھی۔ سمعیہ سب بچوں میں بڑی تھی۔ اسی حساب سے سب پر بڑی بہنوں والا رعب جمانے کی کوشش کرتی تھی، جس سے سب ہی چڑا کرتے تھے۔ وہ ہوم اکنامکس کالج میں فرسٹ ائیر کی اسٹوڈنٹ تھی۔ جبکہ سنی اور عبداللہ اریب ہی کے کلاس فیلو تھے۔

☆☆☆

اریب کی دی ہوئی اطلاع کی تصدیق یوں ہوگئی کہ اسی روز رات میں اس نے اپنے کمرے کے سامنے والے کمرے کی لائٹ جلی دیکھی تھی۔ بند پردوں کے پیچھے اسے کوئی بندہ بشر تو کیا نظر آتا بس روشنی دیکھ کر یہ اطمینان ہوگیا کہ وہاں نئے لوگ شفٹ ہو گئے ہیں۔ ورنہ وہاں کی خاموشی اور ویرانی دیکھ کر کبھی کبھی اسے ڈر لگنے لگتا تھا۔ امی، بھیا، بھابھی، عاشی اور سمعیہ کے بیڈروم نیچے تھے۔ جبکہ عبداللہ، سنی، اریب اور اس کا کمرہ فرسٹ فلور پر تھا۔ کبھی سوتے سے آنکھ کھل جاتی اور اچانک ہی نظر سامنے پڑتی تو وہاں گھپ اندھیرا دیکھ کر اسے ایک دم ہی کوئی نہ کوئی ہارر موی یاد آجاتی۔ بچوں کے کمرے میں یوں نہیں جاسکتی تھی کہ ان سب کا خیال تھا کہ ان کی خالہ اور پھپھو بڑی ہی بہادر خاتون ہیں، اب وہ بچوں کو کیا بتاتی کہ اسے سامنے والے گھر کی ویرانی دیکھ کر ڈر لگتا ہے۔

نئے لوگوں کے آجانے پر اس نے سکون کا سانس لیا تھا۔ دس پندرہ دن ہو گئے تھے اس کی ابھی تک نئے مکینوں سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ صبح کے وقت تو وہ خود بھی گھر پر نہیں ہوتی تھی۔ ڈھائی تین بجے اس کی کالج سے واپسی ہوتی تھی۔ اس وقت سے لے کر اور رات تک اسے وہاں سوائے خاموشی اور اندھیرے کے کچھ نظر نہ آتا تھا۔ رات 8 نو بجے کے قریب سامنے والے کمرے کی لائٹ آن ہوتی تھی۔ باقی کمرے اس کے بعد بھی اندھیرے میں ڈوبے رہتے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ وہاں ایک یا دو ہی افراد رہتے ہیں۔ بھابھی نے تو باقاعدہ حیرت کا اظہار کیا تھا۔

''پتا نہیں لوگوں کے پاس اتنا فالتو پیسہ کہاں سے آتا ہے۔ رہنے والے نہیں ہیں اور اتنا عالیشان مکان تیار کر لیا۔ یہاں یہ حال ہے کہ تین سال ہو گئے ہیں گھر میں وائٹ واش نہیں ہوا۔ فرنیچر بھی پانچ چھ سال سے وہی چل رہا ہے۔''

بھابھی کے ایسے شکووں پر بھیا دھیان نہیں دیتے تھے۔ اسی لیے وہ ہنوز ٹی وی پر نظریں جمائے بیٹھے رہے تو



وہ منہ بنا کر کھڑی ہوگئیں۔

☆☆☆

''اس روز اتوار کا دن تھا۔ اپنے ہفتے بھر کے جمع شدہ کام نمٹا کر اب وہ اپنی من پسند جگہ پر بیٹھی کل کے لیکچرز تیار کر رہی تھی۔ سب ہی کو پتا تھا اس وقت وہ اپنا لکھنے پڑھنے کا کام کرتی ہے۔ اس لیے اس وقت اسے کوئی ڈسٹرب نہیں کرتا تھا۔ سائیڈ میں رکھا چائے کا کپ اٹھانے کے لیے اس نے جیسے ہی ہاتھ بڑھایا۔ اس کی فائل کے اوپر رکھے ہوئے تین چار صفحے ایک دم ہوا کے زور سے اڑ گئے۔ اس سے پہلے کے وہ انہیں پکڑتی انہوں نے اپنی پرواز کا سلسلہ جاری رکھا اور سامنے والے گھر کی بالکونی میں جا کر ہی لینڈ کیا۔ سامنے ہی پڑے سکون سے آرام فرما ان صفحات کو وہ صرف دیکھ سکتی تھی۔ اچھا خاصا کام کا ٹیمپو بگڑ کر رہ گیا تھا۔ خود پر بھی غصہ آ رہا تھا کہ اتنی تیز ہوا چل رہی تھی تو احتیاط کرنی چاہیے تھی۔

ابھی وہ کف افسوس مل ہی رہی تھی کہ سامنے والے کمرے کی سلائیڈنگ کھول کر ایک بندہ باہر بالکونی میں نکلا۔ تولیے سے بال خشک کرتا وہ اپنی دھن میں مگن شاید کچھ گنگنا بھی رہا تھا۔ رمیشہ نے اس بندے کو دیکھ کر خدا کا شکر ادا کیا تھا۔

''ایکسکیوز می!'' وہ کرسی پر سے اٹھ کر ریلنگ کے پاس آ کر کھڑی ہوگئی تھی۔ وہ جو نیچے جھکا ریلنگ پر بازو ٹکائے اپنے پودوں کی نشوونما پر غور کر رہا تھا ایک دم چونک کر سیدھا ہوا۔

''دیکھیں، یہ میرے صفحات اڑ کر آپ کی بالکونی میں آگئے ہیں۔ پلیز ذرا یہ یہاں پھینک دیں۔

زبردستی کی مسکراہٹ چہرے پر سجا کر یہ جملے بولتے ہوئے اس کو اپنا آپ اچھا خاصا فضول لگا۔ رمیشہ کی بات سنتے ہی اس نے اپنے پیروں کے پاس پڑے ان کاغذات کو دیکھا اور فوراً ہی جھک کر انہیں اٹھایا۔ اگلے لمحے اس نے انہیں فولڈ کر کے اس کی طرف اچھال دیا تھا۔

''تھینک یو'' زمین پر سے صفحات اٹھا کر اس نے شکریہ ادا کیا۔ جواباً وہ بندہ پرخلوص انداز میں مسکرا کر بولا تھا۔

''اس پر شکریہ کی کوئی بات نہیں ہے۔'' وہ فوراً ہی اپنی چیزیں سمیٹ کر اندر کمرے میں چلی آئی تھی۔ اپنی یہ ٹین ایجرز والی حرکت اسے بالکل بھی اچھی نہیں لگی تھی۔

''پتا نہیں اس نے میرے بارے میں کیا سوچا ہوگا ہوسکتا ہے وہ سوچ رہا ہو کہ میں نے جان بوجھ کر اس سے بات کرنے کے لیے یہ چیپ حرکت کی تھی۔'' جو بھی تھا اس روز اسے خود پر سخت غصہ آیا تھا۔ اسے ہمیشہ سب کی نظر میں اچھا بننے کا شوق رہا تھا۔ کوئی اس کے بارے میں کسی قسم کے غلط اندازے لگائے یا اسے غلط سمجھے یہ بات وہ برداشت کر ہی نہیں سکتی تھی۔ اپنے اس نئے پڑوسی سے رمیشہ کی دوبارہ ملاقات محض دو روز بعد ہی ہوگئی۔

اس روز وہ نماز وغیرہ سے فارغ ہو کر جلدی سونے کے لیے لیٹ گئی تھی۔ اچانک لائٹ چلے جانے پر گرمی اور حبس کی وجہ سے اس کی آنکھ کھل گئی تھی۔ کچھ دیر تو وہ یوں ہی بیڈ پر لیٹی کراچی کی گرمی اور لوڈشیڈنگ کو کوستی رہی مگر پھر جب گھٹن اور گرمی حد سے زیادہ ہوگئی تو آخر کار بستر پر سے کھڑا ہونا ہی پڑا۔ ساری کھڑکیاں کھولنے کے بعد اس نے بالکونی کا دروازہ بھی کھول دیا۔ کمرے کے مقابلے میں باہر کا موسم قدرے غنیمت محسوس ہوا تو وہ بالکونی میں نکل آئی۔ باہر نکلتے ہی اس کی نظر سامنے والی بالکونی میں پڑی تھی۔ کرسی پر ٹانگیں پھیلائے اسموکنگ کرتا ہوا وہ آسمان پر نظریں جمائے پتا نہیں کس سوچ میں غلطاں تھا۔ اس پر نظر پڑتے ہی رمیشہ نے واپس اندر کمرے میں جانے کی ٹھانی۔ ابھی وہ

مڑنے ہی والی تھی کہ اچانک وہ اس طرف متوجہ ہوا۔

''ہیلو کیسی ہیں آپ؟'' وہ کرسی پر سے اٹھتے ہوئے اس سے مخاطب ہوا تھا۔

''میں ٹھیک ہوں۔ آپ کیسے ہیں؟'' جب وہ حق ہمسائیگی نبھانے کے لیے خیروعافیت دریافت کرسکتا تھا تو رمیشہ بھی آخر اتنے مینرز تو رکھتی ہی تھی۔

''اس وقت تو بالکل بھی ٹھیک نہیں ہوں۔ سارے دن کی تھکا دینے والی مصروفیت کے بعد اب گھر آکر لمبی تان کر سونے کا پروگرام اس لوڈشیڈنگ کی وجہ سے برباد ہوگیا ہے۔'' وہ بڑی ناگواری سے بولا تھا۔

''آپ بھی اسی لوڈشیڈنگ کی ستائی ہوئی معلوم ہورہی ہیں۔'' وہ دونوں ہاتھ ریلنگ پر جمائے بغور اس کی طرف دیکھتا ہوا بولا تو رمیشہ نے سر ہلا دیا تھا۔

''بائی دا وے میں شہریار احمد ہوں۔ آپ کا نیا پڑوسی تقریباً مہینہ بھر پہلے ہی یہاں شفٹ ہوا ہوں۔'' وہ پیچھے مڑ کر میز پر رکھی ایش ٹرے میں سگریٹ مسلتے ہوئے بولا تھا۔ اس کام سے فارغ ہوکر وہ واپس اپنی سابقہ پوزیشن میں کھڑا ہوگیا تھا۔

''میری فیملی شروع سے امریکہ میں رہتی ہے۔ پیدائش ویسے میری یہیں کی ہے۔ بعد میں ہم لوگ امریکہ مائیگریٹ کرگئے تھے۔ لیکن وہ جو کہا جاتا ہے کہ ہر چیز اپنے اصل کی طرف لوٹتی ہے تو ہم لوگ بھی اپنے اصل یعنی اپنے وطن واپس آگئے ہیں۔ ابھی صرف میں آیا ہوں۔ فیملی دو تین مہینوں میں یہاں شفٹ ہوجائے گی۔'' وہ بڑی فرصت سے اپنا تعارف کروا رہا تھا۔

''آپ نے اپنے گھر کی ڈیزائننگ کسی بہت ہی ماہر آرکیٹیکٹ سے کروائی ہے۔ آپ کا گھر ماشاءاللہ ہر زاویے سے ہی بڑا خوبصورت اور منفرد لگتا ہے۔'' رمیشہ نے بے ساختہ اس کے گھر کی تعریف کی تھی اور اس میں مبالغہ آرائی کا ہرگز کوئی دخل نہ تھا، اس گھر نے اسے شروع دن سے متاثر کیا تھا۔

''بہت بہت شکریہ۔ ویسے یہ تمام کاوشیں میرے دوست احسان صدیقی کی ہیں۔ شاید آپ نے نام سنا ہو وہ یہاں کراچی میں بڑا مشہور آرکیٹیکٹ ہے۔ میں نے تو بس اس کی پلاننگ کو پسند کرنے کا کام کیا تھا۔ باقی تمام مراحل سے وہ خود ہی گزرا ہے۔ شیخ صاحب سے یہ مکان خریدنے کے بعد میں تو واپس چلا گیا تھا پھر تمام ذمہ داری اسی نے نبھائی۔''

وہ مسکراتے ہوئے بولا تھا اور رمیشہ اس کے اتنی روانی سے اور صحیح تلفظ کے ساتھ اردو بولنے پر حیران تھی۔ یہاں تو کوئی سال دو سال کہیں باہر ملک میں گزار آئے تو پھر منہ ٹیڑھا کیے بغیر بات ہی نہیں ہوتی اور اس کام میں مرد کسی بھی طرح خواتین سے پیچھے نہیں ہیں جبکہ وہ تو ساری عمر باہر گزار کر آیا تھا۔

''کیا ہوا؟ آپ کیا سوچنے لگیں؟'' وہ اس کی خاموشی محسوس کرکے بولا تھا۔

''کچھ نہیں، میں بس آپ کے اتنی روانی سے اردو بولنے پر حیران ہورہی تھی۔'' رمیشہ نے صاف گوئی سے اصل بات بتادی تھی اور جواباً وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا تھا۔

''ابھی اگر میں آپ کو یہ بتادوں کہ مجھے علامہ اقبال کی شاعری اور شفیق الرحمان کا مزاح بہت پسند ہے تو پھر تو آپ شاید حیرت سے بے ہوش ہوجائیں گی۔'' اس کے بے ساختہ انداز پر رمیشہ اپنے لبوں پر مچلنے والی مسکراہٹ کو



روک نہیں پائی تھی۔

''ویسے میں سوچ رہا تھا کہ جب گھر والے آئیں گے، تب ہی اہل محلہ سے ہائے ہیلو ہوگی۔ مگر اس لائٹ کی مہربانی سے اپنے ایک عدد پڑوسی سے تو میں نے مل ہی لیا۔ بائی دا وے۔ آپ نے اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔'' اس کے سوالیہ انداز پر وہ بولی۔

''میں رمیشہ ہوں، ہم لوگ تو شروع ہی سے یہیں رہتے ہیں آپ اس بات سے اندازہ لگالیں کہ ہماری امی شادی کے بعد رخصت ہوکر اسی گھر میں آئی تھیں۔ ہم تین بھائی بہن ہیں۔ سب سے بڑے بھائی مکینیکل انجینئر ہیں اور سٹیل مل میں جاب کرتے ہیں۔ ان کے بعد میری بڑی بہن ہیں۔ وہ اپنے شوہر کے ساتھ سعودی عرب میں مقیم ہیں۔ جس وقت میں میٹرک میں تھی۔ ہمارے والد کا انتقال ہوگیا تھا۔ اب گھر میں، میں، امی، بھیا، بھابھی ان کے بچے اور میری بہن کے بچے جو پڑھائی کی وجہ سے یہاں آئے ہوئے ہیں رہتے ہیں۔''

ابھی اس کی بات ختم ہوئی ہی تھی کہ لائٹ آگئی۔

''اوہ تھینک گاڈ، لائٹ آگئی۔'' رمیشہ نے فوراً شکر ادا کیا تھا۔ وہ سامنے کھڑا بڑے غور سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''اچھا شہریار صاحب، شب بخیر۔'' وہ کمرے میں جانے کے لیے پر تولتے ہوئے بولی تھی۔ جواباً وہ بھی شب بخیر کہتا اپنے کمرے میں چلا گیا تھا۔ سونے سے پہلے تک وہ اسی کے بارے میں سوچتی رہی تھی۔ گو کسی کے بھی بارے میں فوراً ہی کوئی رائے قائم کرلینا درست نہیں ہے، مگر اس بندے کے بارے میں اس نے پھر بھی رائے قائم کر ہی لی تھی اسے وہ اچھا لگا تھا۔ پڑھا لکھا، مہذب اور ملنسار، جب وہ خود اچھا ہے تو یقیناً اس کی فیملی بھی اچھی ہوگی۔ چلو ہو سکتا ہے میری اس کی مسز سے اچھی دوستی ہوجائے۔

سوچتے سوچتے پتا نہیں کب اس کی آنکھ لگ گئی تھی۔ وہ اپنے معمول کے مطابق شام میں بیٹھی لیکچرز تیار کر رہی تھی۔ جب اس نے شہریار کی آواز سنی۔

''السلام علیکم''۔ چونک کر سر اٹھایا تو وہ سامنے کھڑا مسکرا رہا تھا۔ اس کے سلام کا جواب دیتی وہ بھی جواب میں مسکرا دی تھی۔

''کیا ہو رہا ہے؟''

''کچھ نہیں بس یہ کل کے لیکچرز تیار کر رہی تھی۔'' وہ سادگی سے بتا کر کرسی پر سے اٹھ آئی تھی۔

''آپ آج بڑی جلدی آگئے۔'' اچانک اس کے منہ سے نکل جانے والے اس جملے پر وہ شرارتی انداز میں گویا ہوا تھا۔

''آپ نے میرے آنے جانے کا ٹائم بہت یاد رکھا ہوا ہے۔'' وہ ایک دم بری طرح شرمندہ ہوگئی تھی۔ مگر اب وضاحت کرنی ضروری تھی ورنہ وہ پتا نہیں کیا سمجھا۔

''یہ بات نہیں ہے۔ دراصل میں روز یہاں بیٹھ کر اپنا کام کرتی ہوں، تو آپ کا پورا گھر اندھیرے میں ڈوبا نظر آتا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اندر کوئی نہیں ہے۔''

اس کے وضاحتی انداز پر وہ دوبارہ ہنس پڑا تھا اور یہ ہنسی رمیشہ کو بہت بُری لگی تھی۔ وہ اسے کیا سمجھ رہا تھا۔ وہ

تو صرف پڑوس نبھانے کی خاطر مروت میں اس سے بات کر رہی تھی اور موصوف ضرورت سے زیادہ ہی خوش فہمی کا شکار ہو رہے تھے۔

''آپ پڑھتی ہیں یا پڑھاتی ہیں؟'' وہ اس کی ناگواری محسوس کر گیا تھا اسی لیے فوراً سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے بولا تھا۔

''پڑھاتی ہوں۔ معاف کیجیے گا مجھے ذرا کچھ کام ہے'' وہ بڑی بے مروتی سے کہہ کر اپنی چیزیں سمیٹ کر اندر چلی آئی تھی۔ جبکہ وہ ابھی بھی وہیں کھڑا نظر آ رہا تھا۔

☆☆☆

اریب کا ٹرمینل ایگزیمز کا رزلٹ بہت خراب آیا تھا۔ تمام مضامین میں بمشکل پاسنگ مارکس آئے تھے۔ جب سے اریب اور عاشی یہاں آئے تھے انہیں پڑھانے لکھانے کی ذمہ داری از خود رمیشہ کے سپرد تھی۔ پھر جب اس کے اتنی محنت سے پڑھانے کی وجہ سے دونوں اسکول میں اچھے گریڈز کے ساتھ پاس ہونے لگے تو بھابھی نے سنی اور عبداللہ کو بھی ٹیوشن سے اٹھا کر اسی کے حوالے کر دیا تھا۔ یوں اب تمام بچوں کو پڑھانا اس کی ڈیوٹی میں شامل تھا۔ اس کام میں اس نے کبھی کوتاہی بھی نہیں کی تھی۔ چاہے وہ کتنی بھی تھکی ہوئی ہوتی مگر بچوں کو پڑھانے کا ناغہ کبھی نہیں کرتی تھی۔

اپیا اور جواد کا بس نہیں چلتا تھا کہ بچوں کو آج ہی پی ایچ ڈی کروا دیں۔ ہر فون میں پہلے اس سے دونوں کی تعلیمی کارکردگی معلوم کی جاتی، اس کے بعد بچوں سے بھی پڑھائی ہی کے متعلق بات ہوتی۔ پہلی مرتبہ ایسا ہوا تھا کہ اس کے اتنی محنت کروانے کے باوجود بھی اریب اچھے مارکس نہیں لے پایا تھا۔ اس کی رپورٹ کارڈ دیکھ کر رمیشہ نے اریب سے اچھی خاصی سختی کے ساتھ باز پرس بھی کی تھی۔ بچوں سے دوستی اور پیار اپنی جگہ پڑھائی لکھائی کے معاملے میں وہ ایک سخت گیر استاد تھی۔

آج جب وہ کالج سے واپس آئی تو امی کی فون پر اپیا سے باتیں ہو رہی تھیں۔ دوپہر کے تین بج رہے تھے بھوک سے برا حال تھا۔ وہ امی کو سلام کر کے اپنے کمرے میں جانے لگی تو امی نے ریسیور اس کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔ وہ یہی سمجھی کہ اس کی آواز سن کر اپیا خیریت وغیرہ پوچھنا چاہ رہی ہیں۔ مگر دوسری طرف اپیا تو دوسرے ہی موڈ میں تھیں۔

''کیا ہو گیا ہے تمہیں رمیشہ! اریب کا رزلٹ دیکھا تم نے؟ میں تو ابھی تک اس کے مارکس سن کر سکتے میں ہوں۔ لگتا ہے اب کی بار تم نے صحیح سے محنت نہیں کرائی تھی۔ جواد کو پتا چلے گا تو وہ تو میرے پیچھے پڑ جائیں گے۔''

اس کے سلام کا جواب دیتے ہی وہ نان اسٹاپ شروع ہو چکی تھیں۔ عام طور پر وہ کسی بھی بات کا اتنی جلدی برا نہیں مانتی تھی، مگر اس وقت اسے اپیا کی بات بہت بری لگی تھی۔ شاید وہ تھکی ہوئی ابھی ابھی آئی تھی۔ گرمی اور بھوک سے پریشان ایسے میں اپیا کی بات اسے ضرورت سے زیادہ ہی بری لگی۔ اپنی ناگواری کو پی کر وہ چپ چاپ ہی کھڑی رہی دو وہ مزید بولیں۔

''اچھا دیکھو، اب فائنل ایگزیمز کے لیے اسے اچھی طرح تیاری کروانا۔ اگر میتھس انگلش اور سائنس میں اس کا اے گریڈ نہیں آیا تو جواد تو زمین آسمان ایک کر دیں گے۔ تم ذرا اسے الگ سے زیادہ ٹائم دیا کرو۔ سب کو ایک ہی وقت میں پڑھاتی ہو۔ زیادہ وقت تو سب بچے آپس میں شرارتیں کرتے رہتے ہوں گے۔''



اپیا کا ہدایت نامہ سن کر وہ ریسیور امی کو دے کر اپنے کمرے میں آ گئی تھی۔ اچھا خاصا موڈ خراب ہو چکا تھا۔ نماز پڑھ کر وہ کھانا کھائے بغیر ہی سونے کے لیے لیٹ گئی۔ اگر پہلی مرتبہ اریب کا رزلٹ خراب آیا تھا تو کیا اس کی قصوروار وہ تھی۔ اس سے پہلے جب ہر سال اریب اور عاشی شاندار مارکس لے کر پاس ہوتے تھے تو اپیا نے کبھی کریڈٹ اسے نہیں دیا تھا۔ کبھی اسے سراہا نہیں تھا۔ کبھی یہ نہیں کہا تھا کہ ایسا اس کی محنت کی وجہ سے ہوا ہے۔ بلکہ ہر بار بچوں کے اچھے رزلٹ پر وہ فخر سے سر بلند کر کے کہتی تھیں۔

''کیوں نہ ہو۔ آخر کو ذہین ماں باپ کے جینئس بچے ہیں۔ میرے بچوں کو ذہانت وراثت میں ملی ہے۔''

اور ان کی اس بات کا اس نے کبھی برا نہیں منایا تھا۔ اس میں کوئی شک بھی نہیں تھا۔ وہ دونوں ہی ذہین بچے تھے۔ اس کی توجہ نے صرف ان کی ذہانت کو نکھارنے کا کام کیا تھا۔ اسے اپیا کے بات کرنے کا انداز بہت برا لگا تھا، ایسا لگا تھا جیسے وہ کوئی تنخواہ دار ملازم ہے اور اسے تنخواہ اسی کام کی ملتی ہے۔ وہ تو اپنے انتہائی ٹائٹ شیڈول میں سے وقت نکال کر بچوں کو پڑھایا کرتی تھی اور اپیا نے کتنی آسانی سے اس کی محنت کو دو ٹکے کا کر دیا تھا۔

شام میں سو کر اٹھی تو اسے یاد بھی نہیں تھا کہ وہ کتنے آف موڈ کے ساتھ سوئی تھی۔ یاد تھا تو صرف اتنا کہ اسے شدید بھوک لگ رہی تھی۔ وہ ایسی ہی تھی۔ صاف دل کی مالک۔ زیادہ دیر کسی سے ناراض نہیں رہتی تھی۔ کسی کے خلاف دل میں کینہ یا بغض وہ رکھ ہی نہیں سکتی تھی۔ وہ حسب معمول خوشگوار موڈ کے ساتھ سب گھر والوں کے ساتھ ہنسنے اور باتیں کرنے لگی تھی۔ مگر موڈ کی یہ خوشگواری زیادہ دیر قائم نہ رہ سکی تھی۔

رات میں سونے سے پہلے امی کی کمر اور ٹانگیں دبانا اس کے معمول میں شامل تھا۔ وہ امی کی ٹانگیں دبا رہی تھی جب انہوں نے دوبارہ وہی قصہ چھیڑ دیا۔

''در یہ بہت ناراض ہو رہی تھی کہہ رہی تھی رمیشہ بچوں کو اچھی طرح توجہ نہیں دے رہی۔ تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ کچھ تو بہن کی پریشانی کا خیال کرو۔''

امی کے منہ سے یہ بات سن کر وہ بہت بددل ہوئی تھی۔

''امی! آپ کے سامنے ہی تو ہے سب۔ میں روز تو پڑھاتی ہوں۔'' وہ اپنی ناگواری چھپا کر آہستگی سے بولی تھی۔

''روز تو پڑھاتی ہو۔ مگر اتنی توجہ سے نہیں پڑھا رہیں۔ اس بات کا سب سے بڑا ثبوت اریب کا رزلٹ ہی ہے۔ جو بچہ پہلے کلاس میں پوزیشن لیتا تھا، اب اچانک اتنا ڈفر کیسے ہو سکتا ہے۔'' امی نے اس کا اعتراض یکسر رد کر دیا تھا۔

''تو اس کی کیا صرف یہی وجہ ہو سکتی ہے کہ میں نے صحیح توجہ نہیں دی۔ ہو سکتا ہے کوئی اور وجہ ہو۔ اریب اب بڑا ہو رہا ہے۔ ہو سکتا ہے وہ اپنے ماں باپ کو مس کرتا ہو۔ میں نے ویسے بھی کئی بار نوٹ کیا ہے۔ جب بھیا سنی اور عبداللہ کے ساتھ گیمز کھیلتے ہیں یا باتیں کر رہے ہوتے ہیں اس وقت اریب کے چہرے پر بڑے ہی عجیب سے تاثرات ہوتے ہیں۔'' وہ بڑی سنجیدگی سے بولی تھی۔

''تو کیا جواد نوکری چھوڑ چھاڑ واپس آ جائے۔ کیسی بے وقوفوں والی باتیں کرتی ہو تم۔'' امی نے برا سا منہ بنایا۔

''تو وہ بچوں کو اپنے پاس بلا لیں اور اگر ایسا نہیں کرنا چاہتے تو کم سے کم اپیا کو تو اپنے بچوں کے پاس رہنا چاہیے۔ مجھے تو حیرت ہوتی ہے کیسی ماں ہیں وہ، انہیں اپنے بچوں کی کمی محسوس نہیں ہوتی؟ سال میں دو تین مرتبہ ل

لینے سے کیا ان کے دل کی تسلی ہو جاتی ہے۔''

اب جب بات ہو ہی رہی تھی تو وہ اپنے دل کا یہ خیال امی کے سامنے ظاہر کر گئی تھی اور اس کی یہ بات امی کو بہت بری لگی۔

''یہ بات تمہاری بھاوج کہتی تو مجھے کوئی دکھ نہیں ہوتا کہ نند بھاوج کا رشتہ ہی ایسا ہوتا ہے۔ پتا ہے، جواد کی بہنیں، دریہ کے خلاف اس کے کان بھرتی رہتی ہیں، اگر وہ وہاں سے آگئی تو یہ میدان خالی چھوڑ دینے والی بات ہوگی بجائے بہن کی پریشانی کا خیال کرنے کے تم الٹا بہن کو مورد الزام ٹھہرا رہی ہو۔ ٹھیک ہے مت پڑھاؤ تم، میں خود ہی بچوں کے لیے کوئی نہ کوئی انتظام کر دوں گی، ٹیوشن پڑھانے والوں کی کمی نہیں ہے۔''

امی نے اس کا ہاتھ جھٹکتے ہوئے غصے کہا تھا۔ پھر کتنی ہی دیر وہ امی سے سوری کرتی رہیم، اپنی بات کی وضاحت کرنے کی کوشش کی۔ انہیں بتانا چاہا کہ وہ ایسا کسی بری نیت سے نہیں کہہ رہی تھی، مگر ان کا غصہ اپنی جگہ برقرار رہا۔ تھک ہار کر وہ اٹھ کر اپنے کمرے میں آگئی۔ اس نے ہمیشہ محسوس کیا تھا۔ امی اپیا کو اس کے اور بھیا کے مقابلے میں زیادہ چاہتی ہیں۔ کئی مواقع ایسے آئے تھے جب یہ بات اس نے بہت شدت سے محسوس کی تھی۔ بہت دفعہ اسے برا بھی لگا تھا مگر پھر ہر بار اپنی عادت کے پیش نظر وہ اس بات کو نظر انداز کر دیا کرتی تھی۔ وہ دن رات ایک کر کے امی کی خدمت کرتی تھی اور یقیناً ایسا کر کے وہ ان پر کوئی احسان نہیں کر رہی تھی۔ مگر پھر بھی کبھی کبھی اس کا دل چاہتا۔ امی کوئی ستائشی جملہ اور شاباش ہی اسے دے دیں۔ اس کی پیٹھ تھپک کر یہ ہی کہہ دیں۔

''رمیشہ میری سب سے پیاری بیٹی ہے۔'' یا یہ کہ ''رمیشہ تھوڑا آرام بھی کر لیا کرو۔ کتنا تھک جاتی ہوگی تم۔''

مگر اس کی حسرت، حسرت ناتمام ہی رہی تھی۔ اس کے برعکس اگر وہ اپیا سے فون پر صرف یہی سن لیتیں کہ آج رات ان کے گھر کھانے پر مہمان آرہے ہیں تو وہ بری طرح بے چین ہو جاتی تھیں۔ ان کا بس نہیں چلتا تھا کہ خود اڑ کر اپیا کے گھر پہنچ جائیں اور ان کا ہاتھ بٹائیں۔ عید وغیرہ پر اپیا پاکستان آتیں اور ان دو چار دنوں کے قیام میں امی کی خدمت کرتیں تو امی پریشان ہو جاتیں۔

''بس کرو کب سے پیر دبا رہی ہو۔ تھک گئی ہوگی۔''

اور وہ حیرت سے امی کا منہ دیکھتی رہ جاتی تھی۔ اس طرح انہوں نے اسے کبھی نہیں کہا تھا۔ اس کے برعکس اگر کبھی اس سے کہیں کوئی معمولی سے چوک بھی ہو جاتی تو وہ جواب طلبی کے لیے کھڑی ہو جاتی تھیں۔ اگر وہ ناشتہ دیر سے لے کر جاتی تو وہ ناراض ہو جاتی تھیں اسے طعنہ دیتی تھیں۔

''ہاں ہاں بیمار ماں سے تنگ آگئی ہو۔ میرا وجود تو اب وبال جان لگتا ہے تمہیں۔''

اور وہ انہیں منا منا کر ہار جاتی تھی۔ جب تک بابا زندہ تھے اس نے کبھی امی کی اپیا سے انتہائی محبت کو اتنا محسوس نہیں کیا تھا۔ کیونکہ بابا کی تو وہ لاڈلی تھی۔ مگر بابا، امی کی طرح بچوں میں فرق نہیں رکھتے تھے۔ اگر وہ ان کی آنکھوں کا تارا تھی تو اپیا اور بھیا بھی انہیں کم عزیز نہ تھے۔ امی کی بات نے اسے بہت بری طرح ہرٹ کیا تھا۔ اس کے خلوص اور نیت پر شبہ کیا جائے۔ یہ بات اس کی برداشت سے باہر تھی۔ بالکونی میں کھڑی آسمان پر چمکتے اس تارے کو بغور دیکھتے وہ اس وقت بڑی دل گرفتہ اور اداس تھی۔ اس وقت اسے بابا بڑی شدت سے یاد آرہے تھے۔ ''بابا! آپ اتنی جلدی کیوں چلے گئے؟''



''آپ شاید اپنے والد کو مس کر رہی ہیں۔'' شہریار کی اس بات پر وہ بری طرح چونک گئی تھی۔

''حیران مت ہو۔ ابھی جب آپ خود کلامی کر رہی تھیں تو میں نے آپ کی بات سن لی تھی۔'' اس کی حیرت کے جواب میں وہ فوراً بولا تھا۔ وہ بلند آواز میں خود کلامی کر رہی تھی۔

''اور اسی بات نے مجھے یہاں کھڑا رہنے پر مجبور کیا تھا۔ میرے پاپا بھی میرے بچپن ہی میں ہمیں چھوڑ گئے تھے۔ میں بھی انہیں آپ ہی کی طرح مس کرتا ہوں۔'' وہ بڑی سنجیدگی سے بولا۔ ''لیکن آپ اس طرح کیوں سوچتی ہیں۔ آپ اکیلی تو نہیں ہیں۔ آپ کی والدہ، بہن، بھائی اور یقیناً بہت سے فرینڈز تو آپ کے پاس ہیں اور ان فرینڈز میں تازہ ترین اضافہ میں ہوں۔''

رمیشہ بڑی حیرت سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی

''کیا ہم فرینڈز نہیں ہیں؟'' اس کی حیرت کے جواب میں وہ سوالیہ انداز میں بولا تھا اور اسے محض مروت میں گردن ہلانی پڑی۔

''چلیں شکر، آپ نے یہ بات تو تسلیم کی۔ اب یہ بتائیں کس بات نے آپ کو اتنا ڈپریس کیا ہے۔'' وہ دوستانہ مسکراہٹ سمیت بولا تھا۔

''کچھ بھی نہیں ہوا۔ بس ویسے ہی بابا یاد آنے لگے تھے۔'' وہ وضاحتی انداز میں بولی تو شہریار گردن ہلا کر بولا۔

''کوئی بات نہیں تھی تو پھر تو بہت ہی اچھی بات ہے۔ اچھا اس ذکر کو چھوڑیں، یہ بتائیں آپ کیا پڑھاتی ہیں اور کس کو پڑھاتی ہیں۔ اس دن تو آپ روٹھ کر چلی گئیں اور تعارف ادھورا رہ گیا تھا۔''

وہ مسکراہٹ چہرے پر سجائے اسے دیکھ رہا تھا اور اپنا اس روز کا ردعمل اب رمیشہ کو بڑا ہی بچکانہ محسوس ہو رہا تھا۔ اس لیے شرمندہ سے لہجے میں بولی۔

''میں ناراض تو نہیں ہوئی تھی۔ آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔'' اور جواب میں وہ اپنے مخصوص انداز میں بے فکری سے قہقہہ لگا کر ہنس پڑا تھا۔

''چلیں مان لیا۔ آپ ناراض نہیں ہوئی تھیں۔ اب میرے سوال کا جواب بھی دے دیں۔'' وہ شرارتی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''میں نے جینیٹکس میں ماسٹرز کرنے کے بعد سروس کمیشن کا ایگزیم دیا تھا۔ دراصل مجھے شروع ہی سے ٹیچنگ پروفیشن بہت پسند ہے۔ لیکچرر شپ میرا خواب تھا جو اللہ تعالیٰ نے پورا کروا دیا۔ میں گورنمنٹ کالج میں تھرڈ ائیر اور فورتھ ائیر کی اسٹوڈینٹس کو بوٹنی اور زولوجی پڑھاتی ہوں۔'' اس کے جواب میں وہ ستائشی انداز میں بولا۔

''زبردست بھئی، اس کا مطلب ہے اب پاکستان میں بھی لڑکیاں اپنے کیریر اور پروفیشن کے متعلق سنجیدگی سے سوچنے لگی ہیں۔ بھئی یہ تو بہت ہی پوزیٹو چینج ہے۔''

''میں نے اپنا تو پورا بائیو ڈیٹا بیان کر دیا۔ آپ نے اپنے متعلق کچھ نہیں بتایا۔'' کچھ دیر پہلے کا موڈ ایک دم بدل گیا تھا وہ بڑے آرام سے کھڑی اس سے یوں باتیں کر رہی تھی جیسے یہاں آ کر کھڑی ہی اسی لیے ہوئی تھی۔

''میں نے سی اے کیا ہے۔ وہاں ڈلاس میں اچھی مناسب قسم کی جاب کر رہا تھا۔ پھر اچانک ہی مجھے

پاکستان سے بہت اچھی جاب بڑے معقول معاوضے اور دیگر سہولتوں کے ساتھ آفر ہوئی تو میں نے انکار یوں نہیں کیا کہ ایک تو پیکج ہی بہت اچھا تھا۔ فرم کی اپنی ریپوٹیشن بھی بہت اچھی ہے اور دوسرے یہ کہ میری ممی کو بھی اب اپنا ملک بڑی شدتوں سے یاد آنے لگا تھا۔ تین چار سال سے وہ اٹھتے بیٹھتے پاکستان کی عیدیں، رمضان اور دیگر تہوار بے تحاشا یاد کرنے لگی تھیں۔ اب میں اتنا محب وطن تو ہوں نہیں کہ فوراً پاکستان آجاتا اور یہاں آکر نوکری کی تلاش کرتا۔ مگر جب اتنی اچھی جاب آفر ہوئی وہ بھی اپنے ملک میں اور اتنی ساری سہولتوں کے ساتھ تو انکار کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہاں پر جس جگہ جاب کرتا تھا وہاں کانٹریکٹ کی مدت جیسے ہی ختم ہوئی، میں نے واپسی کی راہ لی۔ اس دوران یہ گھر وغیرہ میری ممی کی فرمائش پر بنا ہے۔ میرے چھوٹے بھائی کا فائنل سمسٹر ہو جائے تو وہ لوگ بھی یہاں آجائیں گے۔'' وہ بڑی تفصیل سے اپنے بارے میں بتا کر خاموش ہوا تو رمیشہ بے ساختہ بولی۔

''اور آپ کی مسز اور بچے وغیرہ۔''

''دعا کریں، وہ بھی آجائیں۔'' وہ سنجیدگی سے بولا۔

''کیوں کیا وہ پاکستان آنے پر راضی نہیں ہیں؟'' رمیشہ نے سوالیہ انداز میں کہا، پھر اس کے جواب دینے سے پہلے خود ہی بولی۔ ''ویسے انہیں ایسا کرنا نہیں چاہیے۔ آپ لوگوں کے پاس تو یقیناً امریکن نیشنیلٹی ہوگی۔ اگر کسی وجہ سے یہاں ایڈجسٹ نہ ہو سکے تو واپس جانے کا آپشن تو بہرحال موجود ہے ہی۔ انہیں آپ کے پاس آکر رہنا چاہیے۔'' اس کے ان ہمدردانہ جملوں پر وہ اپنی بے ساختہ مسکراہٹ چھپاتے ہوئے بولا۔

''آپ کے بارے میں میری پہلی رائے بالکل ٹھیک تھی، آپ ایک بہت ہی ہمدرد اور نیک دل خاتون ہیں۔''

اور اپنی اس تعریف پر وہ ایک دم مسکرا دی۔

''میرا خیال ہے رات کافی ہوگئی ہے اور ہم دونوں ہی کو صبح سویرے اٹھنا ہے'' شہریار کے کہنے پر اسے بھی وقت کا احساس ہوا تو شب بخیر کہتی اندر کمرے میں آگئی۔

سونے کے لیے لیٹی تو اس کے دل پر کوئی بوجھ نہیں تھا۔ اس وقت شہریار کا ملنا اور باتیں کرنا بڑا غنیمت ہوا تھا۔ ''اس کے باتیں کرنے کا انداز کتنا اچھا ہے۔ وہ کتنی اپنائیت اور خلوص سے بولتا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے کوئی بہت اپنا ہو۔ اجنبیت یا غیریت کا احساس تک نہیں ہوتا۔'' وہ سونے سے پہلے تک اسی کے بارے میں سوچتی رہی تھی۔

☆☆☆

اگلے روز امی کو کتنے جتن کر کے سنایا یہ ایک الگ داستان تھی۔ امی کو خوش کرنے کے لیے بچوں کو بھی روز نہ سے زیادہ دیر تک پڑھاتی رہی۔ کمرے میں آکر یونہی وقت گزاری کے لیے کمپیوٹر آن کر کے بیٹھ گئی۔ سنی کمپیوٹر میں ماسٹر تھا۔ وہی اسے مختلف چیزیں سمجھاتا رہتا تھا۔ خود اسے اس بارے میں بس بنیادی باتیں ہی معلوم تھیں۔ اپنے مطلب کے Softwares وغیرہ سے زیادہ وہ کچھ نہیں جانتی تھی۔ وہ اپنے کام میں مگن تھی، جب کوئی چیز آکر کھڑکی کے شیشے سے ٹکرائی تھی۔ رمیشہ نے فوراً مڑ کر دیکھا تو کھڑکی کے کھلے پردوں سے اسے بالکونی میں کھڑا شہریار نظر آیا۔ وہ اٹھ کر باہر بالکونی میں آئی۔ ٹائلز پر پڑا وہ چھوٹا سا پتھر الگ ہی نظر آرہا تھا۔

''یہ آپ نے پھینکا ہے؟'' وہ حیرت سے بولی۔



''ہاں میں نے پھینکا ہے۔ آپ کو متوجہ کرنے کا اور کوئی مہذب طریقہ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔'' وہ صاف گوئی سے اقرار کر گیا۔

''بڑی فضول حرکت کی ہے آپ نے، اگر شیشہ ٹوٹ جاتا تو کتنا نقصان ہوتا۔'' وہ ناگواری سے بولی۔

''بے فکر رہیں۔ ٹوٹا تو نہیں نا۔ ویسے میں نے چوکھٹ کا نشانہ لیا تھا۔ افسوس میرا نشانہ چوک گیا۔ خیر کوئی نقصان ہوا تو نہیں۔'' وہ بڑے آرام سے بولا تو رمیشہ کو دھیان آیا کہ اسے کام کیا تھا۔

''آپ کو مجھ سے کیا کام تھا؟''

''کام کوئی نہیں تھا بس میں بور ہو رہا تھا۔ آپ پر نظر پڑی تو میں نے کہا چلو آپ ہی کے کان کھائے جائیں۔ ویسے کمپیوٹر پر کیا کام ہو رہا تھا۔'' وہ بالکونی کے کھلے دروازے سے نظر آتے مانیٹر پر نظریں مرکوز کیے بولا۔

''کچھ نہیں۔ یوں ہی ٹائم پاس کر رہی تھی۔ دراصل مجھے کمپیوٹر کے بارے میں اتنا پتا نہیں آج کل اپنے بھتیجے سے سیکھ رہی ہوں۔'' وہ جواب میں بولی۔

''ایک دم بے وقوف ہے آپ کا بھتیجا۔ 2010ء میں آپ سے window-97 پر کام کروا رہا ہے۔ میڈم وقت کے ساتھ چلنا سیکھیں۔ سیکھ ہی رہی ہیں تو windows کے نئے ورژن پر سیکھیں۔ اچھا ایک منٹ ٹھہریں، میں آبھی آتا ہوں۔''

اپنی بات مکمل کرتے ہی وہ اندر کمرے میں چلا گیا تھا۔ رمیشہ وہیں کھڑی اس کا انتظار کرتی سوچ رہی تھی کہ وہ کیا کرنے گیا ہے۔ پانچ منٹ بعد اس کی واپسی ہوئی تھی۔

''یہ لیں یہ سی ڈی میں آپ کی طرف اچھال رہا ہوں۔ براہ مہربانی اسے پاکستانی فیلڈرز کی طرح ڈراپ مت کر دیجئے گا۔ جیسے اس دن آپ اپنے پیپرز کا کیچ نہیں پکڑ سکی تھیں۔ چلیں، وہ تو کاغذ تھے بچت ہوگئی تھی۔ آج مشکل ہو جائے گی۔''

''لیکن میں اس کا کیا کروں گی؟'' وہ فوراً بولی۔

''کرنا کیا ہے اس کا اچار ڈال کر کھایئے گا۔ بھئی اس سی ڈی میں windows کا نیا ورژن ہے۔ اسے install کریں اور مجھے دعائیں دیں۔ اچھا یہ پکڑیں۔''

اگلے پل وہ بمشکل سی ڈی پکڑ پائی تھی۔

''شاباش، آپ میں ایک اچھا فیلڈر بننے کی تمام صلاحیتیں موجود ہیں۔'' وہ اسے سراہ رہا تھا۔

''آپ کو یہ جلدی واپس تو نہیں چاہیے، ابھی تو سنی اپنے دوستوں کے ساتھ کرکٹ کھیلنے گیا ہے، جب آئے گا تب اس سے install کراؤں گی۔'' اس کی بات پر شہریار برا سا منہ بنا کر بولا۔

''اتنا پڑھ لکھ کر آپ اتنا سا کام بھی خود نہیں کر سکتیں، افسوس ہو رہا ہے مجھے۔ جو کام آپ کو بھتیجا کر سکتا ہے، وہ آپ کیوں نہیں، چلیں آپ اسے خود install کریں میں آپ کو گائیڈ کر رہا ہوں۔''

اس کی بات پر رمیشہ اندر کمرے میں آگئی اور سی ڈی لگا کر اس کے اگلے احکامات سننے واپس باہر آئی تھی۔ پھر اسے اچھی طرح سب سمجھا کر وہ یہ کہتا ہوا اپنے کمرے میں چلا گیا۔

"اوکے، اب رات میں ملاقات ہوگی۔ پھر میں آپ سے پوچھوں گا۔ کیا ہوا یا کیا نہیں ہوا۔" خود کرنے بیٹھی تو پتا چلا یہ کوئی اتنا بڑا یا انوکھا کام نہیں تھا۔ جو وہ کر ہی نہیں سکتی تھی۔ بڑے آرام سے اس نے یہ کام کر لیا تھا اور یہی بات رات اس نے شہریار سے کہی تھی۔

"یہی تو میں آپ سے کہہ رہا تھا۔ بلا وجہ اتنے سے کام کو آپ ہوا سمجھ رہی تھیں۔"

وہ چیونگ گم منہ میں ڈالتے ہوئے بولا۔ پھر کچھ خیال آنے پر اس سے بولا۔

"لیں آپ بھی کھائیں۔" وہ انکار کرنے ہی والی تھی کہ اس نے چیونگم اس کی طرف اچھال دی۔

"شکریہ۔" چیونگم ہاتھ میں لے کر اس نے شکریہ ادا کیا تھا۔

☆☆☆

اس کی کولیگ مسز عباسی کی بیٹی کی شادی تھی۔ عام طور پر وہ فنکشنز وغیرہ میں جانے کی بہت چور تھی۔ مگر مسز عباسی کے محبت بھرے اصرار کے سامنے اسے حامی بھرنی ہی پڑی تھی۔ عبداللہ کی منت سماجت کر کے اسے ساتھ چلنے کے لیے آمادہ کیا تھا۔ وہاں پہنچ کر مسز عباسی کو مبارک باد دینے کے بعد وہ اپنی دیگر کولیگز کے ساتھ ہی بیٹھ گئی تھی۔ ابھی بیٹھے کچھ ہی دیر گزری تھی کہ کسی نے بڑی بے تکلفی سے اس کے کندھے پر ہاتھ مار کر اسے اپنی طرف متوجہ کیا تھا۔ رمیشہ نے مڑ کر دیکھا تو سامنے کھڑی فروا کو فوراً ہی پہچان گئی تھی۔ وہ جلدی سے اپنی جگہ سے اٹھی تھی اور اگلے پل دونوں ایک دوسرے کو گلے لگائے خوشی کا اظہار کر رہی تھی۔ فروا اور وہ کالج تک ایک ساتھ رہی تھیں۔ پھر بی ایس سی کے بعد جب فروا کے پاپا کا اسلام آباد ٹرانسفر ہو گیا تو ان دونوں کا آپس میں رابطہ بھی ختم ہو گیا۔ شروع شروع میں خط و کتابت وغیرہ ہوئی، مگر پھر آہستہ آہستہ یہ سلسلہ بھی ختم ہو گیا اور دونوں ایک دوسرے سے دوبارہ کبھی نہ مل سکیں۔

"فروا موٹی! بالکل ویسی کی ویسی ہو۔ مجھے پہچاننے میں بالکل بھی دیر نہیں لگی۔" رمیشہ اس کے ہاتھ تھام کر بڑے خوشگوار انداز میں بولی تو وہ بے فکری سے قہقہہ لگا کر بولی۔

"تم بھی بالکل نہیں بدلیں۔ وہی شاہانہ انداز، وہی چہرے پر مغلیہ دور کی شہزادیوں والی تمکنت۔ میں نے دور ہی سے پہچان لیا تھا کہ یہ ہماری پرنس کے علاوہ اور کوئی نہیں ہو سکتا۔"

فروا کے ان الفاظ پر وہ ایک دم جھینپ گئی تھی اور وہ اس کی شکل دیکھ کر قہقہہ لگا کر ہنس پڑی۔

"ابھی تک ویسی کی ویسی ہو۔" اس کی تمام کولیگز بڑی دلچسپی سے ان لوگوں کی طرف دیکھ رہی تھیں رمیشہ کو ہی اس بات کا خیال آیا تو ان لوگوں کا فروا سے تعارف کروایا۔ سب سے دعا سلام کرنے کے بعد فروا بھی وہیں ان لوگوں کے پاس ہی بیٹھ گئی۔

"فرسٹ ائیر سے لے کر بی ایس سی فائنل تک ہم لوگ ایک ساتھ رہے۔ رمیشہ ہمارے کالج کی سب سے حسین لڑکی تھی۔ ویسے تو اور بھی بہت سی لڑکیاں تھیں جو کافی خوبصورت تھیں مگر اس کی بات ہی اور تھی۔ اس کا تو انداز ہی شاہانہ تھا۔ آپ لوگ یقین کریں میں نے اس سے دوستی بھی صرف اس کی خوبصورتی کی وجہ سے کی تھی۔"

فروا اپنے مخصوص انداز میں بولی تو وہ شرمندہ سے لہجے میں سے ٹوکنے لگی۔

"کیا فضول باتیں کر رہی ہو تم۔"



"کوئی فضول بات نہیں ہے یہ۔ میں تمہاری کولیگز کو تمہاری مقبولیت کے بارے میں بتا رہی ہوں۔ ہمارے کالج کے سالانہ فنکشن میں شیکسپیئر کا Play (پلے) اسٹیج کیا گیا تھا۔ اس میں قلوپطرہ کے رول کے لیے کتنی ساری لڑکیوں نے ہاتھ پاؤں مارے۔ ٹیچرز کی خوشامد کی۔ مگر ہماری ڈرامے کی ٹیچر نے صاف صاف کہہ دیا قلوپطرہ، رمیشہ کے علاوہ اور کوئی نہیں بنے گی۔ رمیشہ تمہارے پاس رکھی ہیں اس فنکشن کی تصویریں۔ میں نے تو اب تک سنبھال کر رکھی ہیں۔"

فروا نان اسٹاپ بولنے میں مصروف تھی اور اس کی تمام کولیگز ہی دلچسپی سے اس کی باتیں سن رہی تھیں۔

"اچھا رمیشہ نے ہمیں یہ سب کبھی نہیں بتایا۔" مسز انصاری نے بے ساختہ کہا تو فروا بولی۔

"ابھی تو میں آپ کو اور بھی بہت سی باتیں بتاؤں گی جو اس نے یقیناً آپ لوگوں سے چھپائی ہوں گی۔ اسی فنکشن کی تصویریں دیکھ کر میرا کزن دل و جان سے محترمہ پر فدا ہو گیا تھا۔ وہ تو پروپوزل بھیجنے کے لیے پوری طرح تیار تھا مگر یہ اڑ گئیں کہ ابھی تو مجھے بہت پڑھنا ہے۔ ماسٹرز کرنا ہے وغیرہ وغیرہ اور وہ بے چارہ مایوس اور ناکام واپس لندن چلا گیا۔"

فروا کی ان باتوں پر وہ درحقیقت شرمندہ ہو رہی تھی۔ مگر چونکہ پوزیشن کچھ ایسی تھی کہ اسے ٹوک بھی نہیں سکتی تھی۔

"ارے تمہارے میاں کہاں ہیں۔ مجھے ملواؤ میں بھی تو دیکھوں پرنسز کے پرنس آخر ہیں کیسے؟" فروا کی اس بات پر وہ ایک لمحے کے لیے بالکل چپ رہ گئی تھی۔ وہ جواب طلب نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"بھئی پرنس ابھی تک ہماری زندگی میں آئے ہی نہیں ہیں۔ اس لیے آپ کو ان سے نہیں ملوایا جا سکتا۔"

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ خود کو کمپوز کرتی فوراً مسکراتے ہوئے بولی اور فروا حیرت سے اس کی طرف دیکھتی رہ گئی ایک دو منٹ کی حیرت کے بعد وہ اس سے بولی۔

"اچھا آؤ میں تمہیں اپنے شوہر اور بچوں سے ملواؤں۔" وہ فروا کے ساتھ اس کے شوہر سے ملنے کے لیے اپنی کولیگز سے ایکسکیوز کرتی اٹھی تو وہ اس کا ہاتھ تھام کر آگے بڑھی۔

"رمیشہ! کیا واقعی تمہاری شادی نہیں ہوئی؟" فروا اس طرح بولی جیسے یہ بڑی ہی ناقابل یقین بات تھی۔

"ہاں۔" اس کا جواب بڑا مختصر تھا۔

"مگر کیوں تمہارے لیے تو اس وقت کالج کے دنوں ہی میں کتنے پر پوزلز آیا کرتے تھے۔ کالج ہی کی کتنی لڑکیاں اپنے بھائیوں کے لئے تمہارے گھر آئی تھیں، پھر ایسی کیا بات ہوئی کہ تم نے ابھی تک شادی نہیں کی۔ کیا ان سب میں سے کوئی ایک بھی تمہارے معیار کا نہیں تھا۔" ایسا لگ رہا تھا جیسے اسے اس بات سے بہت صدمہ پہنچا ہے۔

"بس یہی سمجھ لو۔" وہ پھر گول مول جواب دے کر خاموش ہو گئی تھی۔ فروا نے اس کا اپنے شوہر سے تعارف کروایا تو وہ بڑی خوش اخلاقی سے رمیشہ سے ملا۔ اپنے گھر آنے کی دعوت دی جو اس نے قبول کر لی۔

فروا کے دو بچے تھے۔ بڑی بیٹی چار سال کی تھی اور بیٹا دو ڈھائی سال کا۔ اس کے بچے بھی اسی کی طرح صحت مند اور سرخ و سفید تھے۔ باقی وقت رمیشہ، فروا اس کے شوہر اور بچوں ہی کے ساتھ رہی تھی۔ رمیشہ نے محسوس کیا کہ فروا اس سے کچھ پوچھنا چاہتی ہے مگر شاید اپنے شوہر کی وجہ سے پوچھ نہیں پا رہی۔ وہ کیا پوچھنا چاہتی تھی یہ بات اسے اچھی طرح معلوم تھی۔

اس روز فروا وغیرہ سے رخصت ہو کر جب وہ گھر واپس آئی تو ایسا لگ رہا تھا جیسے دل پر کوئی بوجھ ہو۔ اپنا آپ

بڑا خالی خالی اور اکیلا لگا تھا۔ فروا کے بچوں کو دیکھ کر اسے عجیب سی کمی کا احساس ہوا تھا۔ ایک ایسی بات جسے آپ لاشعوری طور پر محسوس کرتے ہوں، مگر خود سے بھی اس کا اظہار نہ کریں۔ وہی بات کسی اور کے منہ سے سن کر وہ چیز زیادہ ہی محسوس ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ اپنے کمرے میں آکر وہ کتنی ہی دیر تک کھڑی خود کو آئینے میں دیکھتی رہی تھی۔ فروا کے یاد دلانے پر اسے کالج اور پھر یونیورسٹی کی کتنی ہی باتیں یاد آنے لگی تھیں۔ اس کی فرینڈز اس کے پیچھے لگی رہا کرتی تھیں۔

''تم بال کس چیز سے دھوتی ہو ہمیں بھی بتاؤ۔ تمہاری اسکن اتنی اچھی اور فریش کیسے ہے۔ تم کون سا ماسک لگاتی ہو؟''

اور وہ انہیں لاکھ یقین دلاتی کہ وہ کسی قسم کی کوئی کیئر نہیں کرتی مگر انہیں کبھی بھی یقین نہیں آتا تھا۔ پھر جب فروا کے کزن نے اسے پسند کر کے پروپوز کرنے کی بات کی تھی تو اس کی فرینڈز اس پر رشک کر رہی تھیں اور رمیشہ نے بجائے خوش ہونے کے ناگواری کا اظہار کیا تھا۔

''مجھے ابھی بہت پڑھنا ہے۔ اپنے کزن سے کہو میرا پیچھا چھوڑ دے۔'' بعد میں جب فروا کا کزن واپس لندن چلا گیا تو سب فرینڈز نے بڑا افسوس کیا تھا۔ پھر اس کا مطمئن اور پرسکون انداز دیکھ کر سب ہی کو یقین کرنا پڑا تھا کہ وہ بن نہیں رہی تھی اسے درحقیقت فروا کے کزن سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ کلثوم، اس کی بیسٹ فرینڈ جس نے ماسٹرز اس کے ساتھ ہی کیا تھا اکثر کہا کرتی تھی۔

''دیکھ لینا، وہ کوئی بہت ہی منفرد سا بندہ ہوگا جسے اللہ تعالیٰ نے اسپیشلی تمہارے ہی لیے بنایا ہوگا۔ جب وہ آئے گا تو تم یہ انکار و نکار اور یہ اترانا سب بھول جاؤ گی۔ وہ یونانی دیوتاؤں کی سی آن بان والا آئے گا اور آکر تمہیں اپنے ساتھ لے جائے گا۔''

اور وہ اس کی ان پیشین گوئیوں پر ہنس دیا کرتی تھی۔ پھر ایک ایک کر کے اس کی تمام فرینڈز کی شادیاں ہوتی چلی گئیں اور شادی کے بعد کی مصروفیات میں لگ کر آپس میں میل ملاپ بھی بہت کم رہ گیا تو وہ یہ تمام باتیں بھی وقت کے ساتھ ساتھ بھولتی چلی گئی۔ آج ماضی کے اوراق پلٹنے کھڑی ہوئی تو گزرے وقت کی ایک ایک بات یاد آتی چلی گئی۔

اپنے ایم ایس سی مکمل کرنے تک تو وہ کسی بھی قیمت پر شادی کے لیے تیار نہ تھی اسے اپنا کیریر بنانے کا جنون کی حد تک شوق تھا۔ ان دنوں اس کے لیے بے تحاشا رشتے آیا کرتے جنہیں امی ریجیکٹ کر دیا کرتیں۔ اڑتی اڑاتی اس قسم کی خبریں اسے پتا چل ہی جاتی تھیں۔ وہ کسی کے گھر، یا محلے کے میلاد وغیرہ میں بھی جاتی تو اکثر بعد میں وہاں سے اس کے لیے کوئی نہ کوئی رشتہ آجاتا۔ ان دنوں عاشی اور اریب نئے نئے ان لوگوں کے پاس آئے تھے۔ رمیشہ کا زیادہ وقت یا تو بچوں کے ساتھ گزرتا یا پھر گھر کی صفائی اور کھانا وغیرہ پکانے میں۔ پھر جب اس کا ایم ایس سی کا رزلٹ نکلا اور وہ فرسٹ ڈویژن کے ساتھ کامیاب بھی ہوگئی تو اس نے پبلک سروس کمیشن کے امتحان کی تیاری شروع کر دی۔ اپیا کے بچے، بھیا کے بچے، امی کی دیکھ بھال اور گھر کا تمام کام کاج جو وہ پہلے یونیورسٹی کے دنوں میں بھی بڑی ذمہ داری سے کرتی تھی اب اور زیادہ لگن سے تمام کام کرنے لگی تھی۔ امی کو اس وقت کمر وغیرہ کی تو کوئی تکلیف نہ تھی مگر ان کا بلڈ پریشر اکثر خطرناک حد تک ہائی رہتا تھا اس لیے وہ زیادہ کام وغیرہ نہیں کر سکتی تھیں۔ آہستہ آہستہ بھابھی نے تمام ذمہ داریاں اس کے کاندھوں پر ڈال دیں اور خود گھر کے بیشتر کاموں سے بری الذمہ ہوگئیں۔ وہ خوشی خوشی ہر ذمہ داری قبول کرتی چلی گئی۔ وقت گزرتا رہا۔ بے تحاشا



آنے والے رشتوں میں بتدریج کمی آنے لگی۔ مگر ان کبھی کبھار کے آنے والوں کو بھی کچھ نہ کچھ کہہ کر امی ریجیکٹ کر دیا کرتیں۔ ایک دو بار ایسا ہوا کہ امی راضی ہوگئی اور ایسے میں اپیا کا فون آگیا اور انہوں نے تمام تفصیلات جان کر کہا۔

''امی! کیا ہوگیا ہے آپ کو کیا ہماری نازوں پلی حسین بہن کے لیے اتنے فضول قسم کے رشتے ہی رہ گئے ہیں۔ ایسی بھی کوئی اس کی عمر نہیں گزری جا رہی۔ منع کریں ان لوگوں کو۔''

اور امی جھٹ ان لوگوں کو انکار کر دیا کرتیں۔ کبھی بھی یہ معاملہ اس حد تک بڑھا ہی نہیں کہ اس کی رائے معلوم کرنے کی نوبت آتی۔ پہلے ہی مرحلے پر انکار ہو جاتا اور بات وہیں ختم۔

شروع شروع میں رمیشہ نے اس بات کو زیادہ محسوس بھی نہیں کیا۔ مگر گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ اسے احساس ہوا کہ کہیں نہ کہیں کچھ نہ کچھ غلط ضرور ہے۔ وہ صاف دل کی لڑکی تھی۔ اسے لوگوں کی چالاکیاں، مکاریاں اور چھل فریب والی باتیں سمجھ میں نہیں آتی تھیں مگر اتنا تو اس نے محسوس کر ہی لیا تھا کہ ہر بار انکار کروانے میں سب سے اہم کردار اپیا کا ہوتا ہے۔ وہ ایسا کیوں کرتی تھیں یہ بات سمجھنے سے وہ قاصر تھی۔

شروع میں ایک دو بار بھیا نے امی کو سمجھانے کی کوشش کی مگر امی الٹا ان ہی پر چڑھ دوڑیں۔

''ہاں ہاں بہن کا وجود بوجھ لگنے لگا ہے۔ سب پتا ہے مجھے۔ یہ کس کی زبان بول رہے ہو تم۔''

اور امی کے اس طعنے پر بھیا بے چارے فوراً چپ ہوگئے تھے۔ پھر اس کے بعد انہوں نے اس معاملے میں کبھی کچھ نہیں کہا تھا۔ بھابھی اس معاملے میں خاموش تماشائی تھیں۔

اب تو وہ کبھی کبھار کے بھولے بھٹکے آنے والے بھی تقریباً ختم ہی ہوگئے تھے۔ گھر میں کسی کے بھی منہ سے اس نے کبھی اپنی شادی کی باتیں نہیں سنی تھیں۔ اس کی ایک دو کولیگز جن کی شادیاں لیٹ ہوگئی تھیں اسے بتاتی تھیں کہ ان کی مائیں ان کی شادیوں کے لیے سخت پریشان ہیں۔

''میری امی تو میرے لیے 'یالطیف' کا وظیفہ پڑھتی ہیں۔'' ایک بتاتی تو دوسری کہتی۔

''میری امی سورہ فاتحہ روز عشاء کی نماز کے بعد پڑھ کر میرے رشتے کے لیے دعا کرتی ہیں۔''

اور وہ حیرت سے انہیں دیکھ کر رہ جاتی۔ یہاں تک کہ ایک دو بار بھابھی نے سمعیہ کی منگنی وغیرہ کی بات کی تھی، مگر اس کا کہیں ذکر نہیں ہوا تھا۔ اس کے سامنے کی بچی کا رشتہ اس کے ماں باپ طے کرنے والے تھے اور وہ خود؟ یہ کیسی زندگی تھی، کتنی اکیلی کتنی خاموش۔ اس کی دوستیں کہا کرتی تھیں۔

''تمہارے میاں کو تو کبھی تم پر غصہ ہی نہیں آیا کرے گا۔ جب ہم لڑکیاں ہو کر تم پر دل و جان سے عاشق رہتی ہیں تو وہ تو بس تمہارا دیوانہ ہوگا۔ تم اسے اپنے انگلیوں پر نچایا کرنا۔''

اور وہ ان لوگوں کی باتوں پر مسکرا کر رہ جایا کرتی تھیں۔ آج فروا کے ملنے پر اسے کتنی ہی گزری باتیں یاد آگئی تھیں۔ وہ باتیں جنہیں وہ اپنی زندگی کی مصروفیات میں کھو کر بھول چکی تھی۔ وہ بھول چکی تھی کہ وہ بھی ایک زندہ وجود ہے جس کے اپنے جذبات اور احساسات ہیں۔ جو زندگی میں اپنے لیے بہت کچھ چاہتا ہے۔ وہ اپنی ان سوچوں سے گھبرا کر ایک دم آئینے کے سامنے سے ہٹ گئی تھی۔

☆☆☆

''کہاں غائب تھیں نیک دل خاتون! میں تو اب اخبار میں تلاش گمشدہ کا اشتہار دینے ہی والا تھا۔''

وہ آج پورے چار دن کے بعد اپنی مخصوص جگہ پر بیٹھی کام کر رہی تھی۔ شہریار سے آمنا سامنا ہونے پر دعا سلام ہوئی اور اس کے سلام کا جواب دیتے ہی اس نے اگلی بات یہی کہی تھی۔ ان تین چار دنوں میں وہ بڑی ڈپریسڈ رہی تھی۔ اس کا کسی بھی کام میں دل نہیں لگ رہا تھا بڑی مشکلوں سے اس نے اپنے معمول کے کام خود پر جبر کر کے انجام دیئے تھے۔

''بس ذرا کچھ مصروفیت تھی اس لیے فرصت سے بیٹھنے کا موقع ہی نہیں مل رہا تھا۔''

وہ رواداری سے مسکراتے ہوئے بولی تو وہ گردن ہلا کر کہنے لگا۔ ''میں تو پریشان ہو گیا تھا کہ بڑی مشکلوں سے تو محلے میں کسی سے دوستی ہوئی تھی اور وہ خاتون بھی غائب ہو گئیں۔''

''آپ اکیلے بور ہوتے ہوں گے۔ ابھی تو آپ کی یہاں کسی سے زیادہ دوستی وغیرہ بھی نہیں ہوگی؟ رمیشہ نے ہمدردانہ انداز میں کہا۔

''ہاں یہاں محلے میں تو بس دو چار لوگوں سے آتے جاتے دعا سلام ہوئی ہے۔ ویسے میرے یہاں پر رشتہ دار وغیرہ ہیں اس کے علاوہ کچھ دوست بھی میرے یہاں کراچی میں رہتے ہیں مگر روزانہ سب سے ملنا تو بڑا ہی ناممکن کام ہے۔ وہ لوگ بھی کب تک کمپنی دیں گے اس لیے میں خود ہی زیادہ کسی کو ڈسٹرب نہیں کرتا۔''

وہ جینز اور ٹی شرٹ پہنے بڑا فریش نظر آ رہا تھا۔ چہرے پر خوشگوار سی مسکراہٹ جو مقابل کے دل کو بھی خوشی دینے کا باعث بنے، چھائی ہوئی تھی۔ اس نے رمیشہ کو اپنی جانب اتنا بغور دیکھتا پایا تو شوخ سی ہنسی ہنس کر بولا۔

''میری ممی کہا کرتی ہیں بلیک کلر مجھے سوٹ کرتا ہے۔ لگتا ہے اب ممی کی بات کا یقین کرنا ہی پڑے گا۔''

ایک پل کے لیے تو وہ بری طرح جھینپ کر رہ گئی تھی۔ پھر اپنی جھینپ مٹانے کے لیے فوراً بولی۔

''ماؤں کو اپنے بچے ہر رنگ میں اچھے لگتے ہیں، آپ اپنی ممی کی بات کو اتنا سیریس مت لیں۔''

اور جواب میں وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

''شکر ہے آپ نے بولنا تو شروع کیا۔ ورنہ میں سوچتا تھا ہر وقت چپ رہنے سے آپ کا منہ تو نہیں دکھ جاتا۔ بولنے اور ہنسنے میں اتنی کنجوسی اچھی بات نہیں ہے اور ویسے بھی آپ کی مسکراہٹ چاہے مونا لیزا جتنی حسین نہ سہی، مگر اتنی بھیانک بھی نہیں کہ آپ ہنسنا ہی چھوڑ دیں۔''

اس کے بے تکلفانہ انداز تخاطب نے رمیشہ کو کھلکھلا کر ہنسنے پر مجبور کر دیا تھا۔ شہریار بڑی توجہ سے اسے ہنستے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ پھر اس روز وہ دونوں کافی دیر تک مختلف موضوعات پر باتیں کرتے رہے۔ اپنی پسند ناپسند وغیرہ ایک دوسرے کو بتاتے رہے۔ حیرت انگیز طور پر ان دونوں کی پسند ناپسند میں بڑی مماثلت تھی۔ جو جو رائٹرز شہریار کو پسند تھے وہی رمیشہ کے بھی پسندیدہ تھے۔ میوزک بھی دونوں کو ایک سا پسند تھا۔ انہیں سب چیزوں پر باتیں کرتے کرتے مغرب کا وقت ہو گیا تھا۔ اذان کی آواز سنتے ہی شہریار نے اس سے اجازت چاہی تھی۔

''اچھا میں چلتا ہوں۔ اذان ہو گئی۔ باتوں میں وقت کا پتا ہی نہیں چلا۔ جلدی سے مسجد پہنچوں، کہیں جماعت نہ نکل جائے۔''

اور اس کی اس بات سے رمیشہ کو بہت خوشی ہوئی تھی۔ وہ اپنی عمر کا ایک طویل عرصہ باہر گزارنے کے باوجود



اپنے مذہب اور رسم و رواج سے دور نہیں ہوا تھا۔ اس کے بارے میں سوچتے ہوئے وہ بھی اندر آ گئی تھی اور نماز کی تیاری کرنے لگی۔

نماز کے بعد وہ حسب معمول کچن میں رات کے کھانے کی تیاری کرنے آ گئی تھی۔ گو گھر میں ایک کل وقتی ملازم موجود تھا مگر وہ لوگ اس سے صرف اوپر کے کام کروایا کرتے تھے۔ کھانا یا تو وہ پکاتی یا پھر بھابھی اور بھائی کی نوبت کبھی سالوں ہی میں آتی تھی۔ ہاں جس وقت وہ کھانا پکا رہی ہوتی بھابھی کچن کے اندر اور باہر اتنے چکر لگاتی تھیں کہ دیکھنے والے یہی سمجھتے تھے کہ بے چاری بہت کام کر رہی ہیں۔ انہیں کوئی کام نہ کرنے کے باوجود ہر جگہ چھائے رہنے کا ہنر آتا تھا۔ اگر اس کے چڑھائے سالن میں انہوں نے غلطی سے ٹماٹر یا ادرک بھی کاٹ کر ڈال دی ہوتی اور وہ چیز اچھی پک جاتی تو وہ کھانے کی میز پر اسے اپنے ہاتھوں کی کاوش قرار دیتی تھیں۔

''خالی گوشت چڑھانے سے تو سالن نہیں پک جاتا، سالن کی شکل اتنی پھیکی سی لگ رہی تھی۔ میں نے سارے مسالے اور ڈالے، آئل اور ڈالا۔ تب کہیں جا کر یہ شکل نکلی۔''

اس کے کچھ بولنے سے پہلے ہی وہ اسی وقت کا کوئی نہ کوئی جملہ فوراً بول دیا کرتی تھیں اور وہ چپ کی چپ رہ جاتی تھی۔

چار دن کے چھائے اس جمود کے بعد آج اسے اچانک اپنا موڈ بہتر ہوتا محسوس ہوا۔ وہ سالن بھونتے ہوئے اپنا من پسند گانا گنگنا رہی تھی۔

''کیا بات ہے خالہ! آج تو موڈ بڑا اچھا ہے۔''

عاشی نے کچن میں داخل ہوتے ہی اس سے کہا تھا اور اس کے ٹوکنے پر وہ خود حیران رہ گئی تھی۔ اس کے حساب سے تو آج سارا دن میں کوئی ایسی بات نہیں ہوئی تھی، جس سے موڈ اچھا ہونے کا کوئی تعلق ہو۔ اس نے آج کوئی خوشی کی خبر بھی نہیں سنی تھی۔ وہ تو اس دن شادی سے آنے کے بعد سے ہی بہت اداس اور چپ چپ تھی پھر آج اچانک ایسا کیا ہوا۔ وہ سوچتی رہی اپنے آپ سے الجھتی رہی مگر اپنی خوشی کا سبب خود ہی نہیں جان پائی۔

☆☆☆

اگلے روز شام میں بچوں کو پڑھاتے وقت وہ بار بار گھڑی دیکھ رہی تھی۔ دل چاہ رہا تھا جلدی سے بچوں سے فارغ ہو جائے۔ عاشی کو میتھس کا ٹیسٹ دیا، اریب سنی اور عبداللہ کو مضمون لکھنے کے لیے دیا اور خود جلدی سے اپنے کمرے میں آ گئی۔ اپنی فائل، بکس اور پین اٹھائے وہ بالکونی میں نکلی تو سامنے والی بالکونی ویران دیکھ کر اس کا دل ایک دم اداس ہو گیا۔ وہ کرسی پر بیٹھ کر سامنے ہی دیکھے جا رہی تھی۔ جب اس نے سامنے کھلی کھڑکی سے اندر کمرے کا دروازہ کھول کر آتے شہریار کو دیکھا۔ گرے سوٹ پہنے ہاتھ میں بریف کیس لیے وہ شاید ابھی ابھی آفس سے آیا تھا۔ صوفے پر بریف کیس رکھ کر وہ اب وہیں بیٹھ کر شوز اُتار رہا تھا، اچانک اس کی نظر سامنے پڑی تو ایک دم اس کے سنجیدہ چہرے پر مسکراہٹ چھا گئی تھی۔ وہ فوراً کھڑا ہوا، کوٹ اتار کر بیڈ پر پھینکتے ہوئے وہ باہر نکل آیا۔

''شکر ہے آج گھر آتے ہی آپ کی شکل دیکھی ہے۔ لگتا ہے، اب باقی کا دن اچھا گزرے گا۔'' وہ ٹائی ڈھیلی کرتے ہوئے بولا۔

''یہ بات صبح صبح کسی کا منہ دیکھنے پر کہی جاتی ہے۔ جبکہ اس وقت تو شام ہو چکی ہے۔'' رمیشہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

''ارے یہ محاورے اور اس قسم کی دیگر باتیں کوئی آسمان سے تھوڑی اتری ہیں کہ ان میں ترمیم نہ کی جا سکے۔'' وہ لاپروائی سے بولا۔ ''خیر آپ سنائیے کیا ہو رہا ہے؟''

''کچھ بھی نہیں وہی روٹین کا کام کل کے لیکچرز تیار کر رہی تھی۔'' وہ کچھ بیزاری سے بولی تو شہریار کہنے لگا۔

''لگتا ہے آپ روٹین لائف سے تنگ آ گئی ہیں۔ ایسا کریں کچھ دنوں کے لیے کہیں ہل اسٹیشن پر آؤٹنگ کے لیے چلی جائیں، فریش ہو جائیں گی۔'' اس کے پرخلوص انداز پر رمیشہ مسکرا دی۔

''یہ بات سوچی تو جا سکتی ہے۔ عملاً ایسا کرنا تقریباً ناممکن ہی ہے۔''

''کیوں، اس میں ناممکن کیا ہے؟'' وہ حیران ہوا تھا۔

''میں نے آپ کو بتایا تو تھا میری امی کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی۔ مجھے ہی ان کی دیکھ بھال کرنی ہوتی ہے۔ میں انہیں چھوڑ کر کیسے جا سکتی ہوں۔'' رمیشہ نے وضاحت کی تو وہ اسے ٹوکتے ہوئے بولا۔

''لیکن اس طرح تو آپ ایگزاسٹ ہو جائیں گی، تھوڑی بہت تفریح تو ضرور کرنی چاہیے۔ آپ کے گھر میں اور بھی تو لوگ ہیں۔ ساری ذمہ داری آپ نے اکیلے کیوں اٹھائی ہوئی ہے۔ سب مل جل کر ذمہ داری اٹھائیں تو کسی پر بھی بوجھ نہیں پڑتا اور اس سے آپس میں محبت بھی بڑھتی ہے۔''

وہ صاف گوئی سے دوٹوک انداز میں بولا تو رمیشہ اس ٹاپک کو ختم کرنے کے خیال سے بولی۔

''چلیں میں کوشش کروں گی کہ آپ کے مشورے پر عمل کروں اور مری یا ایبٹ آباد وغیرہ تک ہو آؤں۔''

شہریار اس کا انداز محسوس کر کے ہنس دیا۔ صاف لگ رہا تھا وہ صرف بات ختم کرنے کے لیے اس طرح بولی تھی۔ کچھ دیر وہ دونوں یوں ہی باتیں کرتے رہے۔ باتیں کرتے کرتے اچانک رمیشہ ہی کو اس بات کا خیال آیا کہ وہ ابھی تھکا ہارا آفس سے آیا ہے۔ اس نے ابھی کپڑے بھی نہیں چینج کیے تو اس سے بولی۔

''آپ ابھی ابھی آفس سے آئے ہیں اور میں نے آپ کو باتوں میں لگا لیا۔ پلیز آپ فریش ہوں جا کر۔'' پھر وہ خود بھی اندر آ گئی۔ رات میں سونے کے لیے لیٹی ہی تھی کہ کھڑکی پر کسی چیز کے ٹکرانے کی آواز سنائی دی۔ آج وہ حیران نہیں ہوئی تھی پتا تھا یہ شہریار کی حرکت ہے وہ اٹھ کر باہر آئی تو وہ کھڑا مسکرا رہا تھا۔

''آج میرا نشانہ نہیں چوکا دیکھ لیں، آپ کا شیشہ بالکل سلامت ہے۔''

''شیشہ تو سلامت ہے۔ آپ یہ بتائیں مجھے بلایا کیوں ہے؟'' وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

''اسٹاک ایکسچینج کی تازہ ترین صورت حال معلوم کرنی تھی۔ علاوہ ازیں پاکستان میں آنے والے زلزلہ اور اس کے اثرات پر گفتگو کرنی تھی اس کے علاوہ۔'' وہ بڑا اجل کر بول رہا تھا جب رمیشہ کے بے ساختہ قہقہے نے اسے اپنی ادھوری بات چھوڑ دینے پر مجبور کیا تھا۔

''بولتی ایسے ہیں جیسے بڑی مصروف شخصیت ہیں۔ اب کیا آپ سے بات کرنے کے لیے کسی باقاعدہ ایجنڈے کی ضرورت ہوا کرے گی۔ کیا بندہ یونہی گپ شپ نہیں کر سکتا۔'' اس کے اس شکوے پر وہ فوراً معذرتی انداز میں بولی۔



''آئی ایم سوری۔ مجھ سے غلطی ہوئی۔ آئندہ یہ بات کبھی نہیں کہوں گی۔'' اس کی معذرت پر وہ منہ بناتا ہوا چپ ہو گیا۔

''کہہ تو دیا سوری۔'' اب کے وہ چڑ گئی تھی۔ اس سے پہلے کہ شہریار جواب میں کچھ کہتا رمیشہ کے کمرے کا دروازہ کھولتی سمعیہ اندر آئی تھی وہ فوراً کمرے میں واپس آ گئی ''میں حیران ہو رہی تھی کہ آپ کمرے سے کہاں گئیں۔ واش روم کا دروازہ بھی کھلا ہے۔'' وہ صوبے پر پھیل کر بیٹھتے ہوئے بولی۔

''ہاں میں بس یہیں تھی۔'' پتا نہیں کیوں اسے ایسا لگا جیسے وہ کوئی چوری کرتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑی گئی ہے جبکہ سمعیہ اس کے تاثرات سے بےخبر آرام سے بیٹھی تھی۔

''اچھا یہ ہیں ہمارے نئے پڑوسی۔'' سمعیہ نے اندر کمرے میں جاتے ہوئے شہریار کو دیکھتے ہوئے کہا تو وہ وضاحتی انداز میں بولی۔

''میری بھی آج فرسٹ ٹائم ملاقات ہوئی ہے۔ بظاہر تو اچھے لوگ لگ رہے ہیں، خیر ہمیں کیا جیسے بھی ہوں۔ ہماری تو یہ ویسے بھی بیک سائیڈ ہی ہے۔'' وہ اپنا اعتماد بحال کرتے ہوئے بولی تو سمعیہ بھی گردن ہلا کر کہنے لگی۔

''بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ، ویسے بھی سب سے زیادہ آپ کو ہی ان لوگوں سے فرق پڑے گا۔ ہم سب کے بیڈ رومز تو نیچے ہیں اور سنی وغیرہ کے بھی سامنے ہیں اور آپ کی کبھی کسی سے لڑائی ہو ہی نہیں سکتی اس لیے فکر کی کوئی بات نہیں۔ وہ میری فرینڈ ہے نازگل، پتا ہے کیا کہہ رہی تھی؟''

سمعیہ اپنی باتونی عادت کے مطابق شروع ہو چکی تھی اور رمیشہ نے سکون کا سانس لیتے ہوئے اس کی باتوں میں دلچسپی لینی شروع کر دی تھی۔ سمعیہ یونہی باتیں کرنے کے لیے آئی تھی۔ کافی دیر بعد جب وہ اٹھ کر گئی اور وہ لائٹ آف کر کے سونے لیٹی تو خود سے سخت ناراض تھی۔

''یہ سب کیا تھا۔ کیا اسے ایسی حرکتیں کرنا زیب دیتا تھا۔ اسے اور کچھ نہ سہی، اپنے مرتبے ہی کا خیال کر لینا چاہیے تھا۔ پہلی مرتبہ تھا جب اسے کسی سے جھوٹ بولنا پڑا تھا۔ اپنی کسی حرکت کی پردہ پوشی کرنا پڑی تھی اور یہ سب اسے بہت بُرا لگ رہا تھا۔ ایسی حرکتیں تو اس نے اس وقت بھی نہیں کی تھیں جب اس کی عمر تھی اور اب اس عمر میں وہ یہ سب اسے بہت بُرا لگ رہا تھا۔ اگلے مہینے وہ پورے تیس سال کی ہونے والی تھی۔ اور اس ایج میں تو بڑے سے بڑے شوخ اور لاابالی لوگ بھی سنجیدہ ہو جاتے ہیں اور وہ اتنی فضول حرکتیں کر رہی تھیں۔ وہ خود سے خفا ہو گئی تھی۔ وہ اپنی اسٹوڈنٹس کو کس منہ سے کوئی نصیحت کر سکتی تھی، اگر وہ خود ایسی چیپ حرکتیں کرے گی۔

اسے شہریار سے ملے پورا ایک ہفتہ ہو گیا تھا۔ اس نے شام کے وقت بالکونی میں بیٹھنا چھوڑ دیا تھا۔ اپنے کمرے کی کھڑکیاں اور پردے وہ ہر وقت بند رکھنے لگی تھی، اور جو بات اسے جھنجھلاہٹ میں مبتلا کر رہی تھی وہ یہ تھی کہ ایسا وہ خود پر جبر کر کے کر رہی تھی۔ وہ جو دل ہر وقت گنگنانے کو چاہنے لگا تھا۔ خود بخود جو وہ خوش رہنے لگی تھی وہ ساری کیفیات یکسر ختم ہو گئی تھیں۔ اب ہر وقت دل پر اداسی ڈیرا جمائے رہتی تھی۔ اس دوران دو تین مرتبہ رات کے وقت اسے کھڑکی پر کسی چیز کے ٹکرانے کی آواز بھی سنائی دی تھی، مگر وہ منہ سر لپیٹے بستر میں دبکی رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ خود کو کوئی سزا دے رہی ہے۔ صبح کالج میں بھی اس پر عجیب سی کوفت سوار رہتی۔ خواہ مخواہ ہر کسی سے لڑنے کو دل

چاہنے لگا تھا۔ اس کی کولیگز اور اسٹوڈنٹس اس کے بیزار انداز پر حیران تھیں۔ اس کی خوش مزاجی اور دھیما انداز ہر جگہ مقبول تھا۔ وہ خود سے لڑتے لڑتے تھک گئی تھی۔ خود اپنے آپ کو کوئی بات سمجھانا کتنا مشکل کام ہے۔ یہ بات اس نے اب جانی تھی۔ اس رات وہ خود کو بہلا رہی تھی، سمجھا رہی تھی اپنے آپ کو باور کرا رہی تھی۔

''یہ کوئی محبت وحبت نہیں ہے۔ صرف اور صرف یہ ہے کہ میں ان دنوں کسی فرینڈ کی کمی بہت زیادہ محسوس کرنے لگی ہوں۔ مجھے اکیلا پن ستاتا ہے۔ اس لیے میں اس سے باتیں کر لیتی ہوں اور اس سے باتیں کر کے میرے دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے یہ کوئی ایسی بات نہیں جیسے سر پر سوار کیا جائے۔'' اس نے خود کو ڈانٹا تھا۔

اچانک وہ کھڑکی کے پاس آ کر کھڑی ہوگئی اور پردہ ذرا سا ہٹا کر باہر جھانکا۔ اس کے کمرے کی کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں۔ وہ راکنگ چیئر پر جھولتا کوئی کتاب پڑھنے میں مگن تھا۔ کتنی ہی دیر تک کھڑی وہ اسے دیکھتی رہی تھی۔ اپنی اس بے اختیاری کیفیت کا احساس ہوا تو وہ فوراً پردہ چھوڑ کر ہٹنے لگی۔ اسی وقت اس نے شہریار کی آواز سنی۔ وہ اپنی نظریں کتاب پر سے ہٹائے اب گردن گھما کر اسے دیکھ رہا تھا۔

''رمیشہ!'' وہ ایک دم پیچھے جانا نہیں چاہتی تھی، مگر کوئی طاقت اسے ایسا کرنے پر مجبور کر رہی تھی۔ وہ بڑے تھکے تھکے قدموں سے چلتی دروازہ کھول کر باہر نکل آئی تھی۔ اس کا دل عجیب متضاد کیفیات کا شکار تھا۔ وہ بیک وقت خوش بھی تھی اور اداس بھی۔ وہ سامنے کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر کسی گہری سوچ کی پرچھائیاں نظر آ رہی تھیں۔ رمیشہ سر جھکائے خاموش کھڑی تھی۔

''کیا ہوا ہے۔ کیا میری کوئی بات بری لگی ہے۔ پلیز جو بھی بات ہے مجھے بتاؤ۔ مگر میرے ساتھ اس طرح مت کرو۔''

رمیشہ نے اسے اس سے پہلے کبھی بھی اتنا سنجیدہ نہیں دیکھا تھا۔ وہ ہر دم ہنسنے ہنسانے والا انسان اس وقت بے حد الجھا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اس کی بات کے جواب میں کچھ کہنے کی کوشش کی تو بجائے الفاظ کے آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ اس وقت شاید خود پر قطعاً کوئی اختیار محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ وہ اپنے آپ کو اس کے سامنے رونے سے روکنا چاہتی تھی مگر ایسا کرنے سے قاصر تھی۔ وہ سر جھکائے اشک بہا رہی تھی اور وہ اسے روتا دیکھ کر بری طرح پریشان ہو گیا تھا۔

''خدا کے لیے مجھے بتاؤ تو سہی، ہوا کیا ہے؟'' وہ چیخ اٹھا تھا اور اس کے چیخنے پر وہ ایک دم سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھنے لگی تھی۔

''کچھ نہیں ہوا۔ بس آپ میرا پیچھا چھوڑ دیں۔ آپ یہاں سے کہیں اور چلے جائیں۔ میں آپ سے کبھی بھی ملنا نہیں چاہتی۔'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں چلائی۔

''کیوں چلا جاؤں، کیا کیا ہے میں نے؟ کیا برا کیا ہے میں نے تمہارے ساتھ؟'' وہ ایک دم غصے میں آگیا۔

''آپ میری پُرسکون زندگی کو ڈسٹرب کر رہے ہیں۔ میں بہت سکون سے رہتی تھی۔ مجھے ویسے ہی رہنے دیں۔ آپ اس طرح کیوں ملتے ہیں جیسے میں آپ کے لیے بہت اہم ہوں۔ جیسے مجھ سے ملنا اور باتیں کرنا آپ کے لیے بہت بڑی خوشی کی بات ہے۔ آپ کیوں کرتے ہیں ایسا؟'' وہ اپنے آنسو بے دردی سے صاف کرتے ہوئے ہذیانی انداز میں ...



''میں اس لیے اس طرح ملتا ہوں کیونکہ تم واقعی میرے لیے بہت اہم ہو۔ ہاں تم سے ملنا اور تم سے باتیں کرنا مجھے خوشی دیتا ہے اور اگر میں ایسا کرتا ہوں تو اس سب میں برائی کیا ہے۔ میں نے اپنی عمر کے تینتیس سال اپنے کیریر اور پروفیشن کی محبت میں گزار دیے۔ شادی کے بارے میں میرا نظریہ تھا کہ جب تک مجھے کوئی اس حد تک اچھا نہ لگے کہ مجھے اپنی زندگی میں اس کی کمی محسوس ہونے لگے میں شادی نہیں کروں گا۔ ممی میری شادی کی شدید خواہش رکھنے کے باوجود کبھی مجھے اس بات کے لیے قائل نہ کر سکیں کہ میں ان کی پسند کی لڑکی سے شادی کر لوں۔ شیخ صاحب سے یہ مکان خریدنے کے سلسلے میں یہاں آیا اور تب میں نے تمہیں یہیں اسی بالکونی میں بیٹھے دیکھا تھا۔ تم خود میں مگن اپنا کام کر رہی تھیں اور اسی وقت مجھے خود میں مگن اس دلکش وجود نے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ تم نے کبھی سوچا کہ پورا گھر چھوڑ کر میں نے اپنے لیے فرسٹ فلور پر بنے اسی کمرے کا انتخاب کیوں کیا۔ صرف تمہاری وجہ سے۔ میں تم سے باتیں کرنا چاہتا تھا۔ تمہارے بارے میں جاننا چاہتا تھا۔ تمہیں تو پتا بھی نہیں ہوگا یہاں شفٹ ہونے کے بعد کتنی مرتبہ صرف تمہیں دیکھنے کے لیے میں بالکونی میں آیا کرتا تھا۔ پھر ایک روز تمہارے پیپرز اڑ کر یہاں آگئے اور مجھے تم سے بات کرنے کا موقع مل گیا۔ جیسے جیسے تم سے ملتا گیا تمہاری کئی اور خوبیاں مجھے پتا چلتی چلی گئیں اور میں نے جانا کہ میرا انتخاب بالکل درست تھا۔ میں تم سے یہ سب کہنا چاہتا تھا مگر تمہیں ایک دم پتا نہیں کیا ہو گیا۔ میں نے تمہیں بلانے کی کتنی کوشش کی، مگر تم نے ہر بار مجھے مایوس کیا۔ کیوں رمیشہ! تم اس طرح کیوں کر رہی ہو کیا کسی کو پسند کرنا اتنا بڑا گناہ ہے۔ کیا میں نے کوئی برا کام کیا ہے؟ اس روز جب تم بالکونی میں بیٹھی میرا انتظار کرتی میرے کمرے میں دیکھ رہی تھیں تو میرا دل خوشی سے جھوم اٹھا تھا۔ مجھے اس بات کا اطمینان ہو گیا تھا کہ تمہارے دل میں بھی میرے لیے نرم گوشہ موجود ہے۔ پھر اب ایسا کیا ہوا ہے جو تمہیں پریشان کر رہا ہے۔''

اس نے بڑے جوشیلے انداز میں اپنی بات شروع کی تھی، مگر آخر میں ایک مرتبہ پھر اس کا لہجہ وہی دوستانہ سا ہو گیا تھا۔ وہ منتظر نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جیسے پوری امید تھی کہ ابھی وہ جواب میں کچھ نہ کچھ کہے گی۔

''رمیشہ! میری بات کا جواب دو۔'' وہ انتظار سے تنگ آ کر بولا۔

''مجھے کچھ نہیں پتا۔ میں بس اتنا جانتی ہوں کہ یہ ٹین ایجرز والی حرکتیں کرنا مجھے زیب نہیں دیتا۔'' وہ اس کی طرف دیکھنے سے گریز کرتے ہوئے بولی۔

''کیا کسی سے شادی کرنا ٹین ایجرز والی حرکت ہے۔ میں تمہارے ساتھ کوئی افیئر نہیں چلا رہا۔ میں نے ممی کو تمہارے بارے میں بتا دیا ہے۔ کل ہی ممی اور طلحہ پاکستان آئے ہیں۔ ممی تو فوراً تمہارے گھر آنے کے لیے تیار تھیں۔ میں نے انہیں روکا۔ میں تم سے اس بارے میں بات کرنا چاہتا تھا۔ تم سے تمہارے اس گریز کی وجہ معلوم کرنا چاہتا تھا۔ پلیز رمیشہ! اس طرح مجھے اگنور مت کرو۔ ایسا کر کے تم صرف مجھے ہی نہیں خود کو بھی دکھ پہنچا رہی ہو۔ تمہارے آنسو اس بات کی سب سے بڑی گواہی ہیں۔ مت خود سے جھوٹ بولو۔''

وہ بڑی آس سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ رمیشہ نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا تو وہ کہنے لگا۔

''میں ممی کو تمہارے گھر بھیج دوں؟'' وہ اس کی آنکھوں کو اپنی نظروں کی گرفت میں لیتے ہوئے بولا اور وہ خود سے کیے تمام عہد بھلائے گردن ہلا گئی تھی اور دوسری طرف وہ خوشی سے دیوانہ ہو گیا تھا۔

"تھینک گاڈ؟ میں نے یہ معرکہ تو سر کیا۔ اس سے آسان تو ایورسٹ سر کرنا ہوگا۔ لڑکی! تم اتنی مشکل کیوں ہو؟"

اور وہ ایک پل سے زیادہ اس کے سامنے ٹھہر نہیں سکی تھی۔ ان مقناطیسی نگاہوں سے اس وقت وہ سخت کنفیوز ہو رہی تھی۔ پیچھے سے وہ اسے آوازیں دیتا رہ گیا مگر وہ مڑ کر دیکھے بغیر واپس کمرے میں آ گئی۔ دل ابھی تک تیز تیز دھڑک رہا تھا۔ اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ سب اتنا اچانک کیسے ہو گیا۔ وہ اتنی آسانی سے کیسے ہار مان گئی اور وہ شہریار احمد یقیناً دلوں کو فتح کرنے کے تمام گر جانتا تھا۔ اس نے اسے جیت لیا تھا۔ دیکھ لینا وہ کوئی بہت ہی منفرد سا بندہ ہوگا۔ جسے اللہ تعالیٰ نے اسپیشلی تمہارے لیے بنایا ہوگا۔ جب وہ آئے گا تو تم یہ انکار ونکار سب بھول جاؤ گی۔ وہ یونانی دیوتاؤں کی سی آن بان والا آئے گا اور آ کر تمہیں اپنے ساتھ لے جائے گا۔"

کلثوم کے برسوں پہلے کہے گئے جملوں کی بازگشت آج بھی اس کی کانوں میں گونج رہی تھی۔ کتنے دنوں بعد وہ پرسکون ہو کر سونے لیٹی تھی۔ آج اسے خواب دیکھتے ڈر نہیں لگ رہا تھا۔ بند آنکھوں کے پیچھے نظر آتے شہریار احمد کے تصور سے وہ پیچھا چھڑانے کی شعوری کوشش نہیں کر رہی تھی۔

☆☆☆

صبح وہ بال سلجھاتی کھڑکی کے پاس کھڑی تھی۔ شہریار کو دیکھ کر وہ ایک دم ہٹنے لگی تو وہ فوراً بولا۔

"مجھ سے بات نہیں کرنی تو مت کرو۔ مجھے صرف یہ پیغام دینا تھا کہ آج شام ممی تمہارے گھر آئیں گی۔"

اس کے ہٹنے سے پہلے وہ خود واپس کمرے میں چلا گیا تھا۔

اس روز شام کا انتظار کرنا اسے بڑا ہی کٹھن لگا۔ ایسا لگ رہا جیسے وقت رک گیا ہو۔ کالج سے آنے کے بعد ہی وہ سخت کانشس تھی۔ وہ تین بار اس نے کوشش کی کہ یہ بات امی کو بتا دے، مگر ہر بار ایک جھجک سی آڑے آ گئی۔ وہ پتا نہیں اس کے بارے میں کیا سوچیں گی یہی سوچ کر وہ ہچکچا کر رہ گئی۔ شام میں گیٹ پر بیل کی آواز سن کر وہ ایک دم نروس ہو گئی۔

سنی نے گیٹ پر دیکھا تھا، مہمان کو ڈرائنگ روم میں بٹھا کر وہ لاؤنج میں آ گیا۔ رمیشہ اور امی وہیں لاؤنج میں بیٹھے تھے۔

"دادی کوئی آنٹی آئی ہیں انہیں آپ سے ملنا ہے۔" سنی کا پیغام سن کر امی اٹھیں اور آہستہ قدموں سے چلتی ڈرائنگ روم میں چلی گئیں۔ سنی جیسے ہی ادھر ادھر ہوا وہ جلدی سے اٹھ کر ڈرائنگ روم کے برابر والے کمرے میں آ گئی۔ اور کھڑکی کے پاس کھڑی ہو کر باتیں سننے کی کوشش کرنے لگی۔ اپنی اس حرکت پر اسے خود ہی ہنسی آ رہی تھی۔ ایسی حرکتیں فلموں وغیرہ میں دیکھ کر وہ کتنا مذاق اڑایا کرتی تھی۔ امی اور شہریار کی ممی کے درمیان رسمی سی باتیں ہو رہی تھیں۔

اس گفتگو کے دوران عاشی کولڈ ڈرنک وغیرہ سرو کر کے جا چکی تھی۔ تھوڑی بہت دیر کی پرتکلف گفتگو کے بعد جب وہ اپنے مطلب کی بات پر آئیں تو رمیشہ کچھ پریشان سی ہو گئی۔ پتا نہیں وہ کیا بتائیں گی اور امی کیا سمجھیں گی۔ اسے فکر لاحق ہوئی۔ مگر جب انہوں نے امی سے کہا۔

"آپ کی بیٹی رمیشہ ماشاء اللہ بڑی پیاری بچی ہے۔ آتے جاتے کئی بار اس سے ملاقات ہوتی ہے۔ بہت سلجھی ہوئی اور اچھے اخلاق واطوار کی مالک ہے۔"



تو اس کا دل احساس تشکر سے لبریز ہو گیا۔ وہ ساری زندگی باہر گزار کر آئی تھیں۔ ان کے نزدیک پسند کی شادی کوئی بری چیز نہیں ہو سکتی تھی۔ انہیں ایسا کہنے کے لیے یقیناً شہریار نے کہا ہوگا، رمیشہ کو پورا یقین تھا اور وہ شخص اسے اور بھی زیادہ اچھا لگنے لگا تھا۔

"آپ کی عزت افزائی کا بہت شکریہ۔ آپ نے میری بیٹی کو اپنے بیٹے کے لیے پسند کیا آپ سے مل کر اندازہ ہو رہا ہے کہ آپ کا بیٹا یقیناً بہت اچھا ہوگا۔ مجھے آپ کو انکار کرتے افسوس تو ہو رہا ہے، مگر مجبوری یہ ہے کہ ہم لوگ خاندان سے باہر رشتہ نہیں کرتے۔"

امی کی دل چیر دینے والی یہ باتیں سن کر وہ سکتے کے عالم میں کھڑی تھی۔ اس کی زندگی میں آنے والی پہلی خوشی اس سے کتنی آسانی سے چھین لی گئی تھی۔ اس کے بعد امی کی اور ان کی کیا کیا باتیں ہوئیں اسے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ وہیں دیوار سے ٹیک لگائے فرش پر بیٹھ گئی تھی۔

"ایسا تو اس نے سوچا بھی نہیں تھا اس کا خیال تھا کہ وہ رشتہ لے کر آئیں گی امی ہاں یا ناں کہے بغیر انہیں رخصت کر دیں گی اور بعد میں وہ امی سے اس رشتے کے لیے اقرار کرنے کا کہے گی۔ مگر کچھ بھی اس کی سوچ جیسا نہیں ہوا تھا۔ وہ رونا چاہتی تھی مگر آنکھ سے ایک آنسو بھی نہیں ٹپکا تھا۔

"ہمارے پیچھے والے مکان میں جو لوگ رہتے ہیں ان کی والدہ آئی تھیں۔ اپنے بیٹے کے لیے رمیشہ کا رشتہ مانگنے۔"

کھانے کی میز پر امی نے یہ بات بھیا کے گوش گزار کی، بھابھی ایک دم سب مصروفیت چھوڑ چھاڑ امی کی طرف متوجہ ہو گئی تھیں۔ وہ صرف سب کے سوالوں سے بچنے کے لیے کھانے کی میز پر بیٹھی تھی۔

"آپ نے کیا جواب دیا؟" بھابی نے بھیا کو موقع دیے بغیر جلدی سے پوچھا۔

"جواب کیا دینا تھا۔ میں نے بہانا کر دیا کہ ہمارے ہاں اپنوں میں شادی کرتے ہیں۔ ارے ایسے کیسے کسی انجان آدمی کے حوالے کر دوں میں اپنی بیٹی، وہ بتا رہی تھیں ان کا بیٹا امریکن نیشنل ہے۔ ارے یہ امریکہ پلٹ بڑے خطرناک ہوتے ہیں پہلے ہی وہاں شادی کر رکھی ہوتی ہے۔ پاکستان آ کر دوبارہ دولہا بن جاتے ہیں۔"

امی نے فخریہ انداز میں داد طلب نظروں سے سب کی طرف دیکھا، بھیا تو خاموشی سے کھانا کھاتے رہے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا انہیں اس ذکر سے زیادہ پائے کھانے میں مزہ آ رہا تھا۔

بھابی نے البتہ فوراً ہی امی کی ہاں سے ہاں ملائی تھی۔ "بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ۔"

اور وہ جس کے بارے میں یہ ساری بات ہو رہی تھی خاموش بیٹھی اپنے آنسو پینے کی کوشش کر رہی تھی۔ ماؤں کو تو اپنی بیٹیوں کی شادی کی بہت فکر ہوتی ہے پھر اس کی امی ایسی کیوں ہیں، انہیں کیوں اس کے دل کی خوشی کا خیال نہیں۔ مائیں تو بچوں کے چہرے پڑھ لیا کرتی ہیں۔ اور امی نے کیا اس کا چہرہ نہیں پڑھا۔ اس نے اپنے پروپوزلز آتے اور ریجیکٹ ہوتے بہت دیکھے تھے، مگر یہ پہلا موقع تھا کہ کسی آنے والے کو اسی وقت انکار کر دیا گیا تھا۔ ورنہ امی عام طور پر اگلی ملاقات میں انکار کیا کرتی تھیں۔ اس بار انہیں انکار کرنے کی اتنی جلدی کیوں تھی۔ اپنے کمرے میں آ کر وہ مسلسل اسی قسم کی باتیں سوچ رہی تھی۔

''خوشیوں کی عمر اتنی مختصر کیوں ہوتی ہے۔ ابھی تو میں نے ڈھنگ سے خواب دیکھے بھی نہیں تھے کہ سب کچھ ختم ہو گیا۔'' تمام تر صبر و ضبط کے بند ٹوٹ چکے تھے۔ وہ اپنے خوابوں کی اس پامالی پر پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ ''اور وہ شہریار میرے بارے میں کیا سوچے گا کہ میں جھوٹی ہوں۔ میں نے اس سے کی کمٹمنٹ نہیں نبھائی۔''

وہ خود کو کسی صورت سمجھا نہیں پا رہی تھی۔ اس کے اندر کوئی چیخ چیخ کر اعلان بغاوت کر رہا تھا۔ اپنی خوشی پانے کی طلب کر رہا تھا۔ ساری رات روتے روتے گزر گئی تھی۔ صبح اس کا کالج جانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا، مگر پھر بھی اسے امی کے کام کرنے کے لیے تو لازمی باہر نکلنا ہی تھا امی کے لیے ناشتا لے کر پہنچی تو وہ اسے دیکھ کر کہنے لگیں۔

''تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی۔ رہنے دیتیں ناشتا، کوئی اور بنا دیتا۔ تم آرام کرتیں۔

اور امی کے اس تشویش بھرے انداز پر اس کا دل دکھ سے بھر گیا تھا۔ کبھی کسی اور موقع پر انہوں نے یہ بات کی ہوتی تو وہ خوشی سے نہال ہو جاتی، مگر آج اسے اس بات سے کوئی خوشی نہ ہوئی تھی۔

ناشتے کی تیاری میں بھابھی کی مدد کرانے کے خیال سے کچن میں گئی تو انہوں نے بڑی معنی خیز نگاہوں سے اس کے روئے روئے چہرے کو دیکھا۔ ان کی نگاہوں کی معنی خیزی اسے کوفت میں مبتلا کر رہی تھی۔ صرف بھابھی کے سوال جواب سے بچنے کے لیے وہ کالج کے لئے تیار ہو گئی۔ جب دل اداس ہو تو کچھ بھی اچھا نہیں لگتا، یہی حال اس کا تھا۔ کالج جا کر اس کے دل کی اداسی اور ویرانی ہنوز برقرار تھی۔ چھٹی کے وقت پارکنگ کی طرف آتے وہ بے حد الجھی ہوئی تھی۔ اپنے گھر جانے کا تصور اسے زندگی میں پہلی مرتبہ سوہان روح لگا تھا۔ گاری کا لاک کھولتے سامنے سے آتے شہریار کو دیکھ کر بے ساختہ اس کے ہاتھ سے چابی گر گئی تھی۔

''مجھے تم سے بات کرنی ہے، میرا خیال ہے اس بات کے لیے کالج مناسب جگہ نہیں ہے۔''

وہ دو ٹوک انداز میں حکم دیتا واپس گیٹ کی طرف چلا گیا تھا اس نے مڑ کر یہ دیکھنے کی کوشش بھی نہیں کی تھی کہ وہ اس کے پیچھے آ بھی رہی ہے یا نہیں۔ اور وہ چپ چاپ مجرموں کی طرح اس کے پیچھے چلنا شروع ہو گئی تھی۔ گیٹ سے باہر نکلی تو وہ گاڑی میں اس کا منتظر بیٹھا تھا رمیشہ جیسے ہی اس کے برابر والی سیٹ پر بیٹھی اس نے گاڑی اسٹارٹ کر دی تھی۔ دو چار سنٹ کی خاموشی کے بعد شہریار نے گردن گھما کر اس کی طرف دیکھا وہ سر جھکائے بیٹھی اپنے ہاتھوں کو گھور رہی تھی۔

''تم روئی تھیں؟'' اس کی طرف بغور دیکھتا وہ بولا تھا۔ وہ بغیر کوئی جواب دیئے یونہی بیٹھی رہی تو وہ چڑ کر بولا۔

''ہر مسئلے کا حل رونا نہیں ہوتا، میں نے تمہیں ممی کے آنے کا بتایا تھا پھر تم نے اپنی امی کو پہلے سے اس بارے میں کچھ کیوں نہیں بتایا۔ اس کی مسلسل چپ سے تنگ آ کر وہ مزید غصے میں آ گیا۔

''اور تمہارے گھر والے کس قسم کے ہیں۔ تمہاری امی نے تم سے پوچھے بغیر فوراً ہی منع کر دیا۔ پتا ہے ممی گھر آ کر مجھے کیا بتا رہی تھیں، وہ کہہ رہی تھیں کہ رمیشہ کی امی کا سرے سے اس کی شادی کرنے کا ارادہ ہی نہیں ہے۔ اتنے خود غرض لوگوں کی تم دن رات ایک کر کے خدمتیں کرتی ہو؟'' شہریار کی یہ بات اسے تیر کی طرح جا کر لگی تھی۔

''پلیز شہریار! آپ اس قسم کی باتیں مت کریں۔'' اس کی ناگواری کا وہاں کوئی اثر نہ تھا۔ وہ بڑے غصیلے انداز میں بولا۔



''جو سچ بات ہے میں وہی کہوں گا۔ تمہارے گھر والوں کے نزدیک تم صرف ایک مشین ہو اور بس۔ اور سب سے افسوس کی بات یہ ہے کہ ان لوگوں میں تمہاری امی بھی شامل ہیں۔ تمہیں سن کر حیرت ہو گی کہ میں نے ممی کو بھیج تو دیا تھا مگر تمہارے گھر والوں کے بارے میں، میں نے اتنے دنوں میں جو رائے قائم کی تھی، اس حساب سے یہی جواب متوقع تھا۔ وہ کیوں تمہاری شادی کریں، ایسی اچھی نوکرانی، باورچن، نرس، گورنس، ڈرائیور، ٹیچر انہیں کہیں اور ملے گی بھی تو نہیں۔''

آپ کو کوئی حق نہیں پہنچتا کہ آپ میرے گھر والوں کو کچھ کہیں۔'' وہ بھی اب کے غصے میں آ گئی تھی۔

''ہاں مجھے کوئی بھی حق نہیں ہے۔ وہ جو تمہاری زندگی تباہ کر رہے ہیں۔ انہیں سب حقوق حاصل ہیں۔ رمیشہ! تم لاکھ حقیقت سے آنکھیں چراؤ مگر سچ یہی ہے کہ تمہارے گھر میں کوئی بھی تم سے محبت نہیں کرتا۔ وہ سب تم سے اپنا مطلب پورا کرتے ہیں تم نے کبھی مجھ سے اس بارے میں زیادہ بات نہیں کی مگر پھر بھی مجھے پتا ہے، تم خود بھی ان تمام باتوں کو محسوس کرتی ہو۔ کیا کوئی ماں اتنی ظالم ہو سکتی ہے کہ محض اس وجہ سے اپنی بیٹی کی شادی نہ کرے کہ اس کی شادی ہو گئی تو میری خدمت کون کرے گا، کیا کوئی بہن ایسی ہو سکتی ہے کہ اس لیے اپنی بہن کی شادی نہ ہونے دے کہ اس کی شادی ہو گئی تو میرے بچوں کی دیکھ بھال کون کرے گا۔ اور کیا کوئی بھائی بھابی ایسے ہو سکتے ہیں کہ اس لیے اپنی بہن کی شادی نہ کریں کہ اگر اس کی شادی ہو گئی تو بیمار اور معذور ماں کی ساری ذمہ داری ہم پر آ جائے گی۔''

وہ بڑی بے رحمی سے وہ تمام باتیں کر رہا تھا جو اس نے اس سے پہلے صرف محسوس کی تھیں، کبھی ان کا کسی سے اظہار نہیں کیا تھا۔

''رمیشہ! یہ زندگی ہمیں صرف ایک بار ملی ہے۔ تمہاری زندگی پر دوسروں سے زیادہ تمہارا حق ہے۔ تم اپنی زندگی خود جیو۔ ایسا کیوں ہے کہ تمہاری زندگی دوسرے لوگ بسر کر رہے ہیں۔ ان مطلب پرستوں کے چنگل سے نکل آؤ۔''

شہریار کی نرم لہجے میں کی گئی یہ بات اسے بری طرح غصہ دلا گئی تھی۔

''جو امید آپ مجھ سے رکھ رہے ہیں افسوس میں وہ کبھی بھی پوری نہیں کر سکتی۔ میرے لیے دنیا میں ہر چیز سے بڑھ کر میری ماں اور بہن بھائی ہیں۔ آپ مجھے کسی غلط بات کے لیے مت اکسائیں۔''

''اس کا مطلب ہے تم اپنے گھر والوں کے سامنے اسٹینڈ نہیں لوگی۔''

وہ ایک دم بریک لگا کر بولا تھا، گاڑی سڑک کے کنارے روک کر وہ اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''جی ہاں جو میری امی کا فیصلہ ہے، وہی میرا بھی ہے۔ میں اپنے گھر والوں کے خلاف نہیں جا سکتی۔''

اس کی بات سنتے ہی اس نے طوفانی انداز میں گاری اسٹارٹ کر دی تھی۔ انتہائی تیز رفتاری سے ڈرائیو کرتے ہوئے شہریار نے اس کے کالج کے سامنے گاڑی روکی تھی وہ سامنے ونڈ اسکرین پر نظریں جمائے خاموش بیٹھا تھا۔ وہ دروازہ کھولتے ہوئے بولی۔

''پلیز آپ مجھے مس انڈر اسٹینڈ مت کیجئے گا۔ آپ......؟'' شہریار کے تند و تیز لہجے نے اسے اپنی بات مکمل نہیں کرنے دی تھی۔

''رمیشہ تیمور! مجھے ظلم کرنے والے سے زیادہ نفرت ظلم سہنے والے سے ہے۔ اور آج سے تم بھی ان ہی قابل

نفرت لوگوں میں شامل ہوگئی ہو۔ میں تمہیں کوئی بددعا نہیں دے رہا۔ مگر آج سے دس پندرہ سال بعد جب تم بالکل اکیلی رہ جاؤ گی، سب ایک ایک کر کے تمہیں اپنا مطلب پورا ہونے پر چھوڑ جائیں گے، تب چاہے ایک لمحے کے لئے سہی مگر میں تمہیں یاد ضرور آؤں گا۔ مگر تب سوائے پچھتاوؤں کے زندگی میں کچھ بھی نہیں بچا ہو گا۔“

گاڑی آگے جا چکی تھی۔ اور وہ ابھی تک وہیں کھڑی چپ چاپ اس جاتی ہوئی گاڑی کو دیکھ رہی تھی۔

☆☆☆

ایسا لگتا تھا زندگی ٹھہر گئی ہے۔ یوں جیسے کرنے کو کچھ رہا ہی نہیں ہے۔ وہی تمام معمولات زندگی جنہیں پہلے وہ بڑی خوش اسلوبی سے نبھایا کرتی تھی اب اسے صرف ایک ذمہ داری محسوس ہوتے تھے۔ اسے ایسا لگنے لگا تھا جیسے وہ واقعی ایک مشین بنتی جا رہی ہے۔ شہریار نے شاید اپنا کمرہ ہی بدل لیا تھا اس کے کمرے کی اب ہر وقت لائٹ بند رہتی تھی۔ اس شخص کا دل توڑ کر خوش تو وہ بھی نہیں تھی۔

”کیا اب ساری زندگی یونہی گزرے گی۔ کیا یہ احساس زیاں مجھے ہمیشہ یونہی تنگ کرتا رہے گا۔ کیا اب زندگی میں میں، کبھی سچے دل سے ہنس پاؤں گی۔ کیا اسے کھو کر مجھ سے جی لیا جائے گا۔“

اپنے اندر سے اٹھتے ان سوالوں کو وہ دانستہ نظر انداز کر دیا کرتی تھی۔

☆☆☆

ایپا پاکستان آئی ہوئی تھیں۔ ان کی آمد پورے گھر کو ہلا دیا کرتی۔ امی کا بس نہیں چلتا تھا ورنہ وہ سب کو ہر وقت ایپا کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑا رہنے پر مجبور کر دیتیں۔

اس کی طبیعت کافی دنوں سے خراب تھی۔ پہلے دو دن تو اس نے اس بخار کا زیادہ نوٹس نہیں لیا اور خود ہی دوا وغیرہ کھا کر دوبارہ کام میں لگ گئی۔ ایپا کے آنے کی وجہ سے کام کا بوجھ بھی بڑھ گیا تھا۔ گھر میں کھانا پکانے کے لیے نوکر چاکر تو تھے نہیں۔ اور امی بیٹی اور داماد کے لیے ہر وقت دعوتی اہتمام چاہتی تھیں۔ خود ایپا کا بھی ایک سے ایک مشکل ڈش کھانے کا دل چاہتا رہتا تھا۔

”بارش ہو رہی ہے، آلو کے پراٹھے بنالو“ اور اگر آلو کے پراٹھے صرف کہہ دینے سے فوراً بن جایا کرتے تو بات ہی کیا تھی۔

اتوار تھا، سارے ہی افراد گھر پر موجود تھے۔ بھابی تو ایسے موقعوں پر بڑی خوبصورتی سے ہری جھنڈی دکھا دیا کرتی تھیں۔ صرف آلو ابلنے کے لیے انہوں نے رکھے تھے اس کے بعد اچانک ان کے سر میں شدید قسم کا درد شروع ہو گیا تھا۔ نتیجتاً وہ اپنے کمرے میں جا کر لیٹ گئی تھیں۔ یہ اور بات ہے کہ جب کھانا لگ رہا تھا ان کا درد اچانک خود بخود ہی ٹھیک ہو گیا تھا۔

”چلو اب تم بیٹھو، کب سے لگی ہوئی ہو، کھانا میں لگا لوں گی۔“

انہیں کسی سے بھی تعلقات نہ بگاڑنے کا گر آتا تھا۔ سمعیہ اور عاشی تو تھیں ہی کام چور اس لیے آرام سے بیٹھی ٹی وی دیکھ رہی تھیں۔

طبیعت خراب میں اتنی دیر تک کھڑے رہ کر کام کرنے سے اس کی طبیعت مزید بگڑ گئی تھی۔ پورا جسم ٹوٹتا ہوا



محسوس ہو رہا تھا، وہ کھانا کھائے بغیر اپنے کمرے میں جا کر لیٹ گئی۔ ہاتھ لگا کر خود کو دیکھا تو اندازہ ہوا کہ اسے کتنا تیز بخار ہو رہا تھا۔ وہ کھانا لگا کر ایسے ہی کمرے میں آ کر لیٹ گئی تھی۔ اس لئے اب توقع کر رہی تھی کہ کوئی نہ کوئی اسے بلانے ضرور آئے گا۔ اس کے اندر اتنی ہمت بھی نہیں تھی کہ اٹھ کر کمبل اوڑھ لیتی۔ وہ انتظار کر رہی تھی کہ کوئی آئے اور وہ کمبل خود پر ڈلوا کر کوئی دوا بھی اپنے لیے منگوا لے۔ کافی دیر گزر گئی تھی اور کوئی بھی اس کے پاس نہیں آیا تھا۔

وہ اکیلی پڑی کراہ رہی تھی۔ سر درد سے پھٹ رہا تھا۔

”کیا ہوا پھپھو! آپ کھانے پر کیوں نہیں آئیں“ عبداللہ کی آواز سن کر اس نے خدا کا شکر ادا کیا تھا۔

”عبداللہ! مجھے یہ کمبل اڑھا دو، اور ڈسپرین یا کوئی بھی پین کلر مجھے لا دو“ اس کی نقاہت بھری آواز سن کر وہ ایک دم چونکا۔

”پھپھو! آپ کو تو بہت تیز بخار ہو رہا ہے۔ چلیں ڈاکٹر کے پاس چلتے ہیں“ عبداللہ نے اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر دیکھتے ہی فوراً کہا۔

پھر عبداللہ نے اسے ہاتھ پکڑ کر اٹھایا تو وہ کھڑی ہوئی، اس سے ایک قدم بھی نہیں اٹھ رہا تھا۔ پتا نہیں اتنی دیر وہ کیسے کچن میں کھڑی رہی تھی۔ شاید اس میں عام لوگوں سے زیادہ دل پاور تھی۔ ڈاکٹر نے اس کی حالت کے پیش نظر اور مریضوں سے پہلے اسے دیکھا تھا۔ ڈاکٹر نے ٹائیفائیڈ کا خدشہ ظاہر کیا تھا۔

وہ چیک اپ کروا کر دوائیں لے کر گھر واپس آ گئی تھی۔ لاؤنج میں کوئی بھی نہیں تھا۔ جاتے وقت بخار بہت تیز تھا۔ اس لیے وہ اس طرف دھیان نہ دے سکی تھی۔

”سب لوگ کہاں ہیں؟“ عموماً گھر والے لاؤنج ہی میں بیٹھا کرتے تھے۔ خصوصاً اتوار کو تو سب لاؤنج ہی میں پائے جاتے تھے۔

”موسم اچھا ہو رہا تھا اس لیے بڑی پھپھو سب کو گھمانے لے گئیں۔ صرف میں، مما، پپا اور آپ گھر پر ہیں۔“ عبداللہ کی بات پر اسے شاک لگا تھا۔

”دادی بھی گئی ہیں؟“ اپنے کمرے میں آ کر بیڈ پر لیٹتے ہوئے اس نے تصدیق چاہی تھی۔

”ہاں ویسے وہ جا نہیں رہی تھیں، بڑی پھپھو انہیں زبردستی لے کر گئی ہیں۔ میں اس لیے نہیں گیا کیونکہ آج ہمارا میچ ہے۔ میں تو آپ کو دیکھنے آیا تھا کہ آپ کر کیا رہی ہیں۔ آپ نے کسی کو بتایا بھی نہیں کہ آپ کی طبیعت خراب ہے۔ کھانے کی میز پر آپ کی غیر حاضری کی وجہ سے مما کا موڈ بری طرح آف ہو گیا تھا، وہ کہہ رہی تھیں ”ہاں ہم بھوکوں کے لیے وہ پکا کر اپنے کمرے میں چلی گئی ہیں۔ ایک دن اکیلے کام کر لیا تو اتنا برا لگا ہے۔ ہمیشہ ہم مل کر ہی کام کرتے ہیں۔ کیا بندے کی کبھی طبیعت خراب نہیں ہو سکتی۔ اب وہ غصے میں کھانا ہی نہیں کھائیں گی۔ پھر مما ناراض ہو کر ٹیبل پر سے اٹھ گئی تھیں۔ اسی لیے وہ بڑی پھپھو کے ساتھ بھی نہیں گئیں اور پاپا بے چارے اب مما کو منانے میں مصروف ہیں۔“

عبداللہ خود ہی اپنی بات کو انجوائے کرتا ہوا ہنسا تھا۔ جب کہ وہ چپ چاپ بت بنی اس کی بات سن رہی تھی۔

عبداللہ نے اسے دوائی کھلائی اور خدا حافظ کہتا باہر چلا گیا۔

”اچھا پھپھو! میں میچ کھیلنے جا رہا ہوں، دیر سے آؤں گا۔“

دوا کھا کر کب اس کی آنکھ لگی اسے پتا ہی نہیں چلا۔ آنکھ کھلی تو چاروں طرف اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر لیمپ آن کیا اور گھڑی کی طرف دیکھا تو پتا چلا رات کے گیارہ بج رہے ہیں۔

دوائی کی وجہ سے بخار فی الحال تو اتر گیا تھا۔ وہ ہمت کر کے بستر پر سے اٹھی۔ دوا کی اگلی خوراک سے پہلے کچھ نہ کچھ کھانا بے حد ضروری تھا، وہ نیچے آئی تو امی، اپیا اور عاشی لاؤنج میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ امی اس کی طرف دیکھتے ہی فوراً بولیں۔

''کیا ہو گیا ہے تمہیں رمیشہ! کوئی گھر آئے مہمانوں کے ساتھ اس طرح بھی کرتا ہے۔ کبھی، کبھی تو بہن، بہنوئی آتے ہیں اور ان کے لیے اگر تم کچھ پکا لو گی تو کیا اس طرح روٹھا کرو گی۔''

''بھئی میں نے تو ایک بات کہی تھی۔ اگر تمہارا دل نہیں چاہ رہا تھا تو منع کر دیتیں۔ اس طرح سب کا موڈ تو خراب مت کرواتیں۔ بلاوجہ بھابھی بھی سب سے ناراض ہو گئیں۔ بس امی اب جب تک میں یہاں ہوں خود کھانا پکاؤں گی۔ تاکہ جھگڑے کی جڑ ہی ختم ہو۔ کام پر اتنی کل کل، کھانا پکانا بھی کوئی کام ہے۔ میں چالیس چالیس لوگوں کی دعوتیں وہاں اکیلیے ارینج کرتی ہوں۔''

اپیا نے بغیر کسی مروت کے حسب عادت اسے آڑے ہاتھوں لیا تھا۔ پتا نہیں کیوں دل ایک دم اتنا بھر آیا کہ وہ بجائے کوئی جواب دینے کے واپس اپنے کمرے میں آ گئی۔ کمرے میں آ کر بلک بلک کر روتے وہ مزید نڈھال ہو گئی تھی۔ عبداللہ بہت لاپروا تھا کھیل سے آ کر اسے کسی کو اس کی بیماری کی بابت بتانا یاد ہی نہیں رہا ہوگا مگر کیا اس کی شکل سے نہیں پتا چل رہا تھا کہ وہ بیمار ہے۔

''تمہارے گھر والوں کے نزدیک تم صرف ایک مشین ہو۔'' یہ بات یاد آنے کی دیر تھی اس کے رونے میں اور شدت آ گئی تھی۔

''ہاں میں مشین ہوں، اور مشین صرف کام کرتی اچھی لگتی ہے جب تک مشینری صحیح کام کرتی ہے ہم استعمال کرتے ہیں اور جب وہ کام درست طریقے سے نہ کریں تو انہیں یا تو مرمت کرایا جاتا ہے یا پھر کہیں اسٹور وغیرہ میں فالتو سامان کی طرح ڈال دیا جاتا ہے۔''

مسلسل ذہنی دباؤ، رات بھر رونا اور پھر دوا بھی نہ کھانے سے صبح اس کی طبیعت مزید خراب ہو گئی تھی۔ گھر میں اس کے بغیر صبح ہی نہیں ہو سکتی تھی۔ امی کو جب وقت پر ناشتہ نہیں ملا تو اسے دیکھنے آئی تھیں۔ پھر انہوں نے ہی اسے دودھ پلایا اور دوا کھلائی۔

''خود پر ترس کھانے کا یہ کون سا انداز ہے۔ طبیعت خراب تھی تو بتانا چاہیے تھا۔ کسی کو الہام تو ہونے سے رہا۔''

وہ اس کے پاس سے اٹھتے ہوئے بولیں تو وہ چپ چاپ لیٹی رہی۔ پھر اس پر اتنی مہربانی ضرور ہو گئی تھی کہ دوپہر میں سمعیہ اس کے لیے کھانا کمرے میں لے آئی تھی۔

''سمعیہ! میرے پاس تھوڑی دیر اور بیٹھ جاؤ۔ اکیلے میرا دل گھبرا رہا ہے۔'' وہ کھانا رکھ کر جانے لگی تو رمیشہ نے کہا تھا۔

''سوری پھپھو! میں بیٹھ جاتی مگر مجھے اپنی فرینڈ کے گھر جانا ہے۔ آ کر آپ کے پاس بیٹھوں گی۔'' اور وہ



اسے جاتا دیکھتی رہ گئی۔

وہ گھر والوں کی صحت سے متعلق بہت کانشس رہا کرتی تھی کوئی بھی بیمار ہوتا تو وہ خدمت میں دن رات ایک کر دیتی تھی۔ اور آج اس کے پاس دو گھڑی بیٹھنے کی کسی کے پاس فرصت نہیں تھی۔ اپیا اور امی ایک ساتھ اس کے کمرے میں داخل ہوئیں تو وہ اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔

''کیسی طبیعت ہے اب؟'' اپیا نے اس کے برابر میں بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ ان کے لہجے میں کسی قسم کی شرمندگی کے کوئی آثار نہ تھے۔

''ٹھیک ہوں۔'' وہ مختصر جواب دے کر چپ ہو گئی۔

''صرف ٹھیک نہیں، جلدی سے بالکل پہلے کی طرح ہو جاؤ۔ سنی کی برتھ ڈے کرنے کا سوچ رہے ہیں ہم لوگ، سارا انتظام تمہیں ہی کرنا ہے۔'' وہ اس کے ہاتھ تھام کر پیار سے بولیں تو اسے اس پیار میں غرض کی بو آئی۔

''میں اور جواد شاپنگ کے لیے جا رہے ہیں یہ بتاؤ، تمہارے لیے کیا لاؤں۔'' وہ مزید بولیں۔

''تھینک یو، اپیا میرے پاس سب کچھ تو ہے۔'' اس کا جواب سن کر وہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔

''بس اب جلدی سے یہ بستر چھوڑ دو تم لیٹی ہوئی بالکل بھی اچھی نہیں لگ رہیں۔'' وہ اس کی پیشانی چومتے ہوئے بولیں۔

''امی آپ بھی چلیں۔'' اپیا نے امی سے کہا۔

''بھئی مجھ سے بازاروں میں مارے مارے نہیں پھرا جاتا تم لوگ جاؤ۔''

امی کے جواب پر وہ فوراً بولیں ''زیادہ نہیں پھرنا مجھے تو صرف جیولر کے پاس جانا ہے۔ سعودی گولڈ تو بہت جمع ہو گیا یہاں سے ایک آدھ چین لینے کا سوچ رہی ہوں۔ چلیں نا آپ؟'' اور امی ناچار کھڑی ہو گئیں۔

''رمیشہ اگر طبیعت بہتر محسوس ہونے لگے تو سنی کو ذرا دیکھ لینا۔ ایک تو تمہارے علاوہ اب یہ بچے کسی اور سے پڑھنے پر راضی بھی نہیں ہوتے۔ اس کے امتحان بالکل سر پر آ گئے ہیں۔'' اپیا اور امی کمرے سے جا چکے تھیں۔ رات کا کھانا بھی کمرے ہی میں آ گیا تھا۔ کھانے کے بعد بھابھی اس کے لئے دودھ لے کر آئی تھیں۔ وہ ہی مسکرا مسکرا کر باتیں کرنے کا انداز۔

''جلدی سے ٹھیک ہو جاؤ، تمہارے بغیر گھر اتنا سونا سونا لگ رہا ہے۔ مجھے تو بالکل مزہ نہیں آ رہا۔''

بھابھی نے مسکرا کر کہا تھا سونے سے پہلے بھیا بھی اسے دیکھنے آئے تھے۔

''میں نے تمہاری بھابھی سے کہا ہے تمہیں زیادہ سے زیادہ جوس پلائیں۔ دیکھو کتنی کمزور ہو رہی ہو۔ اب کل سے پابندی کے ساتھ دو ٹائم ایپل جوس لینا ہے۔ بھابھی جوس لائیں تو منع مت کرنا۔''

وہ اسے پیار کرتے ہوئے اپنے کمرے میں چلے گئے ''تو سب لوگ مل کر مشین کی مرمت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔'' اس نے طنزیہ انداز میں سوچا۔ ابھی وہ اتنی ناکارہ نہیں ہوئی کہ کباڑ میں ڈال دی جائے۔ ابھی وہ بہت سے لوگوں کے کام آ سکتی تھی۔ اس لیے اس مشین کو درست حالت میں لانے کے جتن سب کر رہے تھے۔ مگر کل جب یہ مشین مرمت ہونے کے قابل نہیں رہے گی تو اس کی حیثیت بھی گھر میں پڑے کسی فالتو سامان سے زیادہ نہیں ہو گی۔ وہ

جتنا سوچ رہی تھی اتنا ہی الجھ رہی تھی۔

''یا اللہ! مجھے درست فیصلہ کرنے کی ہمت عطا فرما۔'' اس نے صدق دل سے اپنے رب کو پکارا۔

''آج سے دس پندرہ سال بعد جب تم بالکل اکیلی رہ جاؤ گی سب ایک ایک کر کے تمہیں اپنا مطلب پورا ہونے پر چھوڑ جائیں گے تب چاہے ایک لمحے ہی کے لیے ہی سہی مگر میں تمہیں یاد ضرور آؤں گا۔ مگر تب سوائے پچھتاؤں کے زندگی میں کچھ بھی نہیں بچا ہو گا۔''

شہریار کی آواز اس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔

''کیا میری زندگی واقعی ایک پچھتاوا بن کر گزرے گی۔'' وہ خود سے پوچھ رہی تھی۔ خوشیاں اور محبتیں اس کے در پر دستک دے رہی تھیں اور وہ انہیں نظر انداز کر رہی تھی۔

محبتیں اور خوشیاں سب کے دروازے پر دستک دیتی ہیں جو عقل مند ہوتے ہیں فوراً آگے بڑھ کر انہیں خوش آمدید کہتے ہیں اور کچھ بے وقوف ساری عمر تقدیر کو روتے رہتے ہیں یہ بھول جاتے ہیں کہ کبھی خوشی نے ان کا در بھی کھٹکھٹایا تھا۔ اس سے پہلے کہ یہ محبتیں مایوس لوٹ جائیں اسے یہ در وا کر دینا چاہیے۔ اس نے خود سے کہا ''ابھی دیر نہیں ہوئی۔ ابھی میں اس روٹھے ہوئے کو منالوں گی۔ میں بیٹھ کر اس آنے والے وقت کا انتظار نہیں کروں گی۔ جب زندگی میرے لیے پچھتاوا بن جائے۔ میں در دل پر دستک دیتی ان خوشیوں کو خوش آمدید کہہ رہی ہوں۔ پتا نہیں میں صحیح ہوں یا غلط مگر میرا دل مطمئن ہے۔ مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے میں نے پہلی مرتبہ کوئی فیصلہ اپنے دل کی خوشی کو سامنے رکھ کر کیا ہے۔''

وہ خود سے کہتی بستر پر سے اٹھ گئی تھی۔ رات کے تین بج رہے تھے۔ وہ اب مزید ایک لمحے کی بھی تاخیر نہیں کرنا چاہتی تھی اسے محبتوں کے کھو جانے کا خوف تھا، اس کی انگلیاں بڑی تیزی سے فون پر ایک ایک نمبر ملا رہی تھیں۔

''ہیلو!'' شہریار کی نیند سے بوجھل آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی تھی۔

''شہریار! میں اپنی زندگی خود جینا چاہتی ہوں۔''

''رمیشہ تم!'' وہ صرف ایک لمحے کے لیے اس کی آواز سن کر حیران ہوا تھا، اس کی بات کا مطلب سمجھا تو خوشی سے چیخ کر بولا۔

''کیا کہہ رہی ہو۔ دوبارہ سے کہو، مجھے یقین نہیں آ رہا۔'' اس کی خوشی سے کھنکتی آواز سن کر رمیشہ کے لب بھی مسکرا دیے تھے۔

''میں زندگی میں کبھی پچھتانا نہیں چاہتی۔'' اس نے آہستگی سے کہہ کر لائن کاٹ دی تھی۔ وہ خود کو بڑا ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھی۔

فون کی بیل بجنا شروع ہوئی تو وہ سمجھ گئی کہ شہریار کا ہے۔ اس نے پہلی ہی بیل پر فون اٹھا لیا تھا وہ خوشی سے پاگل ہوتا اس سے فیصلے کی تبدیلی کی وجہ پوچھ رہا تھا۔ اور وہ جواب میں اس سے اپنے دل کی ہر بات کہہ رہی تھی۔ اس نے خوشیوں کو روٹھنے نہیں دیا تھا۔ خوشیوں بھرے نئے موسم اس کے آنگن میں اتر آئے تھے۔

❀

اچھی تھیں اور اُن سب کو اچھا ہونا بھی چاہیے تھا۔ آخر امی اور ڈیڈی دونوں ہی بہت قابل اور ذہین افراد تھے تو ان کی بیٹیوں کو تو یہ ذہانت وراثت میں ملی تھی۔

ڈیڈی بہت ہی لائق فائق ڈاکٹر تھے اور امی اپلائیڈ میتھس میں ایم ایس سی، ڈیڈی کا تو پتہ نہیں کہ انہوں نے ہم بہنوں کے حوالے سے کیا کیا کچھ سوچ رکھا تھا کہ ان کی وفات ہمارے بچپن ہی میں ہوگئی تھی۔ ہم لوگوں کو تو وہ بہت اچھی طرح یاد بھی نہیں تھے، بس ذہن پر ایک عکس سا تھا کہ ڈیڈی ایسے ہنستے تھے، ایسے بولتے تھے۔ ہمارے لئے درحقیقت سب کچھ ہماری امی ہی تھیں انہوں نے ہی ہمیں پالا، ہماری پرورش کی اور تعلیم و تربیت کا انتظام کیا، ہمارے سب شوق پورے کئے۔ ہمیں ماں کے پیار کے ساتھ ساتھ باپ کا پیار بھی دیا اور ہماری امی کی سب سے بڑی خواہش اور سب سے بڑا خواب یہ تھا کہ ہم سب بہنیں اعلیٰ تعلیم حاصل کریں۔ ایک تو مجھے پڑھنے کا کوئی خاص شوق ہی نہیں تھا، دوسرے میں کچھ خاص محنت بھی نہیں کرتی تھی۔

اب سوچتی ہوں تو افسوس ہوتا ہے کہ کاش میں نے امی کی خاطر ہی شوق نہ ہونے کے باوجود بھی پڑھنے میں سنجیدگی اختیار کر لی ہوتی۔ اکثر لوگ وقت گزرنے کے بعد ہی پچھتاتے ہیں اور ایسا ہی میں بھی کرتی ہوں۔

بہت مشکلوں سے روتے پیٹتے بی اے کرنے کے بعد میں نے اس خوف سے کہیں امی مجھے فراغت سے گھومتا پھرتا دیکھ کر دوبارہ کہیں ایڈمشن نہ دلوا دیں۔ وقت گزاری کے لئے ایک بہت ہی اچھے بیوٹی پارلر سے بیوٹیشن کا کورس کرنے کے لئے وہاں داخلہ لے لیا۔ بجنے سنورنے کا مجھے بچپن ہی سے شوق ہے۔ باوجود اس کے کہ میں کوئی بہت حسین لڑکی نہیں ہوں، مگر مجھ میں اسٹائل بہت ہے۔ جب میں نے بیوٹیشن کا کورس نہیں کیا تھا تب بھی مجھے پہننے اوڑھنے اور میک اپ کا بہت سلیقہ تھا۔ کس موسم میں کونسا رنگ اور کون سا اسٹائل اچھا لگے گا اور کس تقریب میں کیسا میک اپ اور کیسا ہیئر اسٹائل، میں ان سب سے بخوبی آگاہ تھی۔

میری دوستیں میری بہت تعریفیں کرتی تھیں۔ اکثر کا خیال تھا کہ میں خوبصورت ہوں نہیں مگر خوبصورت لگتی ضرور ہوں۔ خوبصورتی کے بارے میں دیگر لوگوں کے کیا نظریات ہیں، میں نہیں جانتی مگر خود میرا اپنا ہمیشہ سے یہی نقطہ نظر رہا ہے کہ آج کے اس ترقی یافتہ دور میں خوبصورت نظر آنا کوئی بہت مشکل اور ناممکن بات نہیں رہ گئی۔ بس آپ کو پہننے اوڑھنے اور میک اپ کا ڈھنگ آنا چاہیے۔

اس وقت جب میں وہاں سے کورس کر رہی تھی، میں نے یہ بات سوچی بھی نہیں تھی کہ آنے والے دنوں میں مجھے اس کام کو اپنا پروفیشن بنانا پڑ جائے گا۔ امی ایک بہت ہی اچھے اسکول میں میتھس کی سینئر ٹیچر تھیں، جتنا اچھا وہ اسکول تھا اسی لحاظ سے امی کی تنخواہ بھی بہت شاندار تھی۔ یہی وجہ تھی کہ ڈیڈی کی وفات کے بعد بھی ہم لوگ کسی شدید قسم کے مالی مسائل کا شکار نہیں ہوئے تھے۔ میتھس کے ٹیچرز کی تو ویلیو ہی بہت ہوتی ہے۔ اکثر بچے اسی مضمون میں کمزور ہوتے ہیں، یہی وجہ تھی کہ شام میں گھر پر بھی امی کے پاس لڑکیاں اور لڑکے ٹیوشن پڑھنے آیا کرتے تھے۔

گھر پر تو وہ ڈگری لیول تک کے سٹوڈنٹس کو ٹیوشن پڑھایا کرتی تھیں اور ان ٹیوشنز سے تو انہیں اسکول سے بھی زیادہ رقم حاصل ہو جایا کرتی تھی۔ اسی لئے ہم لوگوں کا گزارا بہت اچھا ہو رہا تھا لیکن زندگی میں آزمائشوں کا دور تب آیا جب امی کو پہلی مرتبہ ہارٹ اٹیک ہوا۔



وہ شاید اب تھکنے لگی تھیں۔ انہیں ہم بہنوں کے مستقبل کی فکر رہنے لگی تھی۔ ہمارے سر پر نہ باپ تھا نہ بھائی۔ انہوں نے کبھی بیٹا نہ ہونے پر خدا سے شکوہ نہیں کیا تھا لیکن اب وہ اکثر شکوہ کرتی نظر آتیں کہ کاش خدا انہیں ایک بیٹا بھی دے دیتا۔ وہ ان کا سہارا بنتا، گھر کے سارے مسائل اپنے ذمے لے لیتا۔

اب وہ مستقل بیمار رہنے لگی تھیں۔ ڈاکٹرز کہتے تھے کہ وہ چھوٹی چھوٹی باتوں کی ٹینشن لیتی ہیں، لہٰذا انہیں ہر قسم کی پریشانیوں سے دور اور خوش و خرم رکھنے کی بھرپور کوشش کی جائے۔ میں امی سے کتنی شدید محبت کرتی ہوں، اس بات کا احساس مجھے ان کی بیماری سے پہلے کبھی ہوا ہی نہیں تھا۔ تب میں نے رو رو کر اللہ سے دعائیں مانگی تھیں۔

"یا اللہ! میری ماں کو مجھ سے جدا مت کرنا۔ ڈیڈی میرے پاس نہیں۔ صرف ایک ماں ہے۔ اگر وہ بھی نہیں رہی تو پھر میں زندہ کس طرح رہوں گی۔"

یونہی روتے بلکتے میں نے اپنے گرد نظر ڈالی تو باقی چاروں بہنوں کی بھی اپنی ہی جیسی حالت دیکھی۔ وہ سب بھی میری طرح پریشان اور سہمی ہوئی تھیں۔ انہیں بھی ماں کی اتنی ہی ضرورت تھی جتنی مجھے تھی۔

پھر ہم سب بہنوں نے دن رات ایک کر کے امی کی تیمارداری کی تھی۔ مجھ سے ایک سال بڑی سارہ جو ان دنوں کراچی یونیورسٹی سے Genetics میں ماسٹرز کر رہی تھی اس نے اور میں نے باقی بہنوں سے بڑے ہونے کے ناطے اکیلے میں بیٹھ کر اس حوالے سے کافی تفصیلی گفتگو کی تھی کہ اس صورتحال میں اب ہمیں کیا کرنا چاہئے۔ ایم ایس ی مکمل ہو جانے تک سارہ کہیں فل ٹائم جاب تو کر نہیں سکتی تھی اسی لئے اس نے اپنی ایک دوست کے توسط سے ہمارے گھر کے قریب ہی موجود ایک کوچنگ سنٹر میں انٹر کے سٹوڈنٹس کو بوٹنی زوالوجی پڑھانی شروع کر دی۔

سارہ نے مجھ سے یونہی مذاقاً یہ بات کہی کہ "تمہارا تازہ تازہ کیا ہوا بیوٹیشن کا کورس کس دن کام آئے گا، تم ایسا کرو۔ کسی بیوٹی پارلر میں جاب کر لو۔"

اس کی مذاق میں کہی ہوئی یہ بات مجھے کچھ اچھی لگ گئی تھی۔ میں جانتی تھی کہ میں ایک بہت اچھی بیوٹیشن ہوں۔ جہاں سے میں نے سیکھا وہاں کی مالک مسز ارسلان اکثر میری مہارت کی تعریف کیا کرتی تھیں بلکہ جب میرا کورس ختم ہوا اور میں وہاں سے اپنا ڈپلومہ اور سرٹیفکیٹس وغیرہ لینے گئی تو انہوں نے مجھے وہاں جاب کی بھی آفر کی تھی، جس پر میں نے ایک لمحہ ضائع کئے بغیر انکار کر دیا تھا۔

سارہ کے مشورے کو سامنے رکھتے ہوئے میں نے اس بارے میں سوچ بچار کی تو میرے ذہن میں اپنا ذاتی پارلر کھولنے کا آئیڈیا آیا۔ کسی کے پاس جاب تو میں کبھی کر نہیں سکتی تھی، کوئی مجھ پر حکم چلائے، مجھ سے جواب طلبی کرے۔ یہ بات میں کبھی برداشت کر ہی نہیں سکتی تھی۔ اس لئے میں نے کسی پارلر میں جاب کرنے والے خیال کو تو فوراً ہی مسترد کر دیا تھا۔

جب میں نے اس کام کے تمام مثبت اور منفی پہلوؤں کا جائزہ لے لیا تو پھر اسے گھر والوں کے سامنے رکھا۔ نتیجہ بہت ہی حوصلہ شکن تھا۔ امی اور سارہ خاص طور پر مجھے مسلسل ڈرانے اور ہراساں کرنے میں لگی ہوئی تھیں۔

"جسے ہارنے کا ڈر ہو، وہ ضرور ہارتا ہے۔ اگر کوئی کام شروع کرنے سے پہلے ہی ہم نے یہ فیصلہ کر لیا کہ ہم یہ کام کر ہی نہیں سکتے تو اس کا مطلب ہے پچاس فیصد شکست تو ہم نے خود ہی بڑی آسانی سے قبول کر لی ہے اور